ہوا کو آوارہ کہنے دو

میمونہ خورشید علی

ہوا کو آوارہ کہنے والو

''بہت جذباتی ہے، جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہے۔ اللہ کرے سنبھل جائے۔ کون سنتا ہے اتنی۔ سب لاڈ چونچلے ماں باپ تک ہی ہوتے ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں اماں! یومنہ میری بیٹی ہے، بڑی سمجھ داری سے نباہ کرے گی۔''

''آخر ثریا، سمیعہ، آئمہ اور امیعہ بھی تو اس کی ہی بڑی بہنیں ہیں۔ کبھی کسی کی سسرال سے شکایت آئی ہے جو اس کے بارے میں آپ فکر مند ہو رہی ہیں۔''

''برا نہ ماننا بہو! جیسی تربیت تم نے ثریا اور سمیعہ کی کی تھی ویسی آئمہ اور امیعہ کی نہیں کی۔ اور یومنہ کی باری میں تو تم نے حد کر دی۔ اتنی آزادی دے کر لڑکوں کی طرح پالا ہے۔ آفتاب اور تم نے اس کی ناز برداریوں میں کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی۔ اور حد تو یہ کر دی کہ اسے پڑھا لکھا کر افلاطون بنا دیا۔''

''اماں! پڑھنے لکھنے سے آدمی انسان بنتا ہے۔''

بک ہا..... یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ باقی چار کی بات ایک طرف اور اس کی ایک طرف۔''

آفتاب ہمدانی اخبار پڑھ رہے تھے۔ ماں کی بات پہ تھوڑا سا مسکرا دیے۔

''واقعی سچ ہے اماں!'' میں نے یومنہ کو بہت لاڈ سے پالا ہے۔ مجھے اپنی بیٹیاں بیٹوں سے بھی پیاری ہیں۔

پے در پے بیٹیاں ہونے کے بعد پانچویں بار سائرہ کو اور مجھے پکا یقین تھا کہ اب کی بار ہمارے یہاں بیٹا ہی ہو گا مگر باقی سب کی طرح یومنہ کی آمد ہمارے لیے بالکل غیر متوقع اور ناقابل یقین تھی۔ سائرہ قدرت سے شاکی تو تھی ہی۔ اس نے پانچویں بیٹی کو بھی قبول نہیں کیا تھا۔ اس میں یومنہ کا کیا قصور تھا۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر یہی سوچا تھا۔ اگر ہماری قسمت میں بیٹا نہیں تو کیا ہوا۔ میں اسے بیٹوں کی طرح پالوں گا۔ لوگ کہتے تھے آفتاب ہمدانی کے بیٹا نہیں ہے۔

اس کا نام نہیں چل سکتا۔

اور آپ نے کتنا چاہا تھا اماں! کہ میری دوسری شادی کر دیں۔ شادی اسی سے وارث ہو جائے۔ لیکن ابا آپ کی بات پہ کیا کہا کرتے تھے۔

''بیٹا یا بیٹی کا ہونا..... اس میں عورت کا عمل دخل نہیں ہے۔ یہ تو مرد کی صلاحیت ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ اس میں جب عورت کا قصور نہیں تو پھر اسے سوکن جیسی سزا کیوں دی جائے۔ میرے دل سے کوئی پوچھے۔ مجھے اپنی پانچوں بیٹیاں کتنی عزیز ہیں۔

اور یومنہ کے بعد تو بیٹے کی خواہش بھی ختم ہو گئی۔

یومنہ واقعی دلیر اور حوصلے والی لڑکی ہے۔ بالکل بیٹوں جیسی بیٹی۔ میں اس سے بہت مطمئن ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''اے..... ہے..... دلیر..... کیا اسے جہاد پہ بھیجنا ہے۔ جو اس کی شجاعت پر فخر کر رہے ہو۔ ارے بیٹیوں کا تو وھیما پن اور دب کر رہنا ہی فخر ہوتا ہے۔''

اماں پاندان ٹٹولنے لگیں۔

سائرہ خاموشی سے ساس کے پہلو سے اٹھ گئیں۔

''ڈھائی بج رہے ہیں رات کے۔ آپ بھی آرام کر لیجئے۔ کئی روز کی مسلسل تھکن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بیمار ہی پڑ جائیں۔'' وہ شگفتگی سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

رشیدہ بیگم نے تکیے چتون سے بہو کی طرف دیکھا جو اٹھ کر جا چکی تھی۔ پھر بیٹے کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''بڑا گھمنڈ ہے تمہاری بیوی کو اپنے سلیقے اور تربیت کا۔ رشتے داری کرتے ہوئے رشتے دار بھی دیکھ لیتے۔ نگوڑے، دیہاتی۔''

آفتاب ہمدانی کے دل میں تیر سا پیوست ہو گیا۔ آنکھیں نادیدہ زخم سے سلگنے لگیں۔ انہوں نے ایک گہری اور سرد آہ بھرتے ہوئے سوچا۔

''بیٹیاں کب بری لگتی ہیں۔ اگرچہ ان کے نصیب اچھے ہوں۔ ایک یہی تو موڑ ہوتا ہے، جہاں آ کر ماں باپ کا فلسفہ نظریہ سب ناکام ہو جاتا ہے۔ اور تقدیر کو ماننا پڑتا ہے۔

چھ سال سے بوا سلیمہ، یومنہ کو مانگ رہی تھیں۔ نیت تو کیا، ارادہ بھی نہیں تھا۔ کہاں میری یومنہ، اور کہاں ان کا اسٹیٹس، لیکن..... کیا ہوا.....

وہی جو رب نے چاہا۔ خرم بن ریاض سے ہی اس کا جوڑ ملا تھا۔

بہت کوشش کی۔ اگر اس کے نصیب میں کچھ اور ہوتا تو ضرور ملتا۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ ماں سے مخاطب ہوئے۔

''اماں! انہوں نے شہر میں گھر لے لیا ہے۔''

''گھر بدلنے سے دماغ نہیں بدلتے۔'' آفتاب ہمدانی مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔

اماں قائل ہونے والی نہیں تھیں۔ اماں کے سسرالی رشتے دار جو تھے۔ انہیں تو مخالفت ہی کرنی تھی۔

''اچھا اماں! سو جایئے رات بہت ہو گئی ہے۔ اگلی رات بھی جاگنا ہے، نجانے کب ولیمہ سے فراغت ہو۔'' وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

رات کے تین بج رہے تھے اور ابھی تک سلیمہ بیگم نئی نویلی دلہن کو لے کر گاؤں کی اونچی نیچی گرد آلود گلیوں میں پھر رہی تھیں۔

ان کی روایت کے مطابق، دلہن پہلے سات گھروں میں اترتی ہے، تب کہیں جا کر اپنے گھر آتی ہے۔ سات گھروں میں دادا، تایا، چچا، ماموں، پھوپھی وغیرہ سب شامل ہوتے۔ ساس اور بہو کے ساتھ اس کارواں میں گھر کی سب خواتین، بچے اور مرد بھی کاٹھ کے الو کی طرح پھر رہے تھے۔

دولہا کے ساتھ، اس کے دوست بھی تھے۔ جو بے ہودہ گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔

ہر گھر میں دلہن کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا جیسے فاتح کش قوم پر کوئی لشکر اترا ہو۔

آناً فاناً خواتین اور بچے دلہن پر جھپٹ پڑتے۔ کوئی ادب و آداب نہیں تھا۔ مہنگے اور نفیس پارلر سے تیار ہونے کے بعد سات گھروں میں اترکر..... یومنہ خود..... اب ان جیسی ہی لگ رہی تھی۔

چہرے پر دھول تھی۔ زیورات ادھر اُدھر ہو رہے تھے۔ بال بکھر چکے تھے۔

حیرت کی بات یہ تھی کسی کو بھی اس کے حلیے کی پرواہ نہیں تھی۔ بس یہی فکر تھی جلد از جلد دلہن کو دیکھ لیں۔ خدا جانے دن نکلنے پہ دلہن روپ نہ بدل لے۔

خدا خدا کر کے اس کا یہ آزمائشی راؤنڈ ختم ہوا۔

تو اس نے سسرال کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے سکھ کا سانس لیا، پہلے شہر سے گاؤں تک کا سفر۔ پھر گاؤں میں خلیفہ ہارون رشید بن کر آدھی رات کو گشت لگانے کا مرحلہ۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ دل کرتا تھا تب اتار پھینکے۔

کمرے میں جانے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنی اسی سوچ کو عملی جامہ پہنانا چاہا۔ لیکن اس کے کپڑے کہاں تھے، اور یہ تو روم کدھر تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ بڑا تھا اور اسی حساب سے کھڑکیوں اور روشندانوں کی بہتات تھی۔

مسہریاں جوڑ کر کمرے کے وسط میں سیج بنائی گئی تھی۔ خاصی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی پان والے کی دوکان عید کی بدولت سج رہی ہو۔ پھول پتیوں کی سجاوٹ کے ساتھ ساتھ بجلی کی مرچیں بھی جل بجھ رہی تھیں۔ سیج کے وسط میں مرکزی بلب جل رہا تھا۔ بستر پہ سرخ اور گولڈن بنارسی بیڈ شیٹ بچھی ہوئی تھی۔ کمرے کے ایک طرف صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ ایک طرف سنگھار میز..... کونے میں الماری کھڑی تھی۔ ایک طرف کی دیوار خالی تھی۔ دیوار پہ کھونٹی آویزاں تھی۔ اور کھونٹی پہ اس کی مطلوبہ چیز تھی۔ یعنی اس کے کپڑے نیچے ہی صندوق بھی رکھا تھا۔ یقیناً اس میں اس کا سامان ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسبتاً چھوٹا سا دروازہ تھا۔

''یقیناً یہی باتھ روم ہوگا۔''

اس نے آناً فاناً کپڑے اٹھائے۔ اور اس جھنجھٹ سے نجات پانے کا سوچا۔ باتھ روم کا دروازہ بہت سختی سے بند تھا۔ ہینڈل گھما گھما کر اس نے زبردستی دروازہ کھولا اور کپڑے لے کر اندر گھس گئی۔

لیکن یہ کیا..... وہ تو باہر نکل آئی تھی۔ وہ باتھ روم نہیں تھا بلکہ داخلی دروازہ تھا۔

وہ گھر سے باہر کھڑی تھی یقیناً یہ گھر کا پچھلا حصہ تھا۔ جو قدرے سنسان تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر تیزی سے واپس اندر گھس گئی اور دروازے کو اسی طرح بند کر دیا۔

''لاحول ولا..... عجیب بے ہودہ گھر ہے۔'' اس نے کپڑے صوفے پر پھینکے اور زیورات اتارنے لگی۔

معاً کمرے میں کوئی داخل ہوا۔ اس کا خیال تھا، وہ ''آنے والے'' سے ملاقات سے قبل اپنا حلیہ درست کر لے گی۔ لیکن وہ تو سر پر آن پہنچا تھا۔

''اگر یہ سجاوٹ اتارنے کی اتنی ہی جلدی تھی تو پھر یہ اہتمام کس لئے کر کے آئی تھیں۔'' یک دم اس کے ہاتھ رک گئے۔ کھردرا اور خشک سا لہجہ، وہ اس کے عقب میں کھڑا تھا۔

''اصل میں مسلسل سفر کی وجہ سے ہر چیز گرد آلود ہو گئی تھی۔ اس لیے چینج کر رہی تھی۔'' وہ کچھ بوکھلا کر بولی۔

''اتنی نزاکتیں اچھی نہیں ہوتیں۔ اور نہ ہمیں پسند ہیں۔ بڑی نزاکتوں سے پلے ہیں ہم، مگر اسی ماحول میں۔''

''شہر میں مصنوعی ہوا اور مصنوعی خوراک، لوگوں کی ذہنیاں بدل جاتی ہیں۔ اصل آب و ہوا تو گاؤں کی ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم نے تمہیں پہلے دن یہاں لانے کا فیصلہ کیا تھا کہ تمہیں ہماری آن بان کا پتہ لگ جائے۔'' وہ فخر سے کہتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

''ہمارا نام سردار خرم بن ریاض ہے۔'' یومنہ حق حق اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کلاہ اتار کر سامنے ہی رکھ دی۔

''یار دوستوں میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ آخر بھی کو ہماری شادی کا بہت ارمان تھا۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو شادی ہوتے ہی بیوی کے غلام بن جائیں اور پرانی دوستیاں بھلا دیں۔''

پھر اس نے شیروانی اتار دی۔ ''لو ذرا یہ رکھ لو'' وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیا ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہو۔ کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ ماں نے مرچیں وار کر بھیجا ہے۔'' وہ آرام سے صوفے پہ پھیل گیا تھا۔

''بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا ایک گلاس پانی پلاؤ۔''

''میں تمہارے باپ کی نوکر نہیں ہوں۔ تمیز سے بات کرو۔ میں بھی تھک گئی ہوں۔ کوئی آرام نہیں کر رہی۔'' اس کے اندر کوئی چیخا۔

''کیا بہری ہو، آواز نہیں آئی۔'' اسے خاموش دیکھ کر وہ رعب سے بولا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ جس میں پانی ہوتا یا پانی لایا جا سکتا۔

''مجھے نہیں پتا، پانی کہاں ہے؟''

چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے لہجے کی تلخی چھپا نہ سکی۔

''او ہو..... ہو.....'' وہ صوفے سے اٹھ گیا۔

''بڑا گھمنڈ ہے تم میں۔'' وہ تو ہمیں پہلے ہی پتا تھا۔ شہر کی لڑکی ہے۔ آزاد ماحول میں پلی بڑھی ہے۔ اور پڑھ لکھ بھی تو بہت رکھا ہے۔ دماغ تو خراب ہوگا ہی۔

مگر ایک بات یاد رکھنا۔ یہ سب ناز و انداز یا وا کے گھر رکھ کر آنے تھے۔ یہاں ہمارے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ساتھ زبان درازی کی تو بہت برا انجام ہوگا۔'' وہ غرایا تو یومنہ سہم گئی۔

''جانتی ہو تمہارے باپ نے میری ماں سے کیا کہا تھا؟

اور تو سب کچھ ٹھیک ہے..... مگر تم گاؤں میں رہتی ہو۔ شہر میں رہنے کے بعد گاؤں میں رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر تم شہر آ جاؤ تو شاید کچھ سوچا جائے۔

ماں کی عزت کا سوال تھا، روپوں میں آگ لگا دی۔ شہر میں عالی شان بنگلہ خرید لیا۔ ہا..... اور پھر تمہارے باپ نے ہاں کر دی۔ یعنی تم ہم سے نہیں اس بنگلے سے بیاہی گئی ہو۔'' وہ دیر تک ہنستا رہا۔

یومنہ کے اندر آگ بھڑکنے لگی۔

''ہاں کرنے کے بعد آفتاب ہمدانی کو خیال آیا۔ سردار خرم تو پڑھا لکھا نہیں ہے۔ اب اس کے پیٹ میں خوف و فکر کے چوہے دوڑنے لگے۔ بیٹی نے ایم اے کر رکھا ہے اور داماد مڈل..... یعنی

آدھوں آدھ کا فرق، کیسے نبھے گا۔" ذرا ٹھہر کر بولا۔

"جب بیٹیوں کو پڑھاتے چلے جاتے ہو جب نہیں سوچتے یہ بات۔ داماد ڈھونڈتے ہوئے کیوں سوچتے ہو۔"

وہ خونخوار لہجے میں بولا تو یومنہ چپ نہ رہ سکی۔ "یہ بات تو میرے باپ سے پوچھتے مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ ہنس پڑا۔

"خیر...... ہاں ہو گئی تھی۔ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ منگ بن گئی تھی تو ہماری۔ ہمیں انکار ہو جاتا تو کوئی اور بھی تیری ڈولی اٹھا کر نہیں لے جا سکتا تھا لاشیں بچھ جاتیں۔"

"سبحان اللہ پنجابی فلموں کا گہرا اثر لگتا ہے۔" وہ بھی بڑبڑائی۔ جسے وہ سن نہ سکا۔

"مجھے پتا ہے بڑا گھمنڈ ہے تمہیں۔ باپ کی دولت کا، اونچی ڈگریوں کا۔ پر یہ بات سن لو۔ مجھے پڑھی لکھی عورتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ رشتے نہ آنے کی وجہ سے اگر ماں باپ پڑھاتے چلے جاتے ہیں تو اس میں لڑکیوں کو فخر کرنا زیب نہیں دیتا۔"

یہ سب سن کر یومنہ کے تو آگ لگ گئی۔ اتنے نادر خیالات۔

"میں اپنے ماں باپ کی بہت لاڈلی ہوں، جو چاہا میں نے منوایا ہے۔"

"اور ہم بھی اپنے ماں باپ کے بہت لاڈلے ہیں۔ جو چاہا منوایا ہے۔ جائز ہی نہیں، ناجائز بھی منوایا ہے۔ سمجھیں۔" وہ غرایا۔

لہجہ جتلانے والا ہی نہیں حقارت آمیز بھی تھا۔

"پانچ سال ہماری منگ بنی رہی ہو۔ جانتی تو ہو گی، ہمارے بارے میں۔ کیا مزاج ہے ہمارا۔ شکل وصورت بھی دیکھی ہو گی۔ ہوتی ہے لڑکیوں میں عادت چھپ چھپ کر دیکھ لیتی ہیں۔ یقیناً تو نے بھی دیکھ لیا ہو گا ہمیں۔"

"خوش فہمی ہے۔" یومنہ کی زبان کب رک سکتی تھی۔ تو وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"چلو اب دیکھ لو۔ چاند کا ٹکڑا ہوں کہ نہیں۔" اس نے سختی سے یومنہ کا چہرہ اوپر کیا۔ یومنہ نے نگاہیں اٹھائیں۔

شادی کی رات ہر دولہا اپنی نئی نویلی دلہن کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کے سنگھار کو، اس کی آرائش کو سراہتا ہے۔ یہ کیسا ہے۔ خود پسند، گھمنڈی۔ اکھڑ اور جاہل یومنہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور اس نے فوراً چہرہ نیچے کر لیا وہ اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اپنی بات، اپنی ذات، اپنی عقل اور اس کے آگے کچھ نہیں۔

معاً کمرے کا دروازہ بجا۔

"کس کے بچھو کاٹ گیا۔" وہ اس اچانک دخل اندازی پہ بری طرح جھنجھلا گیا۔ درواز مسلسل بج رہا تھا۔

"ہو گیا ہو گا کوئی لفڑا، میرے بغیر تو اس گھر کا تنکا بھی نہیں چلتا۔ لفڑا تو خاک کرے گا۔"

"اور ہاں سنو......" وہ جاتے جاتے پلٹا۔

"اذانیں ہو رہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں دن نکل آئے گا۔ ہم نے واپس شہر جانا ہے۔ اس محل میں، جو تیرے باپ کی پسند سے لیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے آدھے گھنٹے تک شہر جانے کی تیاری ہو جائے۔ اور قاصد یہی کہنے آیا ہو۔ خود کو ہلکا پھلکا کر لینا۔ ہمت ہے عورتوں کی، اتنی لیپا پوتی کیسے کر لیتی ہیں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

اس شاندار محل میں آنے کے بعد وہ خود سے کتنی دیر تک لڑتی رہی تھی۔ راستے بھر روتی آئی تھی۔ ابھی گھر آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اس کے میکے والے آ گئے تھے، پُرتکلف ناشتہ لے کر۔

آئمہ، امیمہ، اس کی کزنز، سہیلیاں، سب کتنی چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ اور وہ کس قدر کوفت محسوس کر رہی تھی اس ماحول میں۔

اور کتنا چھچھورے پن کا مظاہرہ کیا تھا سردار خرم نے اس وقت، ساری رات میں نخرے دکھاتی رہی ہوں، اور وہ مجھے مناتا رہا ہے۔ آخر اس بکواس سے وہ کیا ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بھابھی اور بہنوں کا ذومعنی لہجہ، اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

"سردار خرم تو ہم، ہے اور میں۔ یعنی یومنہ ہمدانی "تم" واٹ نان سنسن۔" وہ اس کے اندازِ تکلم پہ دل ہی دل میں چراغ پا ہو رہی تھی۔

"آخر کیوں؟" اس کی ساری بغاوت یک بیک جاگ اٹھی۔

اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ جو اس کے ماں باپ کی فرمائش پہ لیا گیا تھا۔ جدید طرز کا خوبصورت بنگلہ تھا۔ لیکن گھر بدلنے سے انسانوں کے مزاج تو نہیں بدلتے، بڑی اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔

"کیا یہ جاہلوں کی فوج اس گھر میں سما سکے گی۔ اور وہ خود...... کیا ایڈجسٹ کر لے گی۔ کسی ایک کے ساتھ بھی ایڈجسٹ کرنا کتنا مشکل ہے۔ سوچ کر ہی اس کا دم گھٹنے لگا۔

رات بھر کی تھکاوٹ تھی۔ نجانے اس کی کب آنکھ لگ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی آنکھیں موندی ہیں اور ابھی کوئی جگانے آ گیا...... اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔

اس کی جٹھانی اور بڑی نند سامنے ہی کھڑی تھیں۔

"شام کے چھ بج رہے ہیں، تم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ اب اٹھ جاؤ نہا دھو لو۔

سات بجے تک تو مہمان بھی آ جائیں گے۔ تمہیں تیار بھی ہونا ہے۔" اس کی مخاطب تھی۔

"چار گھنٹے کی نیند نے بھی کچھ ریلیکس نہیں کیا۔" وہ زیرلب بڑبڑائی۔

"اگر تم کہو تو تمہیں ایک کپ چائے بنا دوں؟" اب کی بار جٹھانی نے مخاطب کیا۔

اس نے تشکر سے دیکھا۔ "بڑی مہربانی ہوگی۔" وہ اس مہربانی کا قبل از وقت شکریہ ادا کئے بنا نہ رہ سکی۔

جٹھانی چائے بنانے کی غرض سے باہر چلی گئی تو نند کا ہدایت نامہ شروع ہو گیا۔

"خرم کو چائے بالکل پسند نہیں ہے۔ میری مانو تو تم اس کے سامنے کبھی چائے نہ پینا، شام کو کون سے کپڑے پہنو گی۔ مجھے بتا دو میں نکال دیتی ہوں۔"

"شکریہ میں نکال لوں گی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"شکریے کی اس میں کیا بات ہے۔ تم نئی نویلی دلہن ہو۔ ہم تمہارے کام نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ یہی دو چار دن تو ہوتے ہیں ناز نخروں کے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک آتشی گلابی تلے کے کام کا سوٹ نکال لیا۔

ابھی یومنہ اسی بات پر غور کر رہی تھی کہ بھائی کی طرح بہن کو بھی فالتو بولنے کی عادت ہے۔ سامنے چلچلاتا شوخ سوٹ دیکھ کر اس کا پارہ ہائی ہو گیا۔

جب کہ اس نے ولیمہ کے لئے گولڈن لہنگا اسپیشل بنوایا تھا۔ شام کو میں لہنگا پہنوں گی۔"

اپنے تئیں اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

لیکن ثروت کو اس کی ہٹ دھرمی سخت بری لگی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ولیمہ پہ ہمارے یہاں کا ہی سوٹ پہننا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ہمارا دستور ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ..... خرم کو ایسے خرافات قسم کے لباس پسند نہیں ہیں۔ آگے تمہاری مرضی۔"

وہ کپڑے بیڈ پہ ڈال کر شانِ بے نیازی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ یومنہ کو سخت غصہ آیا۔

"خرم کو یہ پسند نہیں، خرم کو وہ پسند نہیں۔ اونہہ" وہ جھنجھلاتے ہوئے باتھ روم میں چلی گئی۔

دس منٹ کے بعد باہر آئی تو میز پہ چائے رکھی ہوئی تھی۔

ٹھنڈی چائے میں اور خرم کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"تم نے آپا کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔" وہ اسے دیکھتے ہی غصے سے بولا۔

"واٹ ڈو یو مین....." اسے بھی تیش آ گیا۔

"اتنی سی بات پہ بھائی کو بھڑکا کر بھیج دیا۔ کس قدر فضول عورت ہے۔" اس کا دل چاہا بتائے کہ بات کیا اور کیسے ہوئی تھی۔ "لیکن کیوں؟ میں خوامخواہ وضاحتیں پیش کیوں کروں۔"

"مجھے خرید کر نہیں لائے ہیں جو میں دب کر رہوں گی۔"

"میں کسی کی مرضی کی پابند نہیں ہوں، جو میرا دل چاہے گا پہنوں گی۔" وہ تنک کر بولی۔

"ہم بھی کسی کی مرضی کے پابند نہیں ہیں۔ سمجھیں.....

دیکھو۔ مجھ سے تمیز سے بات کرو۔ اور نہیں کر سکتے تو بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"تم ہمارے بڑوں سے بدتمیزی کرو۔

اور ہم تم سے تمیز سے بات کریں۔" وہ غرایا، یومنہ یکلخت سہم گئی۔

"بات کچھ بھی نہیں تھی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ بات کچھ بھی نہ ہو۔"

"جب تم ہم سے زبان چلا سکتی ہو۔ تو..... تم نے آپا کے ساتھ تو بہت بدتمیزی کی ہو گی۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ یہاں جو بھی، جو کچھ کہے گا سب کی بات ماننا ہو گی۔ ہمارا حکم سمجھ کر۔ سمجھ گئی۔"

وہ کمرے سے چلا گیا اور وہ بیٹھ کر آنسو بہاتی رہی۔ دل چاہتا تھا وہاڑیں مار مار کر روئے۔

رات سے اب تک کون سی اچھی بات ہوئی تھی، جس کی بنیاد پر سب تلخیاں سہہ لیتی۔ کچھ بھی نہیں۔ سب سے زیادہ تو اس کا لہجہ ہی کھولا دینے والا تھا۔ جیسے کوئی آقا غلام سے بات کر رہا ہو۔

اتنی حقارت سے تو ملازموں سے بھی بات نہیں کی تھی۔ جانے کس جرم کی سزا ملی ہے۔

"ابو.....! آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ "میں نے تو آپ لوگوں کا کبھی دل بھی نہیں دکھایا تھا۔ پھر مجھے ایسی سزا کیوں دی۔ کیا میں آپ لوگوں پہ بوجھ بن گئی تھی۔ کم از کم کچھ تو دیکھ لیتے۔ کوئی ایک چیز..... جس کے سہارے ساری زندگی گزاری جاتی۔"

"ارے..... تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔" سلیمہ بیگم اسے اس حالت میں دیکھ کر دہل گئیں۔

"اور یہ کیا، تم رو رہی ہو؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"ضرور خرم نے کچھ کہا ہو گا۔"

انہوں نے یومنہ کو سینے سے لگا لیا۔ یومنہ کا دل چاہا چیخیں مار مار کر روئے۔ مگر کیوں..... وہ کوئی اس کی ہمدرد تھوڑا ہی تھیں آخر اس شخص کی ماں تھیں۔ جسے بے جا لاڈ سے انہوں نے بگاڑ رکھا تھا۔

"آخر پتا بھی لگے بات کیا ہے؟" سلیمہ پریشان ہو گئیں۔

"مجھے امی ابو یاد آ رہے ہیں۔" یومنہ نے جان چھڑانے کے لئے سوچا کہہ دے۔

مگر نہیں، ابھی پتا لگ جاتا ہے۔ یہ میری کتنی ہمدرد ہیں۔"

"شام کو میں یہ کپڑے پہننا چاہتی ہوں، مگر خرم کہہ رہے ہیں کہ..... یہ نہیں پہنوں۔"

''ہائے اتنی معمولی سی بات تھی۔ میں تو ڈر ہی گئی۔ تمہارا جو دل چاہتا ہے وہ پہنو۔ وہ آئے گا تو میں خود منٹ لوں گی۔ شاباش، اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ زیادہ دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' سلیمہ اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔

فی الحال اس کے لئے یہی بہت تھا کہ وہ ولیمے میں اپنا من پسند لباس زیب تن کرے گی۔ آخر کو اس کی ساری سہیلیوں اور کزنز کو آنا تھا۔

''لاحول ولا..... آج کل کی لڑکیاں بھی کتنی جذباتی اور بے صبری ہیں۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔'' سلیمہ بیگم باآواز بلند بڑبڑاتی کمرے سے نکل گئیں۔

تو وہ ہونق بنی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

شادی والے دن دلہن بنتے وقت تو ماہر بیوٹیشن نے اسے تیار کیا تھا، لیکن اب اسے خود تیار ہونا پڑا تھا۔ تمام کوششوں کے بعد بھی وہ مطمئن نہیں ہو سکی تھی۔

نہ کوئی مددگار تھا، اور نہ کوئی مشورہ دینے والا، دلہن میک اپ کرنا واقعی اس کے لئے ایک آزمائش تھا بہرحال وہ اس تجربے سے گزر گئی۔

رات ولیمے میں سبھی نے اسے سراہا تھا، لیکن جسے سراہنا چاہیے تھا۔ وہ شان بے نیازی سے اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے میکے والوں کو بھی اس نے ویلکم نہیں کیا تھا۔

''لگتا ہے بڑے مغرور ہیں۔''

''تم نے ایک رات میں کیسا پایا، اپنی رومانی کا تجزیہ تو بتاؤ۔''

''بھئی ہم سے تو دعا سلام بھی نہیں کی۔''

''کام کرنے کے لئے بہت سارے لوگ ہیں، آج تو انہیں دلہن کے پاس بیٹھنا چاہیے۔'' جو آتا تھا کچھ نہ کچھ اس کے کانوں میں انڈیلتا۔

سب کے چلے جانے کے بعد بھی اس کی سماعتوں میں یہی بازگشت ہوتی رہی تھی۔

''سمجھ میں نہیں آتا، اکڑ کس بات پر ہے۔ اتنا ہی غرور تھا تو بیاہ کر کیوں لائے تھے، میرے گھر والوں کی اتنی توہین۔''

کمرے میں آنے کے بعد تو اس نے ایک ایک چیز نوچ کھسوٹ کر پھینک دی تھی۔ پھر جلتی سلگتی بستر میں گھس گئی۔

''عجیب شادی ہے، اور عجیب رویے۔ اس بکواس بندھن کو شادی کہتے ہیں۔ تو اس سے بہتر تو کنوارے بھلے۔ امی ابو کے پاس آرام سے رہتی۔

ان کی خدمت کرتی، یہاں کیا مل رہا ہے۔ جلن ہی جلن.....'' پھر نجانے کب اس کی آنکھ

لگ گئی۔

کسی نے بری طرح سے اس کے اوپر سے کمبل کھینچا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ خرم سامنے ہی کھڑا تھا۔

''بہت جلدی ہے سونے کی۔'' اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''ساری عمر سوتی ہی رہی ہو۔ ایک رات ہمارے لیے جاگ نہیں سکتیں۔'' وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''زندگی کی ہر رات سونے کے لئے ہوتی ہے۔'' وہ تڑخ کر بولی۔

''لیکن کچھ راتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف جاگنے کے لئے ہوتی ہیں۔'' اس کا لہجہ بوجھل اور انداز بہکنے لگے تھے۔

یومنہ کو کرنٹ لگا۔ وہ بدک کر پیچھے ہوئی۔ دوسرے ہی پل، خرم نے اسے کھینچ کر اپنے پاس گرا لیا۔

''اتنی بھولی تو نہیں ہو، جو اس رشتے کے تعلق کو جانتی نہ ہو۔'' وہ اس پہ جھکا۔ یومنہ کی سانسیں الجھنے لگیں۔ مزاحمت کے سے انداز میں وہ اس کی بانہوں میں کسمسائی۔ ذہنی طور پر وہ کسی بھی پیش قدمی کے لئے تیار نہ تھی۔

''کیوں، اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہی ہو۔ سابقہ رات تو دوستی یاری نبھانے میں گزر گئی تھی۔ آج کی رات تمہارے نخرے اٹھانے میں گزار دوں۔'' اس کا انداز طنزیہ تھا۔

''کیا..... اس بات کا علم نہیں، نئی نویلی دلہن سے کس طرح پیش آیا جاتا ہے؟'' وہ اس کی جارحیت پہ ٹوٹنے لگی تھی۔

''کیا میں نے تمہیں گولی ماردی ہے۔ حق ہے میرا..... شرعی، تمہارے ساتھ زبردستی بھی کر سکتا ہوں۔'' وہ اسے جھٹک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

یومنہ بھی سنبھل گئی اور تیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''شریعت کا بس یہیں تک پتا ہے۔ رومانی تو تم کیا دو گے۔ وہ حق مہر تو دے دو، جو نکاح نامے میں لکھوایا تھا، تب ہی میں تمہارے لیے جائز ہوں۔''

خرم بن ریاض نے غرا کر یومنہ کی طرف دیکھا۔

''جانتی ہو کیا بکواس کر رہی ہو۔ حق مہر کب مانگا جاتا ہے۔ جب میاں بیوی میں طلاق ہوتی ہے اور تم پہلی رات ہی حق مہر مانگنے بیٹھ گئیں۔'' یومنہ کو زبردست قسم کا جھٹکا لگا

''غلط فہمی ہے تمہاری..... نکاح صرف ایک معاہدہ ہوتا ہے باقاعدہ شرائط کے ساتھ۔

جب تک اسے عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا، نکاح کے ضابطے مکمل نہیں ہوتے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔" وہ بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"حق مہر کا نام آج تک ہمارے گھر کی کسی عورت نے نہیں لیا۔ اور تم مجھے شریعت پڑھانے لگی ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا، اتنے مالدار باپ کی بیٹی ہو کر تمہاری نیت اتنی گندی ہے کہ تم پانچ لاکھ روپے اتنی چالبازی سے مانگو گی۔"

یومنہ کو اس کی سوچ پہ بہت افسوس ہوا۔

"پیسوں کو اہمیت دے کر تم اپنی اوقات ظاہر کر رہے ہو، اتنا ہی دم نکل رہا ہے شریعت نبھاتے ہوئے۔ تو چند ہزار کیوں نہیں لکھوائے تھے۔ کیوں پانچ لاکھ لکھوائے تھے۔ کیا صرف برادری کو دکھانے کے لئے۔"

"چار آدمیوں میں ہماری بھی عزت ہے۔ اونچی بارات، اونچا حق مہر..... تمہارے باپ نے ہی نہیں دیا تمہیں اونچا جہیز۔ لاکھوں روپیہ ہم نے بھی خرچ کیا ہے۔" وہ گھمنڈ سے بولا۔

"چہ..... چہ..... چہ..... بہت ہی گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔ اس سے تو بہتر ہوتا تم چند ہزار روپے لکھوا لیتے۔ جو کم از کم ادا کرتے ہوئے۔ یوں اوقات تو ظاہر نہ ہوتی تمہاری، یومنہ نے وزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے زیادہ شریعت پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بھڑک کر بولا۔

"رہ گئی رونمائی۔"

"رونمائی، رونمائی، رونمائی۔ کل سے سن رہا ہوں یہ الفاظ بتا دیتی اپنے سجنوں کو اتنا سونا جو پہن کر بیٹھی ہو، سب ہماری طرف سے ہی چڑھایا ہوا ہے۔ ایک سے ایک کپڑا، یہ کم تھا کہ تمہارے باپ کے کہنے سے کان کھول کر سن لو۔ ہمارا دل چاہے گا ہم دیں گے۔ ہمارا دل چاہے گا نہیں دیں گے۔ کسی کے باپ کا نہیں کھاتے۔ مجھے پتا ہے بھڑکا کر گئے ہیں سب تمہیں۔ آج کے بعد کوئی، الو کا پٹھا ہماری زندگی میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ اور آج تو ہمارے سامنے اتنا بولا ہے۔ آئندہ زبان کھینچ کر پیر کے انگوٹھے سے لگا دیں گے۔"

"سردار خرم بن ریاض! یہ بھول ہے تمہاری کوئی تمہاری زندگی میں دخل اندازی کرنے آئے گا۔ تمہارے جیسے کو تو ہم ہمسائے میں بھی برداشت نہ کریں، نہ جانے کیسے چوک ہو گئی میرے والدین سے کہ تم جیسے بددماغ کو داماد قبول کر لیا۔

ایک بات میری بھی کان کھول کر سن لو۔ یومنہ ہمدانی آمعمولی لڑکی نہیں ہے۔ تم کسی کے

باپ کا نہیں کھاتے، تو ہم بھی کسی کے باپ کا نہیں کھاتے، میری زبان انگوٹھے سے کیا لگواؤ گے۔ پہلے اپنی زبان کو لگام دو۔"

وہ غصے سے بولی۔

"چٹاخ....." ایک زوردار طمانچہ، یومنہ حق حق رہ گئی۔ اور پھر دوسرا طمانچہ وہ دور جا گری، تیسرا طمانچہ..... اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

☆☆☆

آج کی صبح کتنی عجیب تھی، گویا دن کا اجالا اس کی ذلت کا مذاق اڑا رہا ہو۔ آنسوؤں کی لڑی تھی جو ٹوٹ کر نہ دیتی تھی۔ گھر سے ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ منتظر و منتشر بیٹھی تھی۔

بہت اصرار کیا تھا اس کی نندوں نے، ساس نے کہ وہ ناشتہ کر لے۔ لیکن اس نے پانی کا گھونٹ تک نہ پیا تھا۔ وہ سب سے بدزن، سب سے متنفر تھی، کہ اس کی زندگی برباد کرنے میں سب ہی شامل تھے۔

اس کے ارمان تو کیا پورے ہوتے۔ فی الحال اس کی ہستی ہی تسلیم نہیں کی گئی تھی۔ انتظار کرتے کرتے، انتقام و بغاوت کی وہ کتنی منزلیں طے کر گئی تھیں۔ صبح اس نے آخری بار خرم بن ریاض کو جو کچھ کہا تھا اب بھی وہ اس پہ اٹل تھی۔

"میں اپنے باپ کی نہیں خرم بن ریاض جو دوبارہ یہاں آ گئی تو؟" اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"چلو پتا لگ جائے گا۔ تم میں کتنا تیز ہے۔"

"خرم بن ریاض! تا تمہیں لوہے کے چنے چبوا دوں تو، تو ہمدانی کی بیٹی نہیں۔"

"کیسی ہو یومنہ!" امیہ کی اچانک بے حد قریب سے آواز آئی تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ اس کے ساتھ آپی ثریا بھی تھیں۔ انہوں نے یومنہ کو پیار کیا۔

"اداس اداس سی بیٹھی ہو۔ خیر ہے؟"

امیہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے گدگدایا تو اس نے بے زاری سے ہاتھ جھٹک دیا۔ ثریا اور امیہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

"دراصل ہم لوگ دیر سے آئے ہیں نا، شاید اس لیے خفا۔" ثریا نے ساس نندوں کے سامنے بات سنبھالی۔

"صبح سے ایسا ہی موڈ ہے، نہ ہی ناشتا کیا۔ بھئی شادی تو سبھی لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ اور سب کو..... ماں باپ کا گھر چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔"

سلیمہ بیگم کا موڈ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ ثریا کا دل ہولنے لگا۔

''دراصل! یہ سب سے چھوٹی ہے نا اس لیے سب کی لاڈلی ہے۔ نہ کبھی ماں باپ سے دور رہی، سمجھ لیجیے پہلی بار جدا ہوئی ہے۔''

''ہاں! ابھی تک یہ بچی امی کے پاس سوتی تھی۔'' امیمہ نے شگفتگی سے کہا۔

''سب ہی بیٹیاں ماں باپ کی لاڈلی ہوتی ہیں۔ مگر یہ لاڈ بھی جب سوہتا لگتا ہے، جب بچپنا ماں باپ کے گھر چھوڑ دیا جائے۔''

''آپ فکر نہ کریں، آپ کو کبھی شکایت نہیں ہوگی۔ نئی زندگی کی شروعات ہے، بس اس لیے ذرا گھبرا رہی ہے۔''

''کتنی دیر تک تم لوگوں کے بیٹھنے کا ارادہ ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔'' یومنہ نے اکتا کر کہا۔

''چلتے ہیں گڑیا! ذرا دیر تمہاری ساس سے تو مل لیں۔''

ثریا رسان سے بولیں۔ جب کہ اس کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ امیمہ تو کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں تھی۔

سلیمہ اور ان کی بیٹیاں خاموشی سے بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بات چیت کے بعد آپی ثریا اجازت لے کر اٹھ گئیں۔

راستے بھر دونوں بڑی بہنوں کو یہی فکر تھی کہ یومنہ نے رو رو کر آنکھیں کیوں اتنی سجا رکھی ہیں۔ اس کا رویہ اتنا اکھڑا اور بے زار کن کیوں ہے اور بھی بہت سارے خدشات و سوال ان کے ذہنوں میں اودھم مچا رہے تھے۔ لیکن یومنہ نے پورے راستے لب نہ کھولے۔

جس قسم کی اس کی کیفیت تھی ثریا اور امیمہ کو توقع تھی کہ وہ امی سے گلے لگتے ہی پھٹ پڑے گی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ ماں سے سرسری سا ملی۔ انداز اس کا روکھا اور خشک ہی تھا۔ بالکل اجنبیوں کی طرح۔

''لگتا ہے ہماری یومنہ واقعی بڑی ہوگئی ہے۔ ایک دم کتنی محتاط ہوگئی۔'' سمیعہ نے اسے چھیڑا۔

''نہ کوئی قصہ نہ کوئی بات، کچھ تو اپنی کہانی سناؤ۔'' آئمہ نے بھی دلچسپی لی۔

''میری بیٹی کو تنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھکی ہوئی ہے اسے آرام کرنے دو۔'' سائرہ کو بڑی بیٹی نے اشارۃً کچھ کہہ دیا تھا۔ لیکن وہ چاہتی تھیں کہ یومنہ کے ساتھ کچھ کوئی مشکل ہے تو وہ خود بتائے۔ اپنی طرف سے وہ کوئی سوال نہیں کریں گی۔ اور پھر یہی ہوا۔ یومنہ بھڑک گئی۔

''نہیں کرنا مجھے آرام۔ اس سے بہتر ہوتا مجھے زہر دے کر مار دیتیں آپ۔''

''آخر میں نے کب دل دکھایا تھا آپ کا، جو آپ نے مجھے ایسی سزا دی کیا خرم بن ریاض میرے لائق تھا۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''عورت کی عزت و توقیر کیا چیز ہوتی ہے، وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ ایک مغرور شخص ہے۔ گھمنڈی، اپنے حسن اور اپنی دولت پہ ناز کرنے کے سوا وہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔'' وہ مسلسل رو رہی تھی۔

چاروں بڑی بہنیں اور ماں حق دق اس کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ ثریا نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ اور پھر اس نے روتے روتے اپنی ساری داستان سنا ڈالی۔ سمیعہ بہن کے ساتھ ہونے والی زیادتی پہ اشک بہانے لگی۔

جب کہ آئمہ اور امیمہ جذباتی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے والدین کو ہی مورد الزام ٹھہرانے لگیں۔

''ابو کے رشتے دار تھے، بہت اندھا اعتماد ہے ابو کو اپنے عزیزوں پہ۔ اندھے کنویں میں پھینک دیا۔''

''میں نے کتنا اصرار کیا تھا، یومنہ کو اپنے دیور کے لئے لے جانا چاہتی ہوں۔ لیکن کیا جواز بناتا امی ابو نے، عاطف تو بہت کالا ہے۔ قد بھی درمیانہ ہے۔ جوڑی سجے گی نہیں۔''

''حسن کا شہزادہ ڈھونڈا تھا۔ بڑی جوڑی سج رہی تھی۔ نکاح کے وقت سب یہی کہہ رہے تھے، چاند سورج کی جوڑی لگ رہی ہے۔ لیکن جس گھمنڈ سے وہ بیٹھا تھا، میرا دل کہہ رہا تھا۔ یا تو یہ لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہیں، یا ضرورت سے زیادہ ہی احساسِ برتری کا شکار، اور وہی ہوا۔

ابو تو کہتے تھے ایک رہائش کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ گاؤں سے شہر میں آ جائیں تو بہت اچھا رشتہ ہے۔ کوئی نقص ہی نہیں۔ دیکھ لیا نتیجہ، ٹھیک کہتی تھیں بڑی اماں، گھر بدلنے سے ذہن نہیں بدلتے۔''

اب امیمہ زور شور سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔ سائرہ کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ ثریا، بہن کو چپ کروا رہی تھیں۔

''گڑیا! حوصلے سے کام لو، سب کچھ تو بنا بنایا نہیں ملتا اس شخص کو بدلنے کی کوشش کرو۔ وہ یقیناً تمہارا ہو جائے گا۔''

''واٹ نان سینس آپا.....!''

''میں قربانی کا بکرا نہیں بنوں گی۔ جب تک آپ لوگوں کے اختیار میں تھا آپ لوگوں نے کیا۔ اب سب کچھ میرے اختیار میں ہے، جو میرے دل میں آئے گا میں کروں گی۔''

''جذباتی نہ بنو، یومنہ! یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔''

''نہیں آپا، میں ایک زندہ وجود ہوں، دنیا میں کال نہیں پڑ گیا اچھے رشتوں کا۔''

''اور جو تمہاری قسمت میں یہی تھا تو پھر ہم کیا کرتے۔''

''آہ..... قسمت..... حقیقت تو یہی ہے کہ میں بوجھ نظر آ رہی تھی۔ پانچویں بیٹی نا

بہت تھک چکے تھے میرے والدین۔"

"یومنہ! تمہیں احساس ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"پلیز آپا! مجھے بولنے دیجئے۔ نہیں تو میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ نجانے میں دو دن کس صبر سے گزار کر آئی ہوں۔"

"آپ تو کہتی تھیں، تین سال تک چوکھٹ پکڑے رکھی ان لوگوں نے۔ بہت چاہت تھی میری۔ ابو سے ہاں کروا کر ہی چھوڑی۔ میری خاطر، میرے گھر والوں کی فرمائش بھی مانی۔ مگر..... میرے لیے تو ان کے دل میں کوئی سوفٹ کارنر نہیں ہے، میں کیسے مان جاؤں کہ وہ مجھے چاہت سے لے کر گئے ہیں۔" وہ دوبارہ رونے لگی۔

ثریا نے بہن کو خود سے لپٹا لیا۔

"نہیں آپا! میں دوبارہ وہاں نہیں جاؤں گی۔" وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔

"جہیں جانا پڑے گا تو یومنہ!" سائرہ بہت دیر کے بعد بولیں۔

"ہرگز نہیں امی" بغاوت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"اگر آپ کے بس میں کچھ نہیں ہے تو میں ابو سے خود بات کروں گی۔"

"یہ کوئی کالج یونیورسٹی کا مسئلہ نہیں ہے جو تم باپ سے ڈسکس کرو گی۔ اور حل ہو جائے گا۔" سائرہ کا لہجہ قطعی تھا۔ یومنہ چونک گئی۔

"ام.....ی.....!" اس کا پُر احتجاج لہجہ آنسوؤں میں ڈوب رہا تھا۔

"آج سے بتیس سال پہلے میں بھی اسی خاندان میں بیاہ کر آئی تھی۔ میں نے تو اپنی ماں سے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔ تمہاری دادی، پھوپھیوں کا جو رویہ تھا، اس کی تو جھلک تمہیں آج بھی نظر آتی ہوگی اور تمہارے ابو کیا ہمیشہ سے ایسے ہی تھے کیا میں نے سمجھوتہ اس لیے کر لیا تھا کہ میں غریب ماں باپ کی بیٹی تھی، تعلیم بھی کم تھی۔ آج تو بولنے کی بھی آزادی ہے، تب تو سوچ پہ بھی پہرے ہوا کرتے تھے۔ کیا میرے ماں باپ کے پاس دو وقت کی روٹی نہیں تھی، کیا میں لاڈ سے نہیں پلی تھی۔ کیا میں چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن نہیں تھی۔"

"امی.....! وہ زمانہ اور تھا۔"

"تم چپ کرو..... آئمہ! کوئی بھی اسے بھڑکانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی اسے سمجھانے کی۔ تم چاروں بھی شادی شدہ ہو، کیا تمہاری زندگیوں میں نشیب و فراز نہیں ہیں۔ یہ تو عورت کا نصیب ہوتا ہے، کچھ ڈھلنا اور کچھ ڈھالنا پڑتا ہے، خرم اتنا برا نہیں ہے۔"

"جتنا میں سمجھ سکی ہوں ان لوگوں کو، آپ نہیں سمجھ سکتیں۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"ایک دن اور دو رات میں کوئی کسی کو سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ تمہیں اپنی رائے ان کے متعلق فی الحال اتنی قطعی نہیں رکھنی چاہیے۔"

"امی! میں کسی کی استانی نہیں بننا چاہتی۔ آدھی زندگی بنانے میں گزار دوں، اور آدھی سہنے میں۔ میں دوٹوک کہہ رہی ہوں، میں وہاں نہیں رہوں گی۔"

"اور میں بھی دوٹوک کہہ رہی ہوں یومنہ! اگر تو تم ہماری بیٹی ہو تو آئندہ ایسا کہنا تو دور، سوچو گی بھی نہیں، ہم نے تمہیں بھری برادری میں رخصت کر بھیا ہے۔ قانوناً شرعاً خرم کو تمہاری زندگی کا ہر اختیار ہے۔ خوشی سے یہاں آؤ گی تو سو بسم اللہ، ورنہ اس گھر کے دروازے تمہیں ہمیشہ بند ملیں گے۔"

سائرہ کہہ کر اٹھ گئیں۔ یومنہ ثریا سے لپٹ کر رو دی۔ ماں کا ایسا روپ پہلی بار جو دیکھا تھا۔ باقی بیٹیاں بھی لرز کر رہ گئیں۔

☆☆☆

دو روز خاموشی سے گزر گئے، آئمہ، امیہ اور سمیعہ اپنے اپنے گھر جا چکی تھیں، صرف ثریا اور یومنہ ماں کے پاس تھیں۔ تیسرے دن شام کو خرم اپنی لش پش کرتی پجارو میں اسے لینے کے لئے آیا۔ تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ اپنی کتابیں، کیسٹس، گفٹس، لیٹرز اور بھی بہت سی یادیں۔ وہ کچھ یہاں چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، اب اس کا یہاں کوئی نہیں تھا، ماں کے جملوں نے اسے بدظن کر دیا تھا۔

"واقعی بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں، خصوصاً بعد میں آنے والی، جب ماں باپ تھک چکے ہوتے ہیں، ابو جو میرے چہرے سے فوراً میری کیفیت سمجھ لیتے تھے، دو دن میں انہوں نے بھی کچھ نوٹ نہیں کیا۔ کتنے بدل جاتے ہیں سب۔ سب رشتے عارضی ہوتے ہیں۔ کوئی مخلص نہیں ہوتا، اب میں اپنی زندگی کا خود فیصلہ کروں گی۔" اس نے دل ہی دل میں گویا فیصلہ کیا۔

"یہ کیا، تم نے سارا ہی سامان سمیٹ لیا..... کیا تم یہاں آؤ گی نہیں؟" ثریا نے حیرت سے کہا۔

"شاید کبھی نہیں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

اس کی آنکھیں لہجے کے ساتھ ساتھ بھیگ رہی تھیں۔ ثریا کا دل کٹ گیا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ جو ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"امی! یہ یومنہ کیا کہہ رہی ہے؟"

"اسے کہنے دو، جو کچھ کہتی ہے۔ جب یہ وہاں سے آئی تھی تو یہ کہہ کر آئی تھی کہ دوبارہ نہیں جائے گی، اب جا رہی ہے تو کہہ رہی ہے کہ یہاں نہیں آئے گی۔ ابھی اسے اپنے فیصلوں پر اختیار

نہیں ہے۔" یومنہ نے ماں کی طرف دیکھا۔ جہاں مامتا کی مسکراہٹ اور شفیق چہرہ تھا۔

"یہ آپ کی بھول ہے امی! فیصلوں کو اختیار تو مل گیا ہے۔"

"خرم انتظار کر رہا ہے بھئی، ابھی اور کتنی دیر لگے گی۔" اچانک ہمدانی صاحب کے بولنے پر وہ چونک گئی۔

"چلیے، یہ تو تیار ہی ہے۔" ثریا نے جلدی سے کہا۔

ایک دوسرے کی ہمراہی میں سب باہر نکل گئے۔ جہاں خرم گاڑی میں انتظار کر رہا تھا۔

ان دونوں کے چلے جانے کے بعد ثریا' ماں کے پہلو میں چلتی ہوئی اندر آ گئیں۔

"امی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟" سائرہ نے ثریا کی طرف دیکھا۔

"آپ نے یومنہ کے ساتھ بہت ہی سخت رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ سب سے چھوٹی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ اندر ہی اندر ٹوٹ جائے۔" سائرہ کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"یومنہ میری بیٹی ہے۔ میں جانتی ہوں اسے کیسے کنٹرول کرنا ہے۔ میں اپنے رویے میں اگر لچک رکھتی تو اس کی جارحیت، جنون بن جاتی۔ میری قطعیت اسے نہیں، اس کے الٹے سیدھے عزائم کو توڑنے کے لئے تھی۔" سائرہ نے گہرا سانس بھرا۔

"وہ اپنی قسمت سے شاکی ہے۔ کیا اس کا بچپنا نہیں، ہم نصیب کے آگے کیا کریں۔ کچھ کر سکتے تو تمہارے لیے نہ کرتے، اٹھارہ سال ہو گئے تمہاری شادی کو، اور تمہیں اللہ نے اولاد نہیں دی۔ تم نے تو کبھی شکوہ نہیں کیا ثریا! تم نصیب پہ شاکر ہو سکتی ہو تو یومنہ کیوں نہیں۔" ثریا آپی، ماں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس بات پر وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

☆☆☆

وہ اس کے پاس بیٹھی تھی، لیکن اس کا دل اداس تھا۔ نجانے کیسے کیسے خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ اتنی اداس وافسردہ تو وہ رخصتی کے روز بھی نہیں تھی۔ جتنا آج ہو رہی تھی۔ کیا واقعی وہ ماں باپ کا گھر چھوڑ دے گی۔ مگر کس کے لیے.....؟

اس نے منہ موڑ کر خرم کو دیکھا، اس کی شاندار شخصیت پورے ماحول پہ چھا رہی تھی۔ بظاہر کتنا شاندار تھا۔ اس نے تفصیلی جائزہ لے کر سوچا۔ کاش باطن بھی اتنا ہی خوبصورت ہوتا۔ تو زندگی کتنی حسین گزرتی۔ لیکن زندگی کا حسن تو تب ہی ختم ہو گیا تھا، جب اس سے منسوب ہوئی تھی۔

اس نے رخ باہر کی طرف موڑ لیا۔ موسم گرما کی آمد آمد تھی۔ خشک ہوائیں چل رہی تھیں۔ پورا راستہ خاموشی سے گزر گیا۔

گاڑی گھر کے دروازے کے سامنے رکی۔ گیٹ پہ تالا پڑا ہوا تھا۔ خرم تالا کھولنے لگا تو وہ

پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کیا گھر میں کوئی نہیں ہے۔" خرم نے کوئی جواب نہیں دیا اور اندر چلا آیا وہ اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں؟" اس کا لہجہ بے تاب تھا۔

خرم کے قدم رُک گئے۔ اس نے پلٹ کر یومنہ کو گھورا۔ یومنہ کو بھی بریک لگ گئے۔

"پہلی بات تو یہ آئندہ گھر سے باہر کھڑے ہو کر ہم سے اونچی آواز میں بات نہیں کرنا۔ اور دوسری بات یہ کہ یہ گھر تمہارے لیے لیا گیا تھا، سو اس گھر میں تم ہی رہو گی۔ ہمارے گھر والے اپنی جدی پشتی حویلی میں جا چکے ہیں۔"

"کیا؟ اتنے بڑے گھر میں..... میں..... اکیلی رہوں گی۔"

تنہائی کے احساس سے وہ خوفزدہ ہو رہی تھی۔ وہ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ کسی چیز کے اثر میں آئی ہے۔

"تم..... تو کہہ کر گئی تھیں کہ تم آئندہ یہاں نہیں آؤ گی۔" وہ لطف لے رہا تھا۔

"مجھے پتا ہوتا کہ تم مجھے قید تنہائی سناؤ گے تو ہرگز نہ آتی۔" وہ تیزی سے بولی۔

"ہا..... ہا..... ہا..... کیا تمہیں ہم نظر نہیں آتے۔ ہم..... سردار خرم بن ریاض! ایک مرتبہ کسی کی نگاہ ہمارے اوپر پڑ جائے تو آسانی سے نہیں ہٹتی۔"

اس نے شانِ بے نیازی سے کہتے ہوئے یومنہ کو بازوؤں کے حلقے میں لے لیا وہ مچھلی کی طرح تڑپ اٹھی۔

"ہم سے اڑی کرتی ہو تو ہمیں اور مزہ آتا ہے۔ ہمیشہ اس گھوڑی پہ سواری کی ہے، جو پیٹھ پہ بٹھانا نہیں چاہتی۔ تمہیں پکڑ کر پتا لگتا ہے دم ہے تم میں پر ہمارے سامنے کچھ نہیں۔"

"انسان اور جانوروں میں بہت فرق ہوتا ہے۔" وہ اس کے تنگ ہوتے دائرے میں چیخ پڑی۔

"فلسفہ زہر لگتا ہے ہمیں، مت کیا کرو ہم سے ایسی باتیں۔"

"اور مجھے یہ زندگی زہر لگتی ہے۔"

"اپنا اپنا طریقہ کار ہے۔" وہ سکون سے بولا۔

اور اسے صوفے کی طرف دھکیل دیا۔ یومنہ کاغذ کی طرح صوفے کی پشت سے چپک گئی۔

"چلو اٹھو، کھانے پینے کے لیے کچھ لے کر آؤ ہمارے لیے۔ بہت بھوک لگی ہے۔ اللہ جانے کیا الا بلا رکھ دیا تھا، مہمان نوازی کے لئے۔ ہم سے تو ایک لقمہ نہیں کھایا گیا، ایسی چیزیں کھاتی

تھیں، تب ہی تو بچے کی طرح ہو۔ ہمارے ساتھ رہو گی تو کھلا پلا کر شیرنی بنا دیں گے۔"

"خیال رکھنا، کہیں یہ شیرنی سب سے پہلے تمہارا ہی صفایا نہ کر جائے۔" وہ کہتے ہو۔ اٹھ کھڑی ہوئی۔ خرم ہنسنے لگا۔

☆☆☆

وہ ٹی وی پہ پنجابی گانوں پہ رقص دیکھ رہا تھا۔ تب ہی وہ ہونق شکل لیے کچن سے برآمد ہوئی۔

"یہاں تو گیس بھی نہیں ہے۔ کھانا پکانا کیسے ہو گا؟"

"لکڑیوں پہ، لکڑیاں اور مٹی کا تیل وہیں رکھا ہے۔"

"واٹ نان سینس....." وہ چلائی۔

"میں نے کبھی ایسی خرافات پہ کچھ نہیں پکایا۔"

"اے..... اونچا بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ درخواست دے رکھی ہے، آ جائے گی گیس بھی۔ اب سب نے تیرے باپ سے بیٹی تو نہیں لینا تھی، جو پلک جھپکتے میں ہمارا حکم مان لیتے۔ ہر چیز میں وقت لگتا ہے۔"

"مائی گاڈ!" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"ہمیں بہت بھوک لگ رہی ہے۔ ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کھانا نہ ملنے پر ہم تمہیں ہی کھانے بیٹھ جائیں۔" اس نے آخری الفاظ کچھ گمبھیر لہجے میں کہے تو یومنہ پھرتی سے کھڑی ہو گئی اور فوراً کچن کی طرف لپکی۔ کہیں سچ مچ وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ نہ پہنانے لگ جائے۔ دو گھنٹے کی محنت کے بعد وہ آگ سلگانے میں کامیاب ہوئی۔

پھر گوشت کو گلایا، بھونا، چپاتیاں ڈالیں، کئی بار ہاتھ جلا، آنکھیں دھوئیں سے الگ جلن کر رہی تھیں۔ گیارہ بجے وہ کھانا بنا کر جب ڈرائینگ روم میں آئی تو وہ مزے سے پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

گرمی اور پسینے کی وجہ سے اس کا اتنا برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے پنکھا چلا دیا، اور وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کھانا پکانا۔ زندگی میں کبھی اتنا مشکل نہیں لگا تھا، وہ یہی سوچ رہی تھی اگر اسے یہاں رہنا پڑ گیا تو وہ کیسے رہے گی۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا اور وہ مزے سے سو رہا تھا۔ اس نے ایک نوالہ چکھا۔ سالن میں سے دھوئیں کی زبردست دھانس آ رہی تھی۔ ابکائی لے کر اس نے چپ چاپ واپس رکھ دیا۔

☆☆☆

صبح وہ باتھ روم میں تھی اور فرصت سے غسل لے رہی تھی، تب ہی کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹ ڈالا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور باہر آئی۔

"دو گھنٹے سے باتھ روم قبضے میں کیا ہوا ہے۔ کیا کوئی دوسرا نہیں رہتا یہاں۔" وہ حسب

معمول برسا۔

"واٹ نان سینس..... اتنے بڑے بنگلے میں کیا ایک یہی باتھ روم ہے۔" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"نیچے کے سارے غسل خانوں میں مینڈک ٹرا رہے ہیں۔" یومنہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"طبیعت کی نفاست بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہم دیہاتی ضرور ہیں، لیکن مزاج ہمارے پرکھوں سے ملے ہوئے ہیں۔" وہ تیزی سے کہتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔

"ہونہہ!" یومنہ کندھے اچکا کر نیچے اتر آئی۔

وہ باہر لان کا جائزہ لے رہی تھی۔ تب ہی وہ فریش ہو کر آ گیا۔

"ہمارا خیال تھا کہ تم نے ناشتا بنا لیا ہو گا۔" وہ بہت جلدی میں نظر آ رہا تھا۔

"مگر تمہاری کاہلی تو ہم سے رات ہی آشکار ہو گئی تھی۔"

"ناشتا کیسے بناؤں؟" وہ جل کر بولی۔

"اس جنگل ویرانے میں یہ بھوت بنگلہ لے تو لیا مگر اس میں رہے گا کون؟ کس چیز کی سہولت ہے یہاں، گیس یہاں نہیں ہے، ٹیلی فون یہاں نہیں ہے، زندگی کی اور ضروریات، آس پڑوس میں یہاں کوئی نہیں ہے۔ پورے شہر میں تمہیں یہی ویرانہ ملا تھا۔"

"تیس لاکھ میں یہ گھر خریدا تھا، سمجھیں۔ زندگی کی ضروریات رہنے کے ساتھ آہستہ آہستہ پوری ہوتی ہیں۔" وہ غرا کر بولا۔

"یہاں کے سب لوگ ایندھن ہی استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ سرکاری ملازم بھی ہیں کیا یہ لوگ انسان نہیں ہیں۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ زندگی میں ایک بات مان لی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب تمہاری فرمائشیں ہی پوری کرتا رہوں گا۔ کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں تم میں۔" اتنی ذلت پہ وہ اندر تک جھلس گئی۔

"سرخاب کے پر مجھ میں نہیں، تم میں لگے تھے، تو پھر کیوں مجھ سے شادی کی۔ کر لیتے کسی اور سے۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"ایک بات ہم ایک بار کرتے ہیں بار بار نہیں۔ بتا دیا تھا تمہیں پہلی بار کیوں کی سمجھیں۔ ہم گاؤں جا رہے ہیں۔ بہت کام ہوتے ہیں ہمیں۔ سارا دن تمہارے نخرے نہیں اٹھا سکتے۔ فریج میں دوپہر کے کھانے کا سامان رکھا ہوا ہے۔ فروٹ بھی پڑا ہے۔ ناشتا کر لینا۔ ہمیں ماں کے ساتھ کھانے کی عادت ہے۔ رفتہ رفتہ ختم ہو گی۔ اللہ نگہبان۔

"اور ہاں، دروازہ ہم باہر سے بند کر کے جائیں گے۔ ابھی ہمیں تم پہ بھروسہ نہیں ہے۔"

اُف اس کے لفظوں پہ وہ لہولہان ہوگئی۔

☆☆☆

قیامت جیسا دن جو کٹ کر ہی نہیں دیتا تھا۔ آدھا دن روئی، آدھا دن کام کاج کیا، گھر کا جائزہ لیا۔ اور پھر جب شام پھیلنے لگی مینڈک ٹرانے لگے تو اسے اس خالی گھر میں وحشت ہونے لگی۔

اسے خالی گھر سے خوف آنے لگا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اس کے ساتھ گاؤں ہی چلی جاتی۔ سارے دن میں اسے اب یہ خیال آیا تھا، وہ بولائی بولائی پھرتی رہی۔

شام کے بعد رات پھیل گئی، گہرا سناٹا اور سرسراتی ہوائیں۔ آس پاس کی کوٹھیوں کی بھی لائٹیں جل گئی تھیں، مگر یہ ننھی ننھی بتیاں صرف گھروں کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

وہ اندر ڈرائنگ روم میں آگئی اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ نجانے کیسی بے سکونی تھی کہ ٹی وی میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ایسے ہی بیٹھی رہی۔ کبھی گھڑی پہ نظر جاتی اور کبھی اسکرین۔

نو، دس، گیارہ اور پھر بارہ۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ اکیلے گھر میں سونے کا تصور کتنا محال تھا۔ ”مجھے سے وہ نہ آئے، مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ لیکن میرا کیا قصور ہے۔ جو میں یوں مجرموں کی طرح بیٹھی ہوں“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

رات پورے ایک بجے وہ گھر میں آیا تو اس کا دل چاہ رہا تھا اس پہ الٹ پڑے۔ سارے دن کی اذیت اور پھر رات کا انتظار.....

”آخر کس جرم کی سزا دے رہے ہو؟“ اس کا لہجہ بھرا رہا تھا۔ خرم نے سرد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔

”گاؤں سے شہر آنے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔ صبح شام تین گھنٹے کا سفر، آخر ہم بھی انسان ہیں۔“

”تو کس نے کہا تھا تمہیں جانے کے لئے۔“ وہ پھٹ پڑی۔ اب اس کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔

”تم نے روکا بھی تو نہیں تھا۔“ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

”کیا تمہیں خود نہیں پتا تھا۔“

”سارا دن بھوکی پیاسی بیٹھی رہی ہوں۔ اس سے تو بہتر میں اپنے ماں باپ کے گھر میں تھی۔ کیوں بیاہ کر لائے تھے مجھے۔“ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رو دی۔

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”گھر والے شہر آنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ تم گاؤں جانے کے لئے تیار نہیں ہو۔ بتاؤ

ہم کیا کریں؟ جب کہ ہمارا کام بھی۔ گاؤں میں ہی ہے۔ ہمارا فارم، ہماری زمینیں، ہم تو شہر یا بینک کے کاموں کے لئے آتے تھے۔ یا خریداری کے لئے، اور اب تمہارے لیے۔“ وہ آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ یومنہ کو اچانک احساس ہوا کہ وہ اس کے کتنے قریب ہے۔ مکمل اس کے اختیار میں وہ تیزی سے اس کے قریب سے ہٹ گئی۔ وہ اب بھی اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یومنہ کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ لیکن وہ سنبھل گئی۔

مگر یہ سنبھلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ خرم دوبارہ اس کے قریب آگیا اور اس کے الجھے الجھے بالوں کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

”ہم پاس ہوتے ہیں تو ہم سے ڈرتی ہو۔ اکیلی ہوتی ہو تو خود سے ڈرتی ہو۔ کیوں لگتا ہے تمہیں اتنا ڈر؟“ یومنہ کا وجود اس کے قرب سے پگھل رہا تھا۔

لیکن اس کا ذہن سپردگی پہ آمادہ نہیں تھا۔

”یہ وہی شخص ہے جس نے مجھے پورا دن اور آدھی رات کی اذیت دی ہے۔ میری کسی ضرورت کا خیال نہیں رکھا۔ اور اب آگیا اپنی ضرورت پوری کرنے۔“ اس نے کڑھ کر سوچا۔

”مت چھوؤ مجھے۔ نہیں آنا چاہتی میں تمہارے پاس۔“

اس کی جھنجھلاہٹ و بے زاری بجا تھی۔ اس کا شکوہ بھی جائز تھا، لیکن خرم نے اس کے شکوے کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کی کلائی سختی سے دبوچ لی اور اسی سختی سے بولا۔

”نہیں ہوتا تو تڑپتی ہو۔ آجاتا ہوں تو دھکے دیتی ہو۔ کیوں تمہاری ذات میں دوغلا پن ہے۔“ یومنہ سر سے پاؤں تک جھنجھنا اٹھی۔

”خوش فہمی ہے تمہاری کہ تمہارے لیے تڑپتی ہوں۔“

”تو پھر کیوں نہیں سو گئی تھیں ہمارے آنے سے پہلے۔“ اس کے لہجے میں عجیب طرح کا اصرار تھا۔ یومنہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کاش تمہارے اندر دوسروں کو سمجھنے کی صلاحیت ہوتی۔“

”دوسروں میں ہیں یہ صلاحیت تو وہ ہمیں سمجھا دے۔“

وہ کہتے ہوئے ہنس دیا۔ جس پر یومنہ جل کر رہ گئی تھی۔

”ہمیں پتا تھا کام چور تو ہو ہی۔ سوائے زبان درازی کرنے کے جانتی ہی کیا ہو۔ اب تو پھوٹ گئی ہماری قسمت لو..... کھانا کھا لو۔“

”نہیں کھانا میں نے کھانا۔ لے جاؤ اسے۔“

”اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔ گھر بنتے دنوں میں ہیں، لیکن بستے سالوں میں

ہیں، رفتہ رفتہ ہر سہولت حاصل ہو جائے گی۔ اس میں اتنا واویلا مچانے والی کون سی بات ہے؟"

"لیکن کیا اتنے برسوں تک میں اس گھر میں اکیلی ہی رہوں گی۔" وہ احتجاجاً چیخی۔

"نہیں، دو چار سالوں میں تو ہمارے تین چار بچے ہو جائیں گے۔"

"واٹ نان سینس....." وہ چلا اٹھی۔

خرم کو ہنسی آ گئی لیکن پھر وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ہم نے دیکھا ہے تم ہر چیز کی حقیقت کو پہلی بار قبول کرنے کے لئے یونہی چلاتی ہو۔ کیوں چاہتی ہو کہ ہر چیز تمہاری مرضی کے مطابق ہو، ہر کوئی تمہارے دماغ سے سوچے۔"

"تم..... سردار خرم بن ریاض! تم کبھی نہیں سمجھ سکتے مجھے۔"

"اوکے..... خیر ہے، بغیر سمجھے بھی گزر جاتی ہے لو کھانا کھالو۔"

"نہیں کھانا۔" وہ اسی ہٹ دھرمی پہ قائم تھی۔

"سردار خرم کو کھلانا بھی آتا ہے اور کھانا بھی۔" کہتے ہوئے اس نے بغیر مڑے، یومنہ کو کلائی سے کھینچ کر اپنے پاس گرا لیا تھا۔

☆☆☆

صبح وہ کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی کہ اس کی نگاہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھی تصویر پر پڑی۔ یہ وہی تصویر تھی جس کا چھوٹا سائز اس کے پاس آیا تھا۔

ہنستا مسکراتا چہرہ پوری آب و تاب کے ساتھ تصویر میں سے جھانک رہا تھا۔ کتنی جاندار تصویر تھی۔ جیسے تصور نہیں حقیقی چہرہ ہو۔

"اس کی تصویر دیکھو۔ کتنا خوبصورت ہے، کیا یہی کافی نہیں کہ وہ تمہارا اور صرف تمہارا ہونے والا ہے۔ اتنا شاندار شخص۔ کسی بھی لڑکی کا فخر ہو سکتا تھا۔ باقی اپنے لیے خود بنا لینا۔" آئمہ کی آواز کہیں آس پاس گونجی تو اس نے اس تصویر کو واپس رکھ دیا۔

چہرے سکھ یا دکھ کی ضمانت نہیں ہوتے۔ تصویر رکھ کر بوجھل ذہن سے وہ بالکنی کی طرف مڑ گئی۔

"کیا ہے زندگی، کچھ بھی نہیں۔ یوں سمجھ لوں کہ ایک عیاش مرد رات رنگین کرنے آتا۔ اور صبح اس سونے کے پنجرے میں بند کر کے چلا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ زندگی کس جرم کی سزا بن گئی ہے۔"

اچانک اس کی نگاہ سامنے پڑی تو وہ چونک گئی۔ سامنے بنگلے کے پورچ سے گاڑی نکل رہی تھی۔ گاڑی نکالنے والی ایک لڑکی تھی، خوبصورت اور نوعمر، تھوڑی دیر کے بعد بڑی تیزی سے ایک مرد اندر سے آیا۔

"ارم، ارم، ارم.....!" گاڑی رک گئی وہ بھاگ کر اس کے پاس گیا۔ گاڑی کا دروازہ

کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔

اندر نجانے کیا بحث ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں کے بعد دیگرے گاڑی سے نکلے۔ دونوں کے چہرے مسکرا رہے تھے۔ نجانے مرد نے لڑکی سے کیا کہا تھا۔

وہ اس پر اچانک جھپٹی تھی اور وہ اسی پھرتی سے اندر بھاگا تھا۔ لڑکی اس کے تعاقب میں پیچھے بھاگ گئی تھی۔ گھر کی بالائی منزل کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے تو اس نے ان لوگوں کو یہاں نہیں دیکھا تھا۔ نجانے دونوں کا آپس میں کیا رشتہ تھا؟ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ وہی چہرہ اوپر والی منزل میں دکھائی دیا۔ وہی لڑکی بالکنی کی گرل مٹھیوں سے تھامے بے تحاشا ہنس رہی تھی۔

کتنی بے فکر، کتنی زندہ اور کتنی سریلی ہنسی تھی اس کی بالکل اس کی طرح۔ کبھی وہ بھی اسی طرح ہنستی تھی۔

وہ دلچسپی سے لڑکی کو دیکھنے لگی۔

لڑکی ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی تو اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنی آنکھوں کا پانی صاف کیا پھر سامنے اسے دیکھ کر وہ ہاتھ ہلانے لگی، یومنہ پہلے تو نروس سی ہوئی پھر شگفتگی سے مسکراتے ہوئے اس نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔

اتنی دیر میں وہ شخص بھی آ گیا۔ یومنہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ اس کے سر اور منہ پہ آٹا لگا ہوا تھا۔ لڑکی کا ہنس ہنس کے برا حال تھا۔ مرد کی نگاہ یومنہ پر پڑی تو نروس سا ہو گیا۔

"یہ میرے ماموں ہیں۔" لڑکی نے بے تکلفی سے تعارف کرایا۔ یومنہ کو حیرت ہوئی۔

"یہ ہمارے منے پڑوسی ہیں، ابھی کچھ دن قبل یہاں شادی ہوئی ہے۔" وہ اپنے ماموں کو بتا رہی تھی پھر یومنہ کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"آپ دلہن ہیں یا دلہن کی رشتے دار۔"

یومنہ کو اپنے حلیے پر سخت شرمندگی ہوئی۔ ایک ہفتے کی دلہن، ناک کان ہاتھ سب خالی سادہ سے کپڑے، گندہ سا حلیہ، یومنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ویسے ہم لوگ بھی شادی میں گئے ہوئے تھے۔ کل رات ہی آئے ہیں۔ ورنہ میں دلہن دیکھنے ضرور آتی ہم آپ کے بہت پرانے پڑوسی ہیں۔ آپ لوگ آیئے گا ہمارے گھر۔" یومنہ نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلا دی اور جان چھڑانے کی غرض سے وہاں سے ہٹ گئی۔

شام کو وہ لان میں پانی دے رہی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ وہ چونک گئی۔

خرم کو آنے کے لئے ڈور بیل بجانے کی کیا ضرورت تھی وہ پائپ چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

"کون ہے؟"

"بھئی دروازہ تو کھولیں۔" شاید وہی لڑکی تھی۔

یومنہ شش و پنج میں پڑ گئی، کیا انہیں تالا نظر نہیں آ رہا ہوگا۔ اس نے بے خیالی میں دروازہ کھول دیا۔ دروازہ فوراً سے کھل گیا لڑکی اندر آ گئی۔

"کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟" وہ اندر آنے کے بعد اجازت مانگ رہی تھی۔ یومنہ حیران تھی کہ دروازہ تو کھلا ہوا تھا پھر خرم یوں کہہ کر جاتا تھا کہ وہ دروازہ لاک کر کے جاتا ہے۔

"کیا آپ کو ہمارا آنا برا لگ رہا ہے؟"

"نہیں، نہیں۔ آیئے اندر آیئے۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

اور اسے اپنی ہمراہی میں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"آپ یہاں اکیلی ہیں۔ گھر میں کوئی اور نہیں ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرے میاں شام کو آتے ہیں۔" یومنہ نے سادگی سے کہا۔

"اچھا آپ ہی دلہن، بڑے ظالم سسرالی ہیں آپ کے۔ نئی نویلی دلہن کو اکیلے گھر میں ایسے چھوڑتے ہیں۔ تب ہی تو آپ اتنی اداس اداس ہیں، کیسے دل لگتا ہوگا آپ کا۔ آپ کے تو ابھی سے جھگڑے شروع ہوئے ہوں گے۔ یہ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان سے جب تک لڑو نہیں نا ان کی عقل ٹھکانے نہیں آتی۔"

"آپ ٹھنڈا پئیں گی یا گرم۔" یومنہ نے شائستگی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں، امی نے آپ لوگوں کے لئے رس ملائی بھیجی تھی۔ یہ ہم نے خود بنائی ہے۔ یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔ یہی دینے آئی تھی۔"

"شکریہ۔" یومنہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں چلتی ہوں، پھر آؤں گی۔" ماموں انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس کے آنے سے گھر میں کیسی رونق سی ہو گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہی اداسی ٹھہر گئی اور ایک سوچ بھی کہ خرم جب تالا لگا کر نہیں جاتا تو کہتا کیوں ہے کہ تالا لگا کر جا رہا ہوں۔ کیا اسے آزمانے کے لئے.....؟

اگر اس نے بتا دیا کہ اس نے پڑوس کے لوگوں سے تعلق رکھنا شروع کر دیا ہے اور خرم کو یہ بات پسند نہ آئی کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ واقعی تالا لگا کر جانا شروع کر دے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ بات وہ اسے نہیں بتائے گی۔

اس نے رس ملائی کھا کر ڈبہ دھو کر رکھ دیا۔ آج خرم کے جانے کے بعد وہ بالکنی میں آئی تو وہ وہی لڑکی لان میں پانی دے رہی تھی ہاتھ ہلا کر اسے سلام کیا۔ یومنہ نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔

"آج چھٹی کا دن ہے، آپ کی کوئی مصروفیت نہ ہو تو ہمارے یہاں شام کو آیئے گا۔ بڑا زبردست کرکٹ میچ ہوگا۔"

یومنہ سوچنے لگی۔ اس کی زندگی میں کسی چھٹی کے ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ ظاہر ہے کام کاج کرنے والے لوگ ہی چھٹیوں کو انجوائے کر سکتے ہیں۔"

"آپ نے جواب نہیں دیا؟" لڑکی اس کی طرف متوجہ تھی۔ یومنہ چونکی۔

"کرکٹ پسند ہے آپ کو.....؟" پھر فوراً دوسرا سوال حاضر تھا۔

"اچھا..... میں شام کو آؤں گی۔" اس نے مسکرا کر دونوں باتوں کا جواب دے دیا لڑکی مطمئن ہو گئی۔

شام کو اس نے ہلکے سے کام کا جارجٹ کا سوٹ پہنا، ننھے آویزے کانوں میں ڈالے، دو دو سونے کی چوڑیاں کلائیوں میں ڈالیں۔ نیچرل لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل ڈال کر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔

کیسا ہو گیا تھا اس کا روپ، اداس، اداس سراپا اور معصوم سا حسن، آج وہ خود کو بے حد حسین لگ رہی تھی۔ گھنے براؤن بال جو کمر تک آئے تھے، اس نے کھلے ہی چھوڑ دیئے۔

گھر سے نکلتے ہوئے اس نے وقت دیکھا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ اس نے دل میں یہی ارادہ کیا کہ دو گھنٹے تک آ جائے گی۔

لان میں سب اسی کے منتظر تھے۔ سب نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔

"آپ اکیلی آئی ہیں، آپ کے ہسبینڈ نہیں آئے۔" لڑکی نے اس سے لپٹتے ہی سوال کیا۔ یومنہ کو کچھ شرمندگی سی ہوئی۔

"دراصل انہیں کوئی کام تھا اس لیے نہیں آ سکے۔"

"چلو خیر ہے پھر کسی دن آ جائیں گے۔" لڑکی کی ماں نے کہا۔

"آؤ بیٹھو۔" یومنہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔ باقی مرحلہ لڑکی نے ہی طے کیا۔

"سب سے پہلے میں اپنا تعارف کراتی ہوں۔ میرا نام ارم حسنین ہے۔ یہ میری والدہ ہیں قدسیہ حسنین۔ یہ میرے والد ہیں حسنین خاکوانی۔ یہ تینوں بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ عامر، احمر اور عمر۔ یہ ہمارے ماموں ہیں۔ صاحبزادہ زوہیب ابراہیم، یہ دونوں لڑکے احمر کے دوست ہیں آپ کی طرح پڑوسی اور ہماری کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی، انس اور حمزہ۔ ان کے پیرنٹس بھی ابھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔ اب آپ اپنا تعارف خود کرائیں گی۔"

یومنہ مسکرا دی۔ پھر توقف سے بولی۔

"دو ہفتے قبل میرا نام یومنہ ہمدانی تھا۔ اب میں یومنہ خرم بن ریاض ہوں۔ اس سے زیادہ میرا تعارف کچھ نہیں۔" اس نے اعتماد سے بات ختم کی۔

"حالانکہ آپ کی تعریف میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ نئی نویلی دلہن ہیں۔ اکیلی رہتی ہیں۔ سارے گھر کا کام کاج کرتی ہیں۔ ہمت ہی نہیں، حوصلہ بھی ہے۔ بائی داوے، خرم بن ریاض کی پہلی ہی شادی ہے نا۔ عموماً بیویوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔"

یومنہ کو لڑکی کی بے باکی ایک دم پزل کر گئی۔

"ارم......! ضرورت سے زیادہ ہی اوور ہو جاتی ہو تم۔ یہ ان کے پرسنل افیئرز ہیں۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا ایسے سوال کرنے کا۔" ارم کی والدہ نے ارم کو ڈانٹا۔ وہ سچ مچ شرمندہ ہو گئی۔

کبھی وہ بھی تو ایسی تھی۔

"سوری کرو ان سے۔"

"کوئی بات نہیں۔" یومنہ جلدی سے بولی۔

"آئی ایم سوری۔" ارم منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"اینی وے۔ محبتیں انسان کو اتنا ہی بے باک بناتی ہیں۔" یومنہ کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے لگی تھیں۔

سب کی نظروں سے بچنے کے لئے اس نے نگاہیں ہٹائیں تو نظروں کا تصادم صاحبزادہ زوہیب سے ہو گیا۔ جو گہری دلچسپی سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور نجانے کب سے دیکھ رہا تھا۔

یومنہ نے فوراً نظریں نیچی کر لیں۔

اسی اثنا میں ملازمہ لوازمات سے بھری ٹرالی لے آئی۔ چائے کے ساتھ بہت کچھ تھا، سب کے اصرار پہ اس نے تھوڑا تھوڑا چکھا۔ اسے سب کچھ کھانے میں بہت مزہ آیا۔

چائے کے بعد کرکٹ شروع ہوئی۔ یومنہ ان کی والدہ کے پاس بیٹھی ان کا میچ بھی دیکھتی رہی اور گاہے بگاہے ان سے بات چیت بھی کر لیتی۔

"میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے، بہت دیر ہو گئی ہے۔" ان لوگوں کا کھیل بھی ختم ہو چکا تھا اور شام کے سائے اندھیروں میں گم ہونے لگے تھے۔ وہ سب سے اجازت لیتے ہوئے اٹھ گئی۔

"پھر کب آئیں گی؟" ارم نے چلتے چلتے بے چینی سے پوچھا۔

"آتی رہنا۔ تمہارا اپنا ہی گھر ہے، اچھا ہے، دل لگا رہے گا۔" ارم کی والدہ نرمی سے بولیں تو وہ مسکرا دی۔

"دل کا لگانا اتنا بھی ضروری نہیں۔" اس نے ان کے ساتھ قدم سے قدم ملاتے ہوئے

کہا۔ اس کی بات پہ ارم دل کھول کر ہنسی، پھر کہنے لگی۔

"آپ باتیں اچھی کر لیتی ہیں۔"

"بشرطیکہ باتیں کریں تو......" پہلی بار زوہیب نے ان کی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

یومنہ نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ وفورشوق سے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ یومنہ کچھ پزل سی ہو گئی۔

"چلیے میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس نے بے تکلفی سے اس کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے کہا۔

"نہیں رہنے دیجئے۔ سامنے تو میرا گھر ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"گھبرا گئیں۔ کہیں آپ کے ہسبینڈ نہ دیکھ لیں؟" اس کا انداز شگفتہ اور کچھ کھوجتا ہوا تھا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" یومنہ جلدی سے سنبھل گئی۔

"اچھا خدا حافظ......" اس کے بعد اس نے کسی کو پلٹ کر نہیں دیکھا اور تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔

گھر آنے کے بعد وہ بہت دیر تک سب کے بارے میں سوچتی رہی۔

انسانوں سے گھر ہوتے ہیں۔ خالی دیواروں سے نہیں۔ اپنے گھر کا تصور اس کی آنکھیں نم کر گیا۔

اسے اپنے ماں باپ شدت سے یاد آنے لگے کہ اور پھر آنکھوں سے آنسو ٹپاٹپ گرنے لگے۔ لاکھ وہ کہہ آئی تھی کہ وہ اس گھر میں دوبارہ نہیں آئے گی۔ مگر اس کا مطلب تو نہیں کہ کوئی اسے پلٹ کر پوچھے ہی نہیں۔

"امی ابو کبھی بھی اتنے سخت مزاج کے نہیں تھے پھر اچانک انہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا میری وجہ سے۔ میرے رویے کی وجہ سے؟" وہ خود کو ٹٹولنے لگی۔

"وہ چاہتے ہیں میں اس جنگلی شخص کے ساتھ مانوس ہو جاؤں اور سب پہ ظاہر کروں کہ بہت خوش ہوں، قطعی نہیں۔ میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ میرے ماں باپ میری زندگی برباد کرنے کے ذمے وار ہیں۔" وہ اپنے والدین سے بدظن ہو رہی تھی لیکن ان سے ملنے کے لئے دل تڑپ بھی رہا تھا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ چکی تھی۔

"کس کی یاد میں آنسو بہائے جا رہے ہیں؟"

اچانک وہ اتنے قریب آ کر بولا کہ وہ ڈر گئی۔

"اماں...... بابا آئے ہیں، ہمارے اور بھی گھر والے ساتھ ہیں۔ چل اٹھو۔ انہیں اندر لا کر بٹھاؤ۔"

یومنہ نے آنسو صاف کیے جلتی نگاہوں سے خرم کی طرف دیکھا۔

"تم کتنے بے حس ہو خرم! تمہیں یہ احساس نہیں کہ میرا وقت کیسے گزرتا ہے۔ مجھے میرے والدین سے جدا کر کے تمہیں کیا ملا؟"

"ہم نے کوئی جدائی نہیں ڈالی۔ جانے تم کیا سلوک کر کے آئی تھیں کہ دوبارہ کوئی ملنے آیا ہی نہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے ان کے کندھے سے بوجھ اتر گیا ہو۔" خرم کے لہجے میں طنز تھا۔ یومنہ کا جگر تک چھلنی ہو گیا۔

اس سے قبل وہ کوئی جواب دیتی، اس کی ساس خود ہی اندر آ گئیں۔

"ہم اتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اور تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو۔"

"اکیلے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے اسے۔ اب انسانوں میں آنے کو دل نہیں کرتا۔" خرم استہزائیہ بولا۔

"جنگل میں لا کر بھی تو تم نے ہی چھوڑا تھا۔" اس نے دوبدو جواب دیا۔ بہو کی بے باکی پر سلیمہ حیران رہ گئیں جبکہ خرم ہنس پڑا۔

"سیانے ٹھیک کہتے تھے۔ بنا ماں کی دھی بے لگام، بنا ساس کی بہو بے لگام۔" سلیمہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئیں۔

"سلام اماں جی!" اس نے کچھ لحاظ کرتے ہوئے سلام کیا تو سلیمہ نے خشک سے انداز میں جواب دے دیا۔

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ خاطر مدارات کا انتظام کر لینا۔"

"گھر میں کچھ نہیں ہے تو اضع کے لئے۔" اس نے فوراً کہا اور ساس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"بیٹھیے اماں جی! آپ کھڑی کیوں ہیں؟"

"بہت شکریہ۔"

"ابھی آ جائے گا سب کچھ۔" خرم کہتے ہوئے نکلا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے ہمارے لیے کچھ بھی تکلف کرنے کی۔ ویسے بھی شام ہو رہی ہے۔ ہمیں جلد ہی جانا ہے۔ تم بتاؤ، تمہارا دل لگ رہا ہے یہاں۔"

"دل کا کیا ہے۔ نہ بھی لگے تو گزر ہی جاتی ہے۔" سلیمہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر اس کے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے ناگواری سے بولیں۔

"اتنی کتابیں نہ پڑھا کرو۔ دماغ پر اثر ہو جاتا ہے۔ اکیلی گھر میں رہتی ہو، ڈر نہیں لگتا تمہیں؟" ساس کا دوسرا سوال آیا تھا۔

یومنہ ہنس پڑی۔ (ڈر بھی آپ ہی کے بیٹے سے لگتا ہے)

"میں آپ کے لیے کچھ بنا کے لاتی ہیں۔"

"رہنے دو۔ وہ تو ایسے ہی کہہ گیا۔ تم بتاؤ، تم نے کچھ کھایا پیا تھا۔"

"کھا ہی لیتی ہوں، جو سامنے آتا ہے۔"

"اور جو کبھی دیور جی سامنے آ جاتے ہوں گے تو....."

"تو.....؟" اس نے جٹھانی کی طرف نظر کی۔

وہ ہنس رہی تھی۔

"مجھ پر تو بہت اعتراض کرتا تھا، میں صفائی نہیں رکھتی۔ میں یہ نہیں کرتی۔ وہ نہیں کرتی۔ بیوی اکیلی رہتی ہے۔ گھر میں دیکھو کتنی گندگی پھیلی ہوئی ہے۔" آج اس نے واقعی صفائی نہیں کی تھی۔ فرنیچر پر گرد چڑھی ہوئی اور چیزیں کچھ بے ترتیب سی لگ رہی تھیں۔

یومنہ کو کچھ شرمندگی تو ہوئی۔ لیکن وہ ڈھیٹ بن کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

دو تین گھنٹے میں وہ لوگ چلے گئے۔ انہیں رخصت کر کے خرم اندر آیا تو اس کا مزاج بہت برہم ہو رہا تھا۔

"یہی کچھ سیکھ کر آئی تھیں تم اپنے ماں باپ سے۔ گھر آئے مہمانوں کی عزت اس طرح کی جاتی ہے۔"

"اول تو وہ مہمان نہیں تھے، اس گھر کے مالک تھے۔ اور پھر میں نے کیا نہیں کیا۔ کیا انہیں سر پہ بٹھا لیتی۔"

"صرف تم سے ملنے آئے تھے وہ لوگ، تمہیں احساس ہے۔"

وہ غرایا۔ یومنہ کا دل بھر آیا۔

"اور جو میں اپنے لوگوں سے اتنی دور ہو گئی ہوں۔"

"اگر انہیں تمہاری پروا ہے تو آ جائیں ملنے۔" وہ لاپرائی سے بولا۔

"یہاں تو فون بھی نہیں ہے۔ جو بات ہی کر لوں۔"

"تو کیا تمہیں اب فون بھی لگوا کر دینا پڑے گا۔"

"پہلے تو بہت کچھ لگوا دیا تم نے میرے لیے" وہ کہہ دینا چاہتی تھی۔ لیکن خاموش ہو گئی اور پھر دھیرے سے بولی۔

"مجھے کل گھر لے چلو گے ملوانے کے لئے؟"

"میں کوئی تمہارے باپ کا ملازم نہیں ہوں۔" وہ روٹھے پن سے بولا۔ وہ احتجاج کرنا

چاہتی تھی لیکن اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

''رونا دھونا، عورتوں کا پرانہ حربہ ہے، لیکن سردار خرم ان باتوں میں نہیں آتا۔ اتنی مظلوم نہیں ہو جتنا بن کر دکھاتی ہو۔ کیوں رہتی ہو ہم سے اتنی بے زار۔ شاہی زندگی گزار رہی ہو تم نہ کسی ساس نند کی روک ٹوک ہے، نہ گھر کے کام کاج کا بوجھ۔ آزادی سے عیش کر رہی ہو۔ صبح جاتا ہوں، شام کو آتا ہوں۔ اور کیا چاہتی ہو؟''

''تم نہیں سمجھ سکتے سردار خرم! سمجھ ہی نہیں سکتے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔''

سردار خرم بول رہا تھا اور اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

صبح اس کے جانے کے بعد وہ ارم کے گھر چلی گئی۔ گھر میں صرف ارم کی امی اور زوہیب تھا۔ وہ اسے اس وقت اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئیں۔

''میں ذرا فون کرنے آئی تھی۔'' اس نے آنے کی وجہ بیان کی۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ زوہیب فون پہ بات کر رہا ہے۔ تم بیٹھو۔'' وہ اس سے باتیں کرنے لگیں۔

''یہ آپ کے بھائی، آپ کے ساتھ رہتے ہیں؟'' اسے زوہیب کا ہمہ وقت ان کے گھر میں رہنا عجیب سا لگا۔ سو پوچھ بیٹھی۔

''دراصل میں آج کل ایک اسکول کی تعمیر میں مصروف ہوں۔ اس لیے گاہے بگاہے ادھر نظر آجاتا ہوں۔''

زوہیب کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر آکر سامنے ہی براجمان ہو گیا۔

''اسکول کا کام آخری مراحل میں ہے۔ جلد ہی افتتاح ہو گا۔ اور ہر طرف ہمارے ہی اسکول کے چرچے ہوں گے۔ کیوں آپا جان!''

''اِن شاء اللہ۔'' ارم کی امی ہنس دیں۔

''اگر آپ کو ٹیچنگ کا شوق ہے، یا آپ گھر میں فارغ ہیں تو ہمارا ادارہ حاضر ہے۔ تعلیم یافتہ افراد کی مایوسی کا خاتمہ، تابندہ پبلک اسکول۔'' ارم کی امی کے ساتھ یومنہ کو بھی ہنسی آگئی۔

''آپ ہنستی بہت کم ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟'' وہ یومنہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

وہ نروس تو ہوئی پھر پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

''ہنسنے والی بات پہ ہی ہنسنا چاہیے۔ ہمہ وقت ہنسنا بھی بے وقوفی ہے۔''

''ونڈر فل۔''

''ارم نے آپ کے بارے میں ٹھیک کہا تھا۔ آپ باتیں اچھی کرتی ہیں۔ بشرطیکہ باتیں کریں تو۔''

یومنہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔

''کبھی ارم نے آپ کے بارے میں کچھ نہیں کہا؟''

''بہت کچھ کہتی ہے۔ اتنا کچھ...... کہ اگر لکھا جائے تو ایک داستان بن سکتی ہے۔ مورّخ تاریخ لکھ سکتے ہیں اور شاعر...... ہماری شخصیت میں تو اتنے رنگ ہیں۔'' اس نے فرضی کالر جھاڑے۔

یومنہ محظوظ ہو رہی تھی۔ اچانک ہی اس کی طبیعت کی ساری کلفت دھل گئی تھی۔

''تم لوگ باتیں کرو۔ میں تمہارے لیے شربت بنوا کر لاتی ہوں۔''

''ارے نہیں آنٹی! میں تو فون کرنے آئی تھی۔''

''تو آپ کے کون سے دو چار بچے رو رہے ہیں گھر میں۔ آپ چلی جایئے گا ایک یا دو گھنٹے بعد۔''

وہی گھر ہوگا اور وہی خالی دیواریں۔'' یومنہ یکدم چپ سی ہو گئی۔

''چلو اچھا تم فون کر لو۔ اور دیکھو زوہیب کی بات کا برا نہ ماننا۔ بس یونہی کہہ دیتا ہے۔ ارم کی عادت بالکل اپنے ماموں پہ گئی ہے۔ دونوں ہی ایسے ہیں۔''

وہ اسے اپنی ہمراہی میں فون کے پاس لے آئیں۔

فون کی بیل جا رہی تھی پھر فون سائرہ نے ہی اٹھایا تھا۔ یومنہ کا دل بھر آیا۔

ماں سے بات کر کے اسے سکون کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ اس کے ابو کے ساتھ ایک دو روز میں اس کی طرف ضرور آئیں گی۔ یومنہ کی طبیعت ایک دم پُر سکون ہو گئی۔

وہ ڈرائنگ روم میں واپس آئی تو اس کے چہرے پہ طمانیت کا احساس تھا۔

''لگتا ہے بہت دنوں کے بعد آپ نے اپنے والدین سے بات کی ہے۔''

''واقعی......'' وہ خوشی کی لہر میں بول گئی۔

لیکن پھر اسے خود احساس ہوا تو اچنبھے سے بولی۔

''آپ نے کیسے جانا؟''

''آپ کے چہرے سے۔'' یومنہ کچھ الجھ سی گئی۔

اتنے میں ارم کی والدہ شربت لے آئیں۔

''زوہیب کی کمپنی میں بور کوئی بھی نہیں ہوتا اس کے آنے سے میرا بہت اچھا وقت گزر رہا

ہے۔ سوچتی ہوں جب یہ مصروف ہو جائے گا تو میں اسے بہت زیادہ مس کروں گی۔"

"ظاہر ہے ایک ہیلپر کی کمی تو ہو جائے گی۔ آج میں آپا کے ساتھ سبزی کٹوا رہا تھا تو کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے مجھے سب کام سکھا دیے ہیں۔ اب میری شادی ہو گی تو میری بیوی..... ان کی طرح وقت نہیں اٹھائیں گی۔ میں اس کی مدد کر دیا کروں گا۔ لیجیے شربت لیجیے۔" اس نے یومنہ کے سامنے گلاس رکھتے ہوئے کہا تو یومنہ نے گلاس تھام لیا۔ لاشعوری طور پر اس کی دلچسپی کا مرکز اس وقت زوہیب کی بات چیت تھی۔

"آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

اس نے چھوٹا سا سپ لیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ جیسی کوئی لڑکی نہیں ملی۔ ویسے آپا! قدرت کی کتنی بڑی مصلحت ہے۔ اگر مسز خرم، مسز بخے سے پہلے ہمیں نظر آ جاتیں تو ہمارا بھی مسئلہ حل ہو جاتا۔" اس کی اتنی بے باکی پہ یومنہ کے حلق میں پھندا لگ گیا۔

"زوہیب! اللہ تعالیٰ ان کی جوڑی سلامت رکھے اور تمہیں بھی ایسی لڑکی ملے، ایسی باتیں نہیں کرتے۔" ان کا انداز سرزنش کرنے کا تھا۔

"میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا آپا! کبھی کبھی آپ مجھے ارم سمجھ لیتی ہیں۔"

"چلو اٹھو یہاں سے۔" قدسیہ نے اسے اٹھانا چاہا۔

"لگتا ہے آپ کی ہنڈیا جل رہی ہے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔" وہ اٹھ کر چلا گیا۔

"لگتا ہے زوہیب آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔" یومنہ دونوں بہن بھائیوں کی محبت سے متاثر ہو کر بولی۔

"اس کی پیدائش پہ امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے ہی پالا تھا اسے۔ یہ ہم چاروں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے۔ میری اور فوزیہ کی شادی کے بعد ابو نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ہمارے بڑے بھیا سعودی عرب میں رہتے ہیں۔ پھر ہم دو بہنیں ہیں۔ پھر زبیر اور زوہیب۔ ہم پانچوں بہن بھائیوں میں عمروں کے فرق کے باوجود بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ ابو کی عدم توجہ و دلچسپی بھی ہمارے تعلقات میں خلا پیدا نہیں کر سکی۔ ہم پانچوں ایک دوسرے کے لیے بہت کچھ ہیں، ماں باپ، دوست، اور رہبر.....

تم نے کبھی نہیں بتایا کہ تم کتنے بہن بھائی ہو؟"

"اتفاق سے ہم بھی پانچ ہی بہنیں ہیں۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ امی ابو نے ہماری پرورش بیٹوں سے بڑھ کر کی ہے۔ ہمیں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔"

"اگر آپ کے والدین آپ کو اتنا چاہتے تھے تو انہوں نے آپ کی شادی ایسی جگہ کیوں کی جو لوگ بالکل بھی آپ کے معیار کے نہیں لگتے۔"

زوہیب نے اچانک واپس آ کر مداخلت کی تو یومنہ چپ ہو گئی۔

(یہ شکوہ تو مجھے بھی اپنے والدین سے ساری عمر رہے گا)

"یہ تو قسمت کی بات ہوتی ہے۔ والدین بیٹیوں کو اچھا جہیز دے سکتے ہیں، لیکن اچھا نصیب نہیں اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ لوگ یومنہ کے معیار کے ہیں یا نہیں ظاہر ہے ان کے رشتے دار ہی ہوں گے۔ کیوں یومنہ.....!" قدسیہ بہت سمجھ دار اور جہاندیدہ عورت تھیں۔ سو انہوں نے فوری طور پہ بات سنبھال لی۔ یہ سوچ کر کہیں یومنہ کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔

لیکن ٹھیس تو تب پہنچتی، جب یہی خیال یومنہ کو خود بار بار نہ ستاتا۔ اسے اپنے نصیب سے ہی نہیں ماں باپ سے بھی شکوہ تھا۔

☆☆☆

"دیکھو خرم پتر! تیری ضد مانی تھی تو نے کہا تھا شادی کروں گا تو آفتاب ماموں کی بیٹی یومنہ سے ورنہ کسی سے نہیں۔ ہم نے تیری ضد پوری کر دی۔ لیکن ہمیں پتا تھا کہ آفتاب نے اپنی بیٹیوں کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ ان کے بیٹا نہیں تھا۔ یہ ان کی مجبوری تھی۔ لیکن اولاد ماں باپ کی مجبوریوں سے ہی فائدہ اٹھاتی ہے۔ ایسی لڑکیاں جو سر چڑھی ہوں مشکل سے ہی دبتی اور ڈھلتی ہیں۔ تیرے رشتے کی بات تب مانی انہوں نے جب شہر میں رہائش کا مطالبہ پورا ہو گیا۔ میں اور تیرا بابا اسی وقت ٹھٹھک گئے تھے۔ لیکن تیری ضد تھی پر تیرے بھائی نے کہہ دیا تھا ان کا پہلا مطالبہ پورا کیا ہے۔ ساری عمر مطالبے پورے کرتے گزر جائے گی اور وہی ہو رہا ہے، کل ہمیں تیرے گھر جا کر بہت شرمندگی ہوئی۔ انسان کھانے پینے کا بھوکا نہیں ہوتا، اخلاق ہونا چاہیے۔ وہ تو تیرے سے ایسے بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی جیسے تو اس کا نہیں، وہ تیرا خصم ہو۔

دیکھا ہے تُو نے اپنے بھائی کو، کیسے وہا کر رکھتا ہے اپنی گھر والی کو۔ بہت چلتی ہے اس کی بھی زبان۔ پر ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے اسے۔ تیرا تو سارا رعب ہی ختم ہو گیا ہے۔ ماں بہنوں پہ تو بہت غراتا تھا۔ بھاوج پہ بھی تیری تنقید ختم نہیں ہوتی تھی۔ اب تجھے یہ کیا ہو گیا، برا مت ماننا پتر۔ یومنہ تیرے جوڑ کی تھی ہی نہیں۔ دولت اور تعلیم کے گھمنڈ نے اسے کہیں کا نہیں رکھا۔ پڑھی لکھی لڑکیوں میں یہی خرابی ہوتی ہے کہ وہ اپنی عقل کے آگے کسی کو گھاس نہیں ڈالتیں۔

اور تُو تو کہتا تھا، چند روز میں اسے گاؤں لے آئے گا یا پھر ہم سب شہر آ جائیں گے مگر اس کے رویے سے ایسا نہیں لگتا کہ وہ ہمیں وہاں قبول کرے گی۔ اور گاؤں میں آنا تو اس کا ناممکن ہی

ہے۔ گاؤں تو جب آئے گی جب اسے وہاں کوئی تکلیف ہوگی۔ جب آسائشوں میں رہ رہی ہوگی تو کیوں آنے لگی۔'' اب خرم کا بڑا بھائی مکرم بول رہا تھا اور خرم سر جھکا کر بیٹھا تھا۔

''آسائشیں اور تکلیف۔'' خرم کے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ تھی۔

''اگر اس گھر میں سہولتیں اور سکون ہے تو ہر گھر پُر آسائش ہے، جہاں پینے کا پانی بھی ڈھنگ کا نہیں۔'' اس نے سوچا تھا۔

''کون سی سہولت ہے جو ہم اسے نہیں دے رہے۔ کیسی عورت ہے وہ۔ اور کیا چاہتی ہے۔ ہم کچھ سمجھ نہیں پا رہے۔''

''کیا سوچ رہا ہے پتر؟''

''کچھ نہیں اماں!''

''بہت کمزور ہو گیا ہے تُو، روزانہ تجھے صبح شام سفر کرنا پڑتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تُو بیمار پڑ جائے۔ تیرے بابا کو تیری بہت فکر لگی رہتی ہے۔ تیرے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی، اور نہ ہی اب ہے۔ سکینہ کی بیٹی کا رشتہ اب بھی تیرا منتظر ہے۔ تُو چاہے تو اس کی بیٹی گلاب خانم اب بھی تیری بیوی بن سکتی ہے۔ تیری خواہش تھی سو ہم نے پوری کر دی۔ ان کی ضد بھی پوری کر دی۔ اب اسے شہر میں ہی پڑا رہنے دے۔ تُو اپنی اچھی زندگی گزار، خوش رہنا سیکھ۔ اسے نہ تیری قدر ہے، اور نہ ہی آئے گی۔''

ماں کے آخری الفاظ اسے کچھ سوچنے پہ مجبور کر رہے تھے۔

☆☆☆

آج یومنہ بہت خوش تھی۔ حالانکہ اس کی پچھلی رات نہایت تکلیف کے عالم میں گزری تھی، اس لیے کہ خرم گھر نہیں آیا تھا لیکن جیسے ہی دن کا اجالا پھیلا تھا، اس کا خوف زائل ہو گیا تھا۔ اسے خرم کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے رات کے اندھیروں سے ڈر لگتا تھا۔ تنہائی سے خوف آتا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ لان میں پودوں کو پانی دے رہی تھی کہ اپنے ماں باپ کو آتا دیکھ کر خوش ہو گئی اور پائپ چھوڑ کر وہ ماں سے چمٹ گئی۔ سائرہ نے خود کو سنبھالے رکھا لیکن یومنہ کے آنسو تواتر سے گرتے رہے۔

''ابھی تک ہماری بیٹی ماحول کو قبول نہیں کر پائی۔'' آفتاب ہمدانی نے مسکراتے ہوئے بیٹی کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ ماں سے ہٹ کر باپ سے لگ گئی۔

''کوئی اپنی بیٹیوں کو ایسے بھول جاتا ہے جیسے آپ لوگ مجھے بھول گئے ہیں۔''

اس کی بچکانہ سی بات پہ آفتاب اور سائرہ دونوں ہی ہنس دیے۔

''تم ہمارے دل سے دور نہیں ہو بیٹا! ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تم اس نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہو جاؤ۔ ہم تمہاری زندگی میں بار بار مداخلت اس لیے نہیں کرتے کہ تمہیں بار بار وہی گھر یاد

نہ آتا رہے، جہاں تم پلی بڑھی ہو۔ ہم تمہیں بہت مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں بیٹا! اتنا مضبوط کہ تمہیں کسی بھی تکلیف میں ہماری مسیحائی کی ضرورت نہ پڑے۔ خرم اور تم باہم اپنے معاملات کو سلجھاؤ۔''

سائرہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں لیکن یومنہ پھٹ پڑی۔

''اگر آپ کو میرے لیے ایسے ہی گھر کا انتخاب کرنا تھا تو مجھے اسی ماحول کی ٹریننگ دی ہوتی۔ میرے لیے ان دنوں میں تو کیا عمر بھر یہاں ایڈجسٹ کرنا ناممکن ہے۔ ایسے شخص کے ساتھ کیسے گزارہ ہو سکتا ہے جسے صرف اپنی ضرورتوں کا پتا ہو اور بیوی کی نہیں۔ میں جانتی ہوں، میں اس خالی گھر میں دن کیسے کاٹتی ہوں۔ سارا دن خالی دیواروں سے سر پھوڑتی رہتی ہوں۔ وہ رات کو آتا ہے اور صبح چلا جاتا ہے اور آج رات تو وہ گھر بھی نہیں آیا۔'' وہ رو رہی تھی۔

سائرہ نے آفتاب کی طرف دیکھا اور آفتاب نے سائرہ کی طرف۔ دونوں کے چہروں پہ تفکر کی پرچھائیاں امنڈ آئی تھیں اور آنکھیں سوالیہ انداز میں بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ معاً خرم گھر میں داخل ہوا تو یومنہ کے والدین کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

پھر آگے بڑھ کر دونوں کو سلام کیا۔ آفتاب اور سائرہ نے بھی داماد کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔

خرم کی نگاہ یومنہ پہ پڑی تو اسے جاننے میں دیر نہ لگی کہ اس کے آنے سے قبل وہ روتی رہی ہے۔

(اگر یہی آنسو تم ہمارے دامن میں ڈال دو تو تمہارا شکوہ اور ہماری پیاس دونوں ہی زائل ہو جائیں۔) خرم کے چہرے پر تھکن نمایاں تھی۔

آفتاب نے بغور خرم کی طرف دیکھا۔

''اس وقت تم گاؤں سے آ رہے ہو یا کہیں اور سے؟'' آفتاب کا انداز سادہ اور اپنائیت لیے ہوئے تھا۔ خرم کی کیفیت نے انہیں ڈبل مائنڈڈ کر دیا تھا۔

''جی...... ہم گاؤں سے ہی آ رہے ہیں۔ دراصل رات کو اماں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، اس لیے ہمیں وہیں رکنا پڑا۔''

(کتنا طرار ہے یہ شخص! کتنا معصوم بن گیا جیسے اس سے بڑھ کر کوئی مظلوم ہے ہی نہیں۔)

یومنہ دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔

''کیا ہوا سلیمہ کو؟'' آفتاب اور سائرہ بیک وقت پُرتشویش انداز میں گویا ہوئے تو خرم کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کوئی ایک مرض ہو تو بتایا بھی جائے۔ اماں کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے

ان کی حالت بہت خراب ہو جاتی ہے۔"

"تو بیٹا! تم ایسا کیوں نہیں کر لیتے کہ انہیں شہر لے آؤ۔ یہاں اچھا علاج ہو جائے گا اور پھر اب تو تمہاری رہائش بھی ہو گئی ہے۔ کیا تمہیں دو جگہ رہائش میں مسئلہ؟ نہیں ہو رہا ہے؟"

آفتاب نے بہت نرم انداز میں پوچھا۔ خرم نے یومنہ کی طرف دیکھا۔

"شاید آپ کی بیٹی نہیں چاہتی کہ وہ یہاں آئیں۔" خرم کے لہجے میں شکایت تھی، دونوں شپٹا گئے جبکہ یومنہ کو زبردست کرنٹ لگا۔

"مجھے کیا پڑی ہے جو میں کسی کو یہاں آنے سے روکوں گی۔ ان کا گھر ہے، بھلے سے آئیں، رہیں کچھ بھی کریں۔" پھر وہ طنزیہ ہنس پڑی۔ "مگر اس بھوت بنگلے میں آئے گا کون؟ جو بظاہر تو محل ہے لیکن پینے کے پانی تک کی بھی یہاں سہولت میسر نہیں۔"

خرم کے وجود میں آگ لگ گئی لیکن اسے برداشت کرنا پڑا۔

"جہاں تک ہمارے اختیار میں تھا، ہم نے کر دیا۔ اب ہم خود کو بیچ کر تمہاری خواہشات پوری نہیں کر سکتے۔" اس کا انداز قطعی تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا! رفتہ رفتہ سب کچھ ہو جائے گا۔" سائرہ رسان سے بولیں پھر یومنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"گھر تنکا تنکا کر کے برسوں میں بنتے اور بستے ہیں۔ تمہارے دل جڑے ہوں گے تو گھر بنتے دیر نہیں لگے گی۔ تم ایسا کرنا، کل خرم کے ساتھ جا کر اس کی اماں کی عیادت کر آنا۔ آتی جاتی رہو گی تو تمہیں زیادہ اکیلے پن کا احساس نہیں ہوگا۔"

(میں کیوں جاؤں گی۔ جب مجھے اس شخص سے ہی دلچسپی نہیں تو اس کے گھر والوں سے کیونکر ہوگی۔)

"کیا سوچنے لگی ہو؟" سائرہ نے بیٹی کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں امی! آپ بتائیے، کیا خاطر مدارات کروں۔ اتنی دیر سے آئے ہوئے ہیں آپ لوگ اور میرا دھیان بس باتوں میں ہی الجھا رہا۔" یومنہ حقیقتاً شرمندہ ہو رہی تھی۔

"نہیں بیٹا! کسی بھی تکلف کی ضرورت نہیں۔ ہم چلتے ہیں پھر آئیں گے خرم ساری رات کا جاگا ہوا ہے، اسے آرام کی ضرورت ہوگی۔"

"نہیں ماموں جان! ہم اب ایسے بھی بداخلاق نہیں کہ گھر آئے بزرگوں کی خدمت نہ کر سکیں۔ آپ ہمارے گھر آئے ہیں تو ہمیں خدمت کا شرف بخشیے۔ ہم بہت اچھے مہمان نواز ہیں۔" لہجے میں پس پردہ یومنہ کے لیے واضح طنز تھا، جسے صرف یومنہ ہی سمجھ سکی۔

"ارے نہیں بیٹا! کیسی بات کر رہے ہو، ہمارا اپنا ہی گھر ہے۔ تم سے مل لیا، اتنا ہی کافی ہے۔ یہاں آ کر تم سے مل کر واقعی ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ یومنہ کے ساتھ ہماری طرف بھی آتے جاتے رہا کرو۔ ورنہ تم لوگ تو بالکل ہی سب سے کٹ کر رہ گئے ہو۔ اکیلے رہ رہے ہو نا، اس لیے بھی جھگڑے ہوتے ہوں گے۔ دونوں کو ہمہ وقت ایک دوسرے سے شکایات ہی رہتی ہوں گی۔" ہمدانی صاحب نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے خرم کا کاندھا تھپتھپایا تو وہ سرد لہجے میں بولا۔

"ہم نے اس پہ کسی سے ملنے پہ پابندی نہیں لگائی یہ اس کی مرضی پر ہے۔ جب یہ ہمسائے میں تعلق بنا سکتی ہے تو پھر اپنوں سے کیوں کٹی رہتی ہے۔" اس کے اس جملے نے یومنہ کو سر سے پاؤں تک سن کر دیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ ہمسائیوں سے بھی تعلق ہونا چاہیے لیکن انسان اپنوں سے تو کٹ ہی نہیں سکتا۔" سائرہ نے بیٹی کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں نا بیٹا!"

"جی امی!" یومنہ تھوڑا سا مسکرائی۔ یہ جبری مسکراہٹ خرم نے صاف محسوس کر لی تھی۔

"اچھا بیٹا! ہم چلتے ہیں۔" سائرہ اور آفتاب بیٹی اور داماد سے مل کر گھر سے باہر نکل گئے۔

خرم اپنے کمرے میں چلا گیا اور یومنہ بہت دیر تک لان میں ہی بیٹھی رہی۔ "بظاہر کتنا لاپروا لگتا ہے لیکن کن سوئیاں لینے کی کتنی عادت ہے۔" وہ بیٹھی کلس رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھی رہی پھر کچن میں چلی گئی اور دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے لگی۔

حیرت کی بات تھی کہ آج خرم گھر میں تھا اور پنجابی گانے نہیں چل رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے نماز ظہر ادا کی۔ اس کا خیال تھا، اب تک اسے بھوک لگ چکی ہوگی لیکن اس نے کھانا نہیں مانگا تو از راہ تجسس یومنہ کو اس کے کمرے میں جھانکنا پڑا۔ وہ واقعی بے سدھ سو رہا تھا۔ اسے سوتا دیکھ کر وہ باہر نکل آئی اور کچن میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔ اس کے ذہن میں خرم کی بات گونج رہی تھی۔

"اگر میں چوری چھپے مل لی تو اس میں برا ہی کیا ہے۔ اچھی فیملی ہے، اچھے لوگ ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خرم کو بتایا کس نے؟"

اسی ادھیڑ بن میں شام ہو گئی۔ تب اسے خود اندر آنا پڑا۔ وہ جاگ چکا تھا مگر بستر پہ ایسے ہی لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ہونٹ پیاس کی شدت سے خشک۔ یومنہ اس کے قریب چلی آئی۔ کچھ متجسس کچھ متفکر پھر اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا تو وہ واقعی آگ کی طرح دہک رہا تھا۔

''لگتا ہے تمہیں بخار ہو رہا ہے۔''

خرم نے کوئی جواب نہیں دیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے گداز ہاتھ کا لمس اس کی روح تک سیراب کر رہا تھا۔

''رات گاؤں میں ہی تھے یا کہیں اور تھے جو یہ حالت ہو رہی ہے۔'' اچانک خرم کی روح لہولہان ہو گئی اور اس نے سختی سے اس کا ہاتھ پیشانی سے ہٹا دیا۔

''جھوٹ بولنے کی عادت گاؤں والوں میں نہیں ہوتی۔ یہ تو شہر والوں کی عادت ہے۔'' اس کے طنز پہ یومنہ تپ گئی۔

''بیمار پڑے ہو پھر بھی لہجہ سے پتھر برس رہے ہیں۔''

''قبر میں پاؤں نہیں لٹک رہے ہیں ہمارے، نہ کوئی ایسا مرض ہو گیا جو تمہارے محتاج ہو گئے ہیں۔ معمولی بخار ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کیا لینے آئی ہو ہم سے؟'' وہ غرا کر بولا۔

یومنہ چیخ گئی۔

''تم جیسے سے کیا لینا ہے میں نے اور تم دے بھی کیا سکتے ہو، سوائے اذیت اور محرومی کے۔ تمہارے جیسا شخص تو اپنا بخار بھی کسی کو نہ دے۔ غلطی ہو گئی جو تم سے ہمدردی کرنے آ گئی تھی۔''

''ہمدردی کی ہمیں ضرورت نہیں، تمہیں ہے۔''

''ہمارے آنے سے قبل اپنے ماں باپ سے کیا رونا رو رہی تھیں؟''

یومنہ نے اس پر تیز سی نگاہ ڈالی۔ پھر تاسف سے بولی۔

''بالفرض میں نے تمہارے مظالم کی داستان اپنے ماں باپ کو سنائی بھی تو انہوں نے کون سا تمہیں پھانسی کا حکم سنا دیا یا تمہیں شہر بدر کرنے کا حکم دے گئے؟''

''یہ بات تمہیں سمجھنی چاہیے کہ تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ جب ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو پھر کیوں تم ہمیں اکڑ دکھاتی ہو۔'' اس کے لہجے میں عجیب سا گھمنڈ تھا۔ یومنہ نے طنزیہ اسے دیکھا اور کہنے لگی۔

''خرم بن ریاض! اگر تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری ہر جائز و ناجائز بات برداشت کر کے تمہارے ساتھ گزارا کروں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔''

''تو پھر چلی جاؤ یہاں سے، کیوں رہ رہی ہو یہاں؟''

(کب کا جا چکی ہوتی، اگر والدین کو مجھ سے ہمدردی ہوتی تب لیکن ان کے سر پہ تو ایک بوجھ تھا، تب ہی تو انہوں نے مجھے یہاں دھکیلا، ورنہ کیا میرے لیے رشتوں کی کمی تھی۔)

وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئی، پھر اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ''چلی جاؤں گی خرم

بن ریاض! اگر تم مجھے یہاں سے نکال دو گے تو چلی جاؤں گی مگر اپنے والدین کے گھر نہیں، کسی تیسری جگہ۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے، کوئی ٹھکانہ مل ہی جائے گا۔'' اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ کمرے سے نکل گئی۔ خرم نے جاتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ ماضی کے کچھ مناظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔

☆☆☆

کچے پکے صحن میں نیم کا درخت نیچے، بان کی چارپائی پہ بیٹھا وہ کھانا کھا رہا تھا۔

کرم کے بچے ننگ دھڑنگ صحن میں کھیلتے پھر رہے تھے۔ کسی کے تن پہ صرف کُرتا تھا اور کسی کے نیکر۔ ہاتھوں اور پیروں پہ مٹی۔ جوتیوں سے بے نیاز۔ خرم نے کبھی ان بچوں کو پورے کپڑوں اور درست حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔ ہمہ وقت کود پھاند اور الٹی سیدھی حرکتیں ان بچوں کا محبوب مشغلہ تھیں۔ ''نجانے کیسی ماں ہے۔'' خرم کے نظریات بھاوج کے بارے میں کچھ بھلی نہیں تھی۔ ان ہی حرکتوں کی وجہ سے وہ بچوں سے بھی چڑنے لگا تھا۔

ہر وقت ہڑبونگ اور طوفان بدتمیزی مچائے رکھنے والے ان نے اب پھر اپنی تفریح کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ معظم نے آ کر جیسے ہی مرغیوں کا ڈربہ کھولا، مرغیاں آزادی کا پروانہ ملتے ہی ادھر اُدھر پھرنے لگیں۔ خرم کھانے میں پر اور دھول مٹی گرنے لگی۔ خرم کا پارہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ عدیل جو قریب ہی گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا نشانہ سالن کی پلیٹ میں لگایا۔ سالن کے چھینٹے خرم کے کپڑوں کو بیل بوٹوں سے سجا گئے۔ خرم نے عالم طیش میں بچوں کی طرف دیکھا پھر اپنے کپڑوں کی طرف پھر دوسرے ہی لمحے سالن کی پلیٹ زمین پر دے ماری۔ بچے ہنستے ہوئے کمرے میں بھاگ گئے۔ سلیمہ ہانپتی کانپتی، دوڑتی ہوئی بیٹے کی طرف آئیں۔

''ناس جائے تمہارا۔ ذرا دیر سکون کا نہیں لیتے۔ ابھی دودھ کا برتن ناپاک کیا ہے۔ اسے پاک کرنے ہی بیٹھی تھی کہ یہ گل کھلا دیا۔'' سلیمہ پوتوں کو لعن طعن کرنے لگیں۔

''ماں کا تو آرام ختم نہیں ہوتا۔ نکمی اولاد ہمارے ذمے ڈال رکھی ہے۔ جب دیکھو اس گھر میں وحیہ گا مشتی ہے۔ نجانے انسان کی اولاد ہیں یا.....'' خرم بھڑاس نکالنے لگا۔

''زبان سنبھال کر بات کر۔'' صالحہ بجلی کی سی تیزی سے کمرے سے نکلی۔

''سنبھال کر رکھو بھابھی! اپنی زبان اور اپنے بچے۔''

خرم کے تیور صالحہ سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔ سلیمہ گھبرا گئیں۔ دیور، بھابھی کا یہ معرکہ نیا نہیں تھا لیکن آج دونوں کے ہی انداز سخت جارحانہ تھے۔

سلیمہ نے بیٹے کو چپ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی پہ بہو کی طرف مڑیں۔

"تُو چپ کر جا، مرد ذات سے لڑتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔"

"اور مرد ذات کو عورت سے لڑتے ہوئے شرم نہیں آتی۔"

"لڑنے تو آئی ہے اس سے، وہ نہیں۔"

"اپنے بھتیجوں کو میں برا بھلا کہہ رہا تھا تو تم سامنے کیوں آئیں؟"

"بھتیجے کو کچھ کہتا ہے تو اپنی ذات کو گالی دے ماں کو گالی کیوں دیتا ہے۔"

"دوں گا، سو دفعہ دوں گا۔ اپنے باپ کے گھر سے نہیں لے کر آئی تھی انہیں۔"

"یہ کیوں آنے لگے میرے باپ کے گھر سے تو کہتا ہے تو ہی آیا ہوگا کہیں سے۔

"اماں! اس سے کہہ دے کہ اپنی زبان سنبھال لے، ورنہ....."

"ورنہ..... کیا کرے گا؟" صالحہ نڈر ہو کر بولی۔

"چھ بیٹوں کا گھمنڈ ہے اسے، کیوں اس کمینی کے منہ لگتا ہے۔"

"ان کو سلیقے سے پال لے، تمیز تو سکھلا لے۔" خرم عالم طیش میں بولے جا رہا تھا۔ جبکہ سلیمہ اسے گھسیٹتے ہوئے کمرے کی طرف لے جا رہی تھی۔

"کم بختو تم ہی فساد کی جڑ! تمہاری وجہ سے مجھے اتنی سننا پڑتی ہے۔"

معصوم بچوں کو اس بے دردی سے پٹتا دیکھ کر خرم کا دل بے اختیار ہو گیا لیکن مزید کچھ کہے بنا وہ گھر سے باہر نکل گیا تاکہ اس کا مزید دل نہ جلے۔

رات کو جب وہ گھر آیا تو گھر میں سناٹا تھا جیسے بہت بڑا طوفان آ کر گزر گیا ہو یا طوفان آنے والا ہو۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سلیمہ کھانا لے آئیں۔

"تیرے بھائی نے بہت مارا ہے اسے۔ تیرے ساتھ بدزبانی کرنے پہ۔" سلیمہ نے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔ خرم نے تاسف سے ماں کی طرف دیکھا۔

"مارا تو جانور کو بھی جاتا ہے۔ پر وہ سدھرتو نہیں جاتا۔"

"کیا کریں بیٹا! سر منڈھ گئی۔ پندرہ سال ہو گئے ہیں اس عذاب کو جھیلتے جھیلتے۔"

"کیوں لے کر آئی تھی ایسی عورت کہ جسے عذاب بن کر جھیلنا پڑ رہا ہے؟"

"ہک..... ہا..... وٹے سٹے کی شادی میں خاک پھانکنی پڑتی ہے۔"

"جس کے لیے وٹہ سٹہ کیا تھا، وہ کون سا سکھ میں رہ رہی ہے تُو کب تک عذرا سے زیادتی کا بدلہ صالحہ سے لے گا؟"

"عذرا کے نصیب میں سکھ نہیں تھا۔ صالحہ کو دکھ دے کر تو کون سا عذرا کو سکھی کر سکتا ہے۔ جب تیرے بھائی نے صبر کر لیا تو تُو بھی صبر کر لے۔"

"پندرہ سال سے ایک عورت کو درست نہیں کر سکا، جب بھابھی کو پتا تھا، اس کا بھائی ٹی بی کا مریض ہے اور نکھٹو ہے تو پھر کیوں اس نے جانتے بوجھتے ہوئے عذرا کو پھنسوایا؟"

"ٹی بی لا علاج مرض تو نہیں بیٹا!"

"مگر نا کمانے کی عادت تو لا علاج ہے۔ خود بھی ٹی بی لگ گئی ہے اسے، اور یہ کیسے کھا کھا کر صحت بنا رہی ہے۔ ریوڑ اکٹھا کر لیا، وہ علیحدہ۔ نہ بچوں کو سلیقہ سکھایا، نہ تمیز۔"

"تیرے جی جلانے سے کوئی حل نہیں نکلے گا۔ ان ہی باتوں کو دیکھتے ہوئے تیرے باپ نے تیرا مطالبہ مان لیا ہے۔ کیا اتنا ہی کافی نہیں۔"

خرم چپ چاپ کھانا اپنی طرف کھسکا کر بیٹھ گیا۔

'آفتاب کی طرف آج بھی گئی تھی میں۔"

"پھر؟" خرم نے ماں کی طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھا۔

"گھر کا مطالبہ کیا ہے انہوں نے۔"

"کیا مطلب۔" خرم کے منہ کا نوالہ ہاتھ میں ہی رہ گیا۔

"آفتاب بھائی کا کہنا ہے۔ اگر ہم لوگ رہائش شہر میں کر لیں تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔"

"کیوں، کیا ان کی بیٹی گاؤں میں نہیں رہ سکتی؟"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا پڑھی لکھی لڑکیوں کے نخرے بہت ہوتے ہیں لیکن تُو کہتا تھا کہ پڑھی لکھی عورتوں سے نسل سنورتی ہے جو عورت آنے سے پہلے ہی درخت سے شاخ کاٹ لے، وہ نسل کو کیا سبق دے گی؟"

"مگر اماں! ہم نے تو سن رکھا تھا۔ آفتاب ماموں کی چار بیٹیاں اور بھی ہیں جو اپنے گھروں میں بہت اچھی طرح رہ رہی ہیں۔ بہت سلجھا ہوا ماحول ہے آفتاب ماموں کا۔"

"بس یہی بات دیکھتے ہوئے میرا بھی دل آ گیا۔"

"مگر ان کا مطالبہ معمولی نہیں ہے۔" باپ کی آواز پہ خرم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سلیمہ بھی شوہر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ساتھ کمرہ بھی تھا۔

"ہم نے آج تک تیری کوئی ضد نہیں ٹالی۔ سو یہ بھی پوری کر دیں گے لیکن خیال رکھنا کہ وہ زیادہ سر پہ نہ چڑھ جائے۔ عورت کی صلاحیتوں کا زیادہ اعتراف نہیں کرنا چاہیے۔ نہیں تو وہ خود کو کچھ سمجھنے لگتی ہے۔ عذرا کی وجہ سے آج ہم ایک طرف سے بہت پس رہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی حاوی ہوتی چلی جائے۔"

"جس خوبی کے لئے تو اس خاندان میں شادی کر رہا ہے، اس خوبی کو زیادہ سراہنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ لڑکیاں کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ کہیں اپنی عقل کے آگے تجھے وہ کوڑی کا سمجھے اور گھر چلانے میں اپنی منطق استعمال کرے۔ ہم ذات سے سردار ہیں، ہر جگہ سردار کی ہے۔ سمجھا تو نے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم اسے گاؤں ہی لے آئیں گے۔ وہ آپ لوگوں کی خدمت کرے گی، یہیں رہے گی۔"

"نہیں پتر! اس کی خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تیرا گھر آباد رہے، ہم تو یہ چاہتے ہیں۔" سلیمہ نے بیٹے پہ بات واضح کی تو خرم خاموش ہو گیا۔ جانتا تھا ماں اوپری دل سے کہہ رہی ہے۔ اگر وہ اپنی بیوی کو یہاں نہیں لایا تو گھر والے طعنے دے کر اس کی زندگی تنگ کر دیں گے اور بھابھی کو جو حوصلہ ملے گا وہ علیحدہ۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا جو وہ چاہتا تھا۔

یومنہ عورت تھی یا ریت۔ جتنا مٹھی بند کرتا تھا، اتنا ہی ہاتھوں سے پھسلتی جاتی تھی۔

☆☆☆

خرم نے آنکھیں کھولیں تو کمرے میں اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ نجانے کیا وقت ہو رہا تھا، اس کا سر چکرا رہا تھا اور پیاس کی شدت محسوس ہو رہی تھی۔ جسم سردی کی وجہ سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ طوعاً و کرہاً وہ اٹھا اور خود کو گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ ڈرائنگ روم کی لائٹ جل رہی تھی، جہاں یومنہ نماز ادا کر رہی تھی۔ وہ چار قدم چلنے میں ہی اس کی سانس پھول گئی اور بالآخر اس نے خود کو صوفے پہ ڈال دیا۔ یومنہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔

جیسے ہی خرم پہ نگاہ پڑی، وہ جانماز سے فوراً اٹھی اور خرم کی طرف لپکی۔ وہ شاید ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگ رہا تھا۔ یومنہ نے پھرتی سے پانی نکالا اور گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ دو گھونٹ پینے کے بعد خرم کا سر ڈھلک گیا۔

"مائی گاڈ! تمہیں تو شدید بخار ہے۔" یومنہ نے اس کی بھاری بھرکم کلائی کو ہاتھ لگایا تو احساس ہوا۔

"میرے اللہ۔ میں کیا کروں؟" وہ بوکھلا گئی۔

"خرم..... خرم.....!" اس نے خرم کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر دو تین بار ہلایا لیکن اس کی آنکھیں موندی جا رہی تھیں۔

"میرے اللہ کہاں جاؤں، قریب میں کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔" اس کے ذہن میں برق رفتاری سے ایک ترکیب آئی۔ اس نے چادر اوڑھی اور پھر ارم کے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ اتفاق سے

سب وہاں پہ موجود تھے۔ اس کو ہراساں دیکھ کر سب ہی متوجہ ہو گئے۔

"آنٹی میرے ہسبینڈ کی طبیعت بہت خراب ہے۔ پلیز انہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔"

ارم کی امی، ابو، ارم، زوہیب سب ہی اس کے ساتھ ہو لیے۔

"زوہیب! تم گاڑی نکالو۔" ارم کے ابو نے زوہیب سے کہا۔

دوسرے ہی پل زوہیب گاڑی لے آیا جیسے تیسے خرم کو نیم بے ہوشی کی حالت میں گاڑی میں ڈالا اور کلینک لے گئے۔

"آپا! آپ ان کے پاس یہیں رہیے، ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔" قدسیہ اور ارم، یومنہ کو لے کر اندر آ گئیں جو ساتھ جانے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ اندر آنے کے بعد یومنہ رو پڑی۔

"بیٹا! حوصلہ کرو۔ یہیں پاس ہی ہاسپٹل ہے۔ اللہ بہتری کرے گا۔"

"ویسے ہوا کیا تھا انہیں۔" ارم نے پوچھا۔

"صبح سے بخار ہو رہا تھا۔ اب زیادہ حالت خراب ہو گئی۔ میں تو نماز پڑھ رہی تھی کہ اچانک....." یومنہ پھر رونے لگی۔

"یومنہ! بیٹا روتے نہیں ہیں۔ ابھی آ جائے گا وہ گھر۔ ویسے اتنی حالت خراب تھی تو اتنی غفلت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی سے معاملہ بگڑ جاتا ہے۔"

ارم اور اس کی والدہ یومنہ کے پاس ہی رہیں، جب تک وہ لوگ آ نہیں گئے۔ ایک گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی تو یومنہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔

ارم کے ابو اور زوہیب نے خرم کو لا کر اندر لٹایا اور دوائیں یومنہ کو دیں۔ جاتے ہوئے زوہیب اس سے کہنے لگا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ ٹمپریچر زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی حالت بگڑ گئی تھی۔ ویسے تھکن اور بے آرامی بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ایسا لگتا ہے انہیں ذہنی دباؤ ہے۔ کیا ان کا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے؟"

"مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم۔"

"خیر اس وقت بہت زیادہ تھا، ہائی بلڈ پریشر والوں کو بہت احتیاط رکھنی چاہیے۔ پریشان نہ ہوں لیکن انہیں اکیلا مت چھوڑیے گا۔ ویسے آپ کے ہسبینڈ خاصے ضدی ہیں۔ کیا انہوں نے آپ کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی ہے؟"

"ارے نہیں، انہیں تو اپنا ہوش نہیں تھا۔"

"خیر چھوڑیے، پھر بتائیں گا۔ اچھا خدا حافظ۔" وہ ان سب کو چھوڑنے گیٹ تک آئی تھی۔

واپس کمرے میں آئی تو خرم بے سدھ سو رہا تھا۔ اس نے پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر دیکھا پیشانی اب بھی گرم تھی اور سانسیں تیز چل رہی تھیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا انہیں کوئی ذہنی دباؤ ہے۔ زوہیب کی آواز اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھی۔

''دوسروں کو ذہنی دباؤ میں رکھنے والا، خود ذہنی دباؤ کا شکار ہوگیا۔'' اس کے چہرے پہ سی مسکراہٹ آکر معدوم ہوگئی۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے خرم بن ریاض! یومنہ ہمدانی تم سے زیادہ مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔'' وہ وہیں صوفے پہ بیٹھ گئی۔ نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

وہ سو کر اٹھی تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلی لان میں آئی تو وہ وہاں سیڑھیوں پہ بیٹھا تھا۔

''تم جانتے ہو، رات تمہاری کتنی طبیعت خراب تھی۔ ہمسائیوں کو بلا کر ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا تھا تمہیں اور اب تم یہاں سیڑھیوں میں بیٹھے کیا نظارہ کر رہے ہو۔ جب تمہارا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے تو تم کوئی ٹیبلٹ کیوں نہیں لیتے۔ اگر حالت اور بھی سیریس ہو جاتی تو.....'' وہ یکدم کتنی حساس ہوگئی تھی اس کے معاملے میں، یہ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

خرم نے چپ چاپ اسے دیکھا اور اس چہرہ پہ کچھ کھوجنے کی کوشش کی لیکن یومنہ کے چہرے پہ کوئی ایسا تاثر نہیں تھا۔ بس وہ اس کی طبیعت کے بارے میں متفکر تھی۔ خرم اس کے رویے پر جھنجلا سا گیا۔

''پیسے کہاں سے آئے رات تمہارے پاس؟''

''میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ سب انہوں نے ہی خرچ کیے ہیں۔'' پھر آہستگی سے بولی۔

''ان کے پیسے بھی دے آنا اور ان کا شکریہ بھی ادا کر آنا۔'' خرم جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ باپ کی آواز کہیں آس پاس گونج رہی تھی۔

(عورت کی صلاحیتوں کا زیادہ اعتراف نہیں کرنا چاہیے، نہیں تو وہ خود کو کچھ سمجھنے لگتی ہے۔)

''ہمارا کوئی ملازم بھی یہاں ہوتا نا، وہ بھی اتنی ہی دیکھ بھال کر لیتا، جتنی دیکھ بھال تم نے کی۔ ہم پہ کوئی احسان نہیں کیا۔''

''مائی گاڈ۔'' یومنہ چکرا گئی۔

''یہ پکڑو پیسے، انہیں پہنچا دینا۔ یہ تعلق واریاں تمہارے کام آنی چاہئیں۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔'' یومنہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

خرم گاؤں چلا گیا۔ سارا دن وہ بولائی بولائی پھرتی رہی۔ شادی کے بعد کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں آیا تھا جو ہنسی خوشی تمام ہوا ہو یا کسی دن کا اچھا آغاز ہوا ہو۔ وہ لان میں پودوں کو پانی دے رہی تھی کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔

دروازہ کھولا تو ارم اور زوہیب اندر آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں گلاب کے ڈھیر سارے پھول تھے۔

''السلام علیکم۔'' دونوں نے یکے بعد دیگرے سلام کیا۔ یومنہ انہیں دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''آیئے، اندر آجایئے۔''

''ہم آپ کے شوہر کی عیادت کے لئے آئے ہیں۔'' ارم نے کہا تو یومنہ کے چہرے پہ تلخ سی مسکراہٹ آکر معدوم ہوگئی۔

(مریض گھر پہ موجود نہیں اور عیادت کرنے والے آرہے ہیں۔) یومنہ نے انہیں وہیں کرسیوں پہ بٹھالیا۔

''امی ابو بھی آتے لیکن کچھ پرابلم ہوگئی تھی، اس لیے وہ شام کو آئیں گے۔ کیسے ہیں اب خرم بھائی؟''

''ٹھیک ہیں۔'' یومنہ نے سادگی سے کہا۔

''کیا آرام کر رہے ہیں؟'' زوہیب نے پوچھا۔

''جی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ناشتے کے بعد دوا لی تھی۔ شاید آنکھ لگ گئی ہو۔''

''اچھی بات ہے، انہیں آرام کرنے دیجئے۔ آرام ہی سب سے بہتر ہے ان کے لئے۔'' پھر زوہیب اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''آپ اپنا بھی خیال رکھا کریں۔ لگتا ہے آپ کو اپنی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' یومنہ ہنس پڑی۔

''نجانے آپ کو ایسی باتوں کا کیسے پتہ لگ جاتا ہے، آپ انسان کو بہت گہرائی تک کیسے کھوج لیتے ہیں۔ رات آپ نے خرم کو ضدی بتایا تو میں واقعی حیران ہوگئی۔'' یومنہ کی بات پہ ارم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اطلاعاً عرض ہے، ماموں بہت اچھے پامسٹ ہیں۔''

''اچھا.....'' یومنہ نے زوہیب کی طرف دیکھا۔

''آپ نے بتایا نہیں اپنی اس خوبی کا۔''

''آپ نے ہم میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔'' زوہیب فوراً بولا تو یومنہ واقعی شرمندہ ہوگئی۔

''ہم لوگ خود آتے آپ کی طرف۔ شکریہ بھی ادا کرنا تھا اور ڈاکٹر کا بھی حساب کرنا تھا۔''

یومنہ کی بات پہ دونوں کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے لیکن اس کا اظہار ارم نے پہلے کیا۔

''میں امی ابو سے کہوں گی جسے آپ بیٹی کہتے ہیں، وہ آپ کو ابھی تک غیر ہی سمجھتی ہے۔''

''ارے نہیں۔'' یومنہ کچھ شرمندہ سی ہو کر بولی۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا، کیسے بات بنائے۔

زوہیب دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کتنی معصوم اور سادہ تھی وہ۔ اسے شرمندہ دیکھ کر ارم خود ہی ہنس پڑی۔

تھوڑی دیر بعد ارم اور زوہیب دونوں ہی اٹھ کھڑے ہوئے ان کے جانے کے بعد یومنہ اندر آ گئی۔

ایک خالی پن اور اجاڑ دن اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ یومنہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ کیوں وہ اس شخص کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ نہیں آتا تو نہ آئے۔ آنے کے بعد اسے دیتا بھی کیا ہے، سوائے دکھ اور اذیت کے۔

اس نے خود کو مصروف کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے گھر کا جائزہ لیا۔ گھر واقعی بہت گندہ ہو رہا تھا جسے اچھی خاصی صفائی کی ضرورت تھی۔

کچن سجانے اور سنوارنے میں تو جب مزہ آتا ہے جب مرد گھر میں کھانا کھائیں، اسے تو یہاں کھانا پسند ہی نہیں۔ کیا یہ سب کچھ وہ صرف اپنے لیے کرے مگر کیوں؟ زندگی یوں بھی تو گزر رہی ہے اور گزر ہی جائے گی۔ وہ سب کچھ بے دلی سے چھوڑ کر اندر آ گئی، جہاں بیڈ روم کی حالت اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

☆☆☆

شام کو نہا کر اس نے کپڑے بدلے اور ارم کی طرف چلی گئی۔

''ہم تمہاری طرف آنے ہی والے تھے کہ تم آ گئیں۔'' ارم کی امی نے کہا تو یومنہ شرمندہ ہو گئی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ انہیں آنا ہے۔

''دراصل میں اکیلے بور ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا نجانے آپ لوگ آئیں یا نہ آئیں، میں ادھر چلی آئی۔''

''کیا خرم گھر پر نہیں ہے؟'' انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

''نہیں، وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کہیں گئے ہیں۔'' یومنہ کھسیا کر بولی۔

''اب طبیعت کیسی ہے اس کی؟'' زوہیب بیڈمنٹن لیکر ان ہی کے پاس آ گیا۔

''قدرے بہتر تھی۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''اور آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' زوہیب بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں تو ہمیشہ ہی ٹھیک رہتی ہوں۔'' کندھے اچکا کر کہا۔

''شاید یہ آپ کی خوش فہمی ہو۔'' یومنہ نے چونک کر زوہیب کی طرف دیکھا پھر فوراً ہی نظریں دوسری طرف کر لیں۔

''ارم کہاں ہیں آنٹی؟''

''وہ شاید نہا رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔ تم زوہیب سے باتیں کرو، میں کولڈ ڈرنک لے کر آتی ہوں۔''

''ارے نہیں آنٹی! میرا تو بس چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔ ارم آ جائے گی تو ہم اکٹھا پی لیں گے۔'' وہ زوہیب کے ساتھ تنہا نہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔

جانے اس کی باتیں کیسی ہوتی تھیں۔ وہ ریشم کی طرح کھلنے لگتی۔ کئی بار اس نے خود کو اس کے سامنے سنبھالا۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی نظر انداز نہیں کر پاتی تھی۔

''زوہیب صاحب! آپ صرف دست شناس ہیں، چہرے پڑھنے کی کوشش نہ کریں۔''

زوہیب کو اپنی طرف توجہ سے تکتا پا کر یومنہ پہلے تو پزل ہوئی پھر پراعتماد انداز میں کہہ ہی دیا۔ زوہیب ہنس پڑا۔

''دست شناسی کی طرح چہرہ شناسی بھی ایک علم ہے۔ آپ کا چہرہ بتاتا ہے کہ آپ شادی کے بعد خوش نہیں ہیں۔'' یومنہ یکدم خاموش ہو گئی۔

''آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔'' وہ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔ کہا تو صرف اتنا۔

''زوہیب صاحب! آپ مجھ میں اتنا انٹرسٹ کیوں لیتے ہیں؟''

''بعض چہرے اتنے پرکشش ہوتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی تو متوجہ کر لیتے ہیں۔''

یومنہ نے چونک کر زوہیب کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یومنہ تحیر سے اسے دیکھنے لگی اور وہ کہہ رہا تھا۔

''روحوں کے متعلق آپ جانتی ہیں۔ دنیا قائم ہونے سے پہلے یہ کہاں ہوتی تھیں؟'' پھر کہنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے روحیں بنا دی تھیں، جسم بعد میں بنائے۔ ان روحوں کا ایک دوسرے سے تعلق تھا۔ اچانک کسی اجنبی کو دیکھ کر ہمیں ایسے لگتا ہے جیسے ہمارا اس سے برسوں کا رشتہ ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے یومنہ جی! کہ ہماری روحیں بھی آپس میں ملتی ہیں۔ شاید ان کا گہرا تعلق تھا۔ ایک بار نہیں، مجھے کئی بار ایسا لگا ہے۔''

یومنہ ہنس پڑی۔ ''لیکن مجھے تو کبھی ایسا نہیں لگا۔''

''آہ..... ہا..... بڑی فلسفیانہ گفتگو ہو رہی ہے۔'' ارم بال سکھاتے ہوئے ان کی طرف آئی۔ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ارم یومنہ سے ہاتھ ملا کر کرسی کھینچ کر سامنے ہی بیٹھ گئی۔

''امی بتا رہی تھیں کہ آپ آئی ہیں۔ میں باتھ روم سے نکلتے ہی سیدھی ادھر ہی آ گئی۔''

''آنٹی کا پتا ہی نہیں لگا کب گئیں۔''

''نماز ادا کر رہی ہیں۔'' ارم تولیہ سے بال جھٹکتے ہوئے بولی۔

''ماموں سے باتیں کرتے ہوئے سب ہی مدہوش ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ بھی ہو گئیں کوئی تعجب نہیں۔'' یومنہ کو ہنسی آ گئی۔

''تم ماموں، بھانجی کو اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ ہی خوش فہمیاں ہیں۔ ہو سکتا ہے انسان اپنے ہی کسی خیال میں ہو۔''

''جو لوگ محفل میں بیٹھے ہوئے بھی اپنے خیالات میں گم رہتے ہیں، دراصل وہ.....''

''اپنی زندگی سے مایوس ہوتے ہیں۔ ہیں نا۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا!''

''جی نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا۔ دراصل وہ لوگ شاعر ہوتے ہیں، ادیب ہوتے ہیں نقاد ہوتے ہیں، فلسفی ہوتے ہیں، محقق ہوتے ہیں اور شاید سائنس دان بھی۔'' یومنہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ دلچسپی سے یومنہ کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ بہت.....''

''چالاک انسان ہیں۔'' زوہیب نے اس کی بات اچک کر تیزی سے جملہ مکمل کر دیا۔ یومنہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''جی نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتی تھی، آپ بہت ہی دلچسپ انسان ہیں۔''

اب کی بار زوہیب اور ارم کھلکھلا کر ہنسے تھے۔

☆☆☆

آج یومنہ گھر آ کر دیر تک زوہیب کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ ''عجیب سا شخص ہے۔ دلچسپ بھی ہے، پراسرار بھی۔ اس کی باتوں میں عجیب سی کشش ہے۔ اس کے پاس بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کبھی کبھی ہم جس کے پاس ہوتے ہیں، اس کے قریب نہیں ہو پاتے اور جس کے قریب ہوتے ہیں، ان کے پاس نہیں ہوتے۔ وہ سوچتی رہی تھی، ان ہی تانوں بانوں میں رات بھی گزر گئی۔

آج ساری رات خرم گھر نہیں آیا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ اس نے خرم کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ نجانے کیوں اس کے اندر ایک اطمینان سا تھا۔ صبح وہ چائے بناتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ

اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ اس کا دھیان خرم کی طرف گیا تو اپنی ذات ایک دم ہی اجنبی سی ہو گئی۔ زندگی پھر اسی دائرے میں آ گئی جو قدرت نے اس کے لیے کھینچ دیا تھا۔

چائے کا کپ میز پہ رکھ کر وہ باہر آئی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی خرم کھڑا تھا۔ یومنہ سامنے سے ہٹ گئی اور کچن کی طرف آ گئی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا تو گویا یہ گھر میں دل لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔

اس گھر کو اپنا سمجھنے لگی ہے، کتنی خوش کن بات ہے لیکن ہماری ذات سے وہ کتنی لاتعلق ہے، اسے ہم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اسی گھر کو سنوار رہی ہے جو اس کے باپ نے اس کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ سوچتا ہوا کچن میں ہی آ گیا۔

''ناشتہ لے کر آئے ہیں ہم، ناشتہ کیجئے اور ہم نے بھی نہیں کیا ہے۔'' یومنہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''جہاں رات گزاری تھی، وہاں والے صبح ناشتا نہیں دیتے کیا؟''

خرم ہنس پڑا اور کرسی کھینچ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا پھر کہنے لگا۔

''دراصل ہمیں صبح تمہارا خیال آ گیا تھا۔''

''جب رات کو ہی خیال نہیں آیا تو پھر صبح احساس کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' یومنہ جل کر بولی۔

''رات کو تمہیں ہماری ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ رات ہم گاؤں اور دن شہر میں گزارا کریں گے۔'' یومنہ کا جی جل گیا۔

''ایک غیرت مند شوہر کی یہی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی جوان بیوی کو ساری رات اکیلا چھوڑے رکھے اور صبح اس کے کھانے پینے کے لئے سامان لے آئے۔'' خرم ہنس دیا۔

''جوان..... اور تم.....'' وہ ہنستا چلا گیا۔ ''کون سی ایسی بات ہے تم میں جس سے لگے کہ ہاں تمہارے اندر بھی جوانی ہے۔''

اس کے جلتے سلگتے چہرے پہ خرم نے دلچسپ سی نگاہ ڈالی۔

''تم..... خرم بن ریاض! تم اپنی سوچ کے دائرے سے کبھی باہر آ ہی نہیں سکتے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، ہم تمہاری وجہ سے اپنی سوچ ہی بدل لیں۔''

''اگر تم ایسا کرو تو میری سب سے بڑی خوش قسمتی ہو گی لیکن تم جیسا ہٹ دھرم کسی کی خاطر لباس نہیں بدل سکتا، سوچ تو دور کی بات ہے۔''

''آخر ہم ہی کیوں بدلیں اپنے آپ کو۔ تم کیوں نہیں بدل جاتیں۔''

"تم نے محسوس ہی نہیں کیا کہ میں کتنا بدل چکی ہوں۔"

"ہمیں احساس ہے کہ گھر میں توجہ دے رہی ہو لیکن تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ تمہارا شوہر رات بھر کہاں تھا، کیا تم نے عام بیویوں کی طرح پوچھنے کی ضرورت محسوس کی؟"

"کیوں پوچھوں میں؟" وہ چیخی۔ "تمہیں ہوتا ہے اس چیز کا احساس۔ کیا لگتے ہو تم میرے۔" وہ سسکنے لگی۔ "تم کیا سمجھ رہے ہو، تمہارے پیچھے روتے سسکتے زندگی گزار دوں گی۔ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو حالات یا قسمت سے مار کھائے ہوئے ہوتی ہیں۔ میں اب بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں اپنے لیے۔"

بات اتنی کڑوی تھی کہ خرم کا ہاتھ اٹھ سکتا تھا لیکن اسے تو طیش بھی نہیں آیا۔ وہ اطمینان سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور سوچنے لگا۔

(ہم دروازہ کھلا اسی لیے چھوڑ کر جاتے ہیں کہ شاید تم ہمارا راستہ نہیں تکنا چاہتیں۔ ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں تمہیں کن راستوں کی تلاش ہے۔ آخر ایسی کون سی مجبوری ہے جو تم اس بندھن کو نباہ رہی ہو۔)

"یہ تو ہم بخوبی جان گئے ہیں کہ تم نے اس گھر سے دل لگا لیا ہے مگر گھر والے سے نہیں۔ تمہاری دلچسپی کا مرکز یہ گھر ہے ہم نہیں۔ کیسا دوغلا پن ہے تمہاری زندگی میں، یہ راز جاننا چاہتے ہیں۔"

اس کے خیالات پہ یومنہ ششدر رہ گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود سن ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو چکے تھے۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا لیکن اب دل واقعی چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے بھاگ جائے۔

اس کے رونے کا خرم پہ کوئی اثر نہیں تھا بلکہ وہ اس کے رونے پہ پھٹ پڑا تھا۔

"جس دن تمہارے دماغ سے یہ فلسفہ ختم ہو جائے گا کہ تمہاری زندگی برباد کرنے میں تمہارے ماں باپ کا ہاتھ ہے، اس روز سارا الزام ہی ختم ہو جائے گا۔ سب ماں باپ اپنی بیٹیوں کو ایسے ہی پالتے ہیں۔ کیا ہماری بہنیں ایسے ہی نہیں پلیں۔ ان کے دکھ سکھ کا ذمے دار کون ہے؟ ان کی تقدیر یا ہم۔ تمہارے ماں باپ نے بیٹیوں کی طرح پالا تو اس میں تمہاری خوش قسمتی نہیں تھی۔ ماں باپ کی مجبوری تھی۔ ان کا بیٹا نہیں تھا اس لیے انہوں نے تیرے اوپر اپنے بیٹے کے ارمان بھی پورے کیے اور بیٹی کے بھی مگر تم اپنے ماں باپ کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا رہی ہو اور جو اولاد ماں باپ کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے لگے، وہ نمک حرام اولاد ہوتی ہے اور تم اپنے ماں باپ کی لاڈلی نہیں، نمک حرام اولاد ہو۔" وہ تنفتا تا اندر چلا گیا۔

یومنہ کا وجود غم و غصے سے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ خرم جا چکا تھا اور وہ میز پہ سر رکھے

سسک رہی تھی۔

"میں پسند نہیں تھا تو کون پسند تھا، بتا دیا ہوتا ماں باپ کو۔ چھ سال رشتہ رہا ہے مجھ سے۔ میری تو زندگی حرام کرنے کے لئے آئی تھی یہاں۔" اس کا سفاک جملہ کانوں میں گونجا۔

"آہ....." وہ سسک اٹھی۔ "میں اپنی پسند کا اپنے والدین کو نہ بتا دیتی، تم تک آنے کی بھی مجھے ضرورت ہی کیا تھی مگر یہ تو تربیت پہ منحصر ہوتا ہے۔ میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اپنے جیون ساتھی کا انتخاب خود بھی کر سکتی ہوں لیکن میں ایسا کیوں سوچتی، مجھ سے بڑی چار بہنیں تھیں، چاروں کی شادیاں ماں باپ نے بہت اچھی جگہوں پہ کی تھی۔ کسی کی زندگی میں کوئی کمی تھی ہی نہیں پھر میں کیونکر اپنے والدین پہ اعتبار نہ کرتی۔ کیوں زندگی کا فیصلہ انہیں نہ سونپتی لیکن....." اس سے آگے اس کا دماغ کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ کپڑے دھونے میں مصروف تھی کہ اچانک ڈور بیل بجی۔

ہاتھ کے کپڑے نچوڑ کر اس نے بالٹی میں رکھے اور پھر دروازہ کھولنے چل دی۔

"سوائے اس صیاد کے اس دروازے پر آ بھی کون سکتا ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا لیکن وہاں بجائے خرم کے، ارم اور اس کا چھوٹا بھائی کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے خوشی ہوئی جیسے زندگی میں تازگی سی آ گئی ہو۔

"آؤ..... اندر آ جاؤ۔" اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ارم کچھ متفکر سی ہو گئی۔

"کیا بات ہے، آپ کی طبیعت خراب ہے کیا؟ تین چار روز سے آپ ہماری طرف بھی نہیں آ رہیں؟"

"نہیں بس ایسے ہی۔ گرمی کی وجہ سے کہیں نکلنے کو دل ہی نہیں کرتا۔" یومنہ نے بات بنائی۔

"اسی لیے میں آپ کے لئے آئس کریم بنا کر لائی ہوں، خاص طور پہ آپ کے لئے۔" ارم نے کہتے ہوئے کانچ کا باؤل یومنہ کی طرف بڑھایا۔ یومنہ نے شکریے کے ساتھ باؤل لے لیا۔

"یہ آئس کریم پگھل جائے گی، اسے ابھی کھا لیجئے گا یا پھر اسے فریج میں رکھ دیجئے۔"

یومنہ آئس کریم فریج میں رکھنے چلی گئی۔ واپس آئی تو کولڈ ڈرنک کے دو گلاس اس کے ہاتھ میں تھے۔

"ارے آپ نے ایسے ہی تکلف کیا۔ ہم تو بس جانے ہی والے تھے اور ہاں..... ماموں نے آپ کے لئے یہ کتاب بھیجی تھی۔"

"کیسی کتاب ہے یہ؟" یومنہ نے الٹ پلٹ کر کتاب کو دیکھا۔

''نفسیات کی کتاب ہے۔ ماموں کہتے ہیں، یہ کتاب ایسی ہے جس میں زندگی کی تمام پیچیدگیوں کا حل موجود ہے۔''

''یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ میری زندگی پیچیدہ ہے۔'' یومنہ نے ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا تو ارم فوراً بولی۔

''وہ نہیں سمجھتے سب ہی کو ایسا لگتا ہے۔'' یومنہ نے ارم کی طرف چونک کر دیکھا۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے؟ آپ کے عزیز و اقارب نہیں آتے آپ سے ملنے؟ آپ کے پیرنٹس، بہن، بھائی۔ آپ کے مسینڈ کے پیرنٹس، بہن، بھائی۔''

''نہیں تو' میرے پیرنٹس آئے تھے مجھ سے ملنے اور خرم کے گھر والے بھی آئے تھے۔''

(لیکن صرف ایک بار، میرے والدین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اگر مجھ سے ملنے آئیں گے تو میں اپنا بچپنا ظاہر کرتی رہوں گی۔ اگر میں ان سے ملنے جاؤں گی تو سابقہ آسائشوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر وہ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ میں ایک انسان ہوں۔ پل پل میں چلتے بجھتے جذبات کو کس پہ ظاہر کروں۔ کون ہے جو میرے احساسات سے آشنا ہو کہ مجھے تسلی دے۔ مانا کہ میری قسمت خراب تھی۔ اگر اتنی اچھی ہوتی تو میں یہاں نہ ہوتی۔)

ارم جا چکی تھی۔ وہ سوچوں میں غلطاں و پیچاں وہیں صوفے پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھی رہی۔ سامنے ہی وہ کتاب رکھی تھی جو ارم دے کر گئی تھی۔ اسے اس قسم کی چیزوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لیکن کتاب کا ٹائٹل دلچسپ تھا۔ ٹائٹل پہ آدھے مرد کا چہرہ عورت کے آدھے چہرے سے جڑا ہوا تھا اور یہ چہرہ سیاہ بنگلے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ اس نے کتاب اٹھا لی۔ ابھی کھولی تھی کہ کچھ پھڑ پھڑاتا ہوا اس کی جھولی میں آن گرا۔ اس نے کاغذ کھولا۔ ایک خط تھا جو اس کے نام لکھا گیا تھا۔ یومنہ کا دل دھڑکا۔ اس نے کاغذ کو سختی سے مٹھی میں بھینچ لیا اور پڑھنے کے بعد اس نے کاغذ کو پرزہ پرزہ کر دیا تھا۔

یہ اس کے دل کا چور ہی تو تھا کہ اس نے مشتعل ہو کر زوہیب کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ اس کا منہ طمانچوں سے لال نہیں کیا۔ ہاں اسے غصہ ضرور آیا تھا کہ ایسی حرکت اس نے کیوں کی۔ اس نے تو کبھی اسے اپنا حالِ دل نہیں سنایا۔ اسے اتنی ہمدردی کیوں ہوتی۔ اگر خرم یہ سب کچھ پڑھ لیتا تو اس کا وجود ہی نہیں، دل بھی کانپ اٹھا۔ اس کی کس قدر تعریف کی تھی اس نے، اتنی کہ شاید ہی کسی نے کی ہو۔ وہ لرزتے قدموں سے اٹھی اور باہر کا دروازہ بند کرنے آئی جو ارم کھلا چھوڑ گئی تھی۔

سامنے ہی زوہیب اپنے دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ اس کا سادہ سا چہرہ اور کھوئی ہوئی آنکھیں وہ اپنے ہی کسی خیال میں کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا لیکن دل کا دروازہ

بند نہ کر سکی۔

اس نے زوہیب کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی لیکن اس کی ڈٹ کر حوصلہ شکنی بھی نہ کر سکی۔

آج ساری رات خط کے متعلق سوچتے گزری تھی اور اسے عجیب عجیب سے خیالات اور وسوسے آتے رہے تھے۔

☆☆☆

خوشی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ امیمہ کے ہمراہ اس کی سہیلیاں اس کے گھر میں موجود تھیں۔

''بہت دنوں سے یہ لوگ مجھے کال کر رہی تھیں تمہارے گھر آنے کے لئے لیکن میں ٹالتی رہی۔ میں چاہتی تھی کہ تم اچھی طرح اپنے گھر میں ایڈجسٹ ہو جاؤ پھر انہیں لے کر آؤں گی۔ آج یہ بضد ہو گئیں تو امی نے کھالے جاؤ۔ اب لے تو آئی ہوں لیکن..... روز روز..... اگر یہ آ گئیں.....''

''آپ بے فکر رہیے۔ اب ہم اتنے بھی فالتو نہیں ہیں کہ محترمہ کا دیدار کرنے آئیں گے، ہاں البتہ اشتیاق ضرور تھا۔ منڈا ٹائپ لڑکی کا گھر دیکھنے کا۔ اچھا خاصا سجا رکھا ہے۔ کتنے ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ اچھا خاصا امیر آدمی ہے تمہارا میاں۔ شادی پہ تو سرسری سی ہی ملاقات ہو سکی تھی۔ بائی داوے، صاحب گھر پر ہی ہیں یا.....''

''کچھ سانس بھی لو گی یا یونہی تابڑ سوڑ سوال کیے جاؤ گی۔''

''امیمہ! تم ان کے پاس بیٹھو، میں ان کے لئے.....''

''ارے نہیں، رہنے دو۔ ہم تو بس تھوڑی دیر کو آئے ہیں۔ یہ اپنی صبا کی شادی ہو رہی ہے، اس کا انوی ٹیشن کارڈ دینے آئے تھے۔''

''یعنی تم سب.....'' وہ رُک کر انہیں شرارت سے دیکھنے لگی۔ ''میری شادی پہ تو تم نے ایسا فرض ادا نہ کیا؟''

''بھئی تمہاری چار بہنیں جو تھیں۔''

اسی اثناء میں خرم گھر میں داخل ہوا تو چار خوبصورت فیشن ایبل لڑکیوں کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا لیکن ساتھ اپنی سالی کو دیکھ کر آگے بڑھنے لگا تو سب نے باری باری سلام کیا۔

''السلام علیکم خرم بھائی! کیا حال ہے، ٹھیک ہیں؟ ہم آپ سے ملنے کے بہت خواہش مند کیونکہ آپ ہماری لاڈلی دوست کے اکلوتے شوہر جو ہیں.....'' امیمہ نے پلوشہ کے چٹکی کاٹی تو اس جملہ ادھورا رہ گیا۔

خرم نے ان پہ ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور چپ چاپ اندر کمرے میں چلا گیا۔

یومنہ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ الٹے پیروں خرم کے پیچھے آئی۔

"میری سہیلیاں پہلی بار میرے گھر آئی ہیں۔ تم کم از کم سلام کا جواب تو دے دیتے۔"

خرم نے بڑے غور سے یومنہ کی طرف دیکھا۔ وہ کس قدر خوش تھی۔ "تمہاری سہیلیاں تمہارے گھر آئی ہیں، ہمارے گھر نہیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک بات کیسے؟ اگر ایک بات ہوتی تو ہمارے گھر والوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتیں۔ جب تم نے ہمارے گھر والوں کو اپنا نہیں سمجھا تو ہم کیسے تمہارے جاننے والوں کو اپنا سمجھ سکتے ہیں۔"

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ یہ حساب کتاب بعد میں کرتے رہنا۔ مجھے بازار سے کچھ سامان لا دو۔"

خرم مسکرایا۔ "بہت خوش فہمی ہے تمہیں۔ یہ حساب تو تم پہ قرض تھا، موقع پر ہی اترتا۔ یہی کافی نہیں کہ انہیں گھر سے نکالا نہیں۔ ایسی عورتوں کو تو ہمارے گھر میں گھسنے بھی نہیں دیتے تم ان عورتوں کے ساتھ اسکولوں وکالجوں میں پڑھا کرتی تھیں؟"

"خرم......!" وہ دبے دبے انداز میں چیخی۔ "خدا کے واسطے آہستہ بولو۔"

"اگر اتنا خوف تھا تو کیوں آئی ہو ہمارے منہ لگنے۔"

یومنہ جیسے تیسے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کمرے سے باہر آئی۔ وہ سب اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ امیمہ نے ایک عقل مندی کی تھی کہ ٹی وی کی آواز ذرا اونچی کی ہوئی تھی۔ اس لیے اندر کی آوازیں آ تو رہی تھیں لیکن سمجھ نہیں آتی تھیں یا شاید آ بھی رہی تھیں۔ امیمہ نے اس پر نگاہ ڈالی۔ وہ بہت نروس دکھائی دے رہی تھی۔ نجانے اچانک اس کا سارا اعتماد کہاں چلا گیا تھا یا سہیلیوں کے سامنے وہ زیادہ سبکی محسوس کر رہی تھی۔

"بڑے اکڑفوں ہیں تمہارے شوہر صاحب، سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔" ثوبیہ نے تیکھے انداز میں کہا۔ شروع سے ہی اس کی عادت تھی، ہر بات منہ پہ کہہ دیا کرتی تھی۔

"ہر انسان کی اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے۔" امیمہ نے بات سنبھالی۔

"اچھا یومنہ! ہم چلتے ہیں۔ صبا کی شادی میں ضرور آنا۔ ہم سب تمہارا انتظار کریں گے آخر تم ہمارے گروپ کی جان تھیں۔ ہم سے اتنی جلدی کٹ مت جانا۔" وہ سب ہاتھ ملا کر باہر نکل گئیں اور وہ شرمندگی کے مارے انہیں مزید بیٹھنے کا کہہ بھی نہ سکی۔

اسی دوران خرم کمرے سے باہر نکلا تو مہمان جا چکے تھے۔ سالی کے چہرے پر تفکر اور بیوی

کے چہرے پہ اداسی تھی۔ خرم کے چہرے پہ مسکراہٹ سج گئی۔

کچھ کہے سنے بغیر وہ سیدھا باہر نکلتا چلا گیا۔ شاید گھر سے بھی باہر۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی رواں ہو گئی۔

امیمہ نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خرم اس فطرت کا انسان ہے۔"

"اب تو دیکھ لیا تم نے۔ جا کر بتا دینا میرے ماں باپ کو۔"

"دیکھو یومنہ! اب ان باتوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ ہم تمہارے لیے کچھ کر سکتے تو پہلے ہی کرتے، اب تمہارے بسے بسائے گھر کو اجاڑنا......" یومنہ نے امیمہ کی طرف شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں اس کرب کو جس پہ گزرتی ہے وہی جانتا ہے اور کون سے بسائے گھر کی بات کر رہی ہو تم۔ اس گھر کی، اس بھوت بنگلے کی، جہاں پینے کے لئے ٹھنڈا پانی میسر نہیں۔ جانوروں کے ساتھ رہ رہ کر جانوروں جیسا دماغ ہو گیا ہے اس کا۔ جانوروں جیسا سلوک کرتا ہے میرے ساتھ۔"

"جانور چاہے جنگلی ہو یا پالتو۔ محبت سے سدھائے جاتے ہیں۔ تم نے لگتا ہے آج تک ایسا کیا ہی نہیں۔"

امیمہ کی بات پہ یومنہ انگاروں پہ لوٹ گئی۔

"جب بھی کوئی بات ہوتی ہے، سب مجھے ہی مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ میں کیونکر سدھاؤں اسے۔ میں اس کی بیوی ہوں یا اس کی ماں؟"

"یومنہ! تم میں صلاحیتیں ہیں، اس میں نہیں۔ تم اسے اپنے جیسا بناؤ گی تو وہ انسان بن جائے گا۔ ذرا سوچو، کل کو تمہارے بچے بھی ہوں گے۔ جب تک تم اس کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ پیدا نہیں کرو گی، بچوں کے معاملات کیسے حل کر پاؤ گی؟" امیمہ نے کہا۔

"اس میں یہ خصوصیت ہی نہیں کہ وہ بیوی کی بات سن کر سمجھ سکے۔" یومنہ نے آہستگی سے کہا۔

"میرے پاس وقت ضائع کرنے کے لئے نہیں ہے۔" اس نے غصہ سے ناک صاف کرتے ہوئے کہا تو امیمہ افسردگی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

☆☆☆

"لگتا ہے آپ نے میری بات کا برا مانا ہے، تب ہی تو ہماری طرف آنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بس تنہائی اچھی لگتی ہے۔"

"آپ فطری طور پر تنہائی پسند تو نہیں لگتیں۔"

"تھی نہیں مگر اب ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں اس چیز کا جواب دینے کی آپ کو مجاز نہیں۔"

"کیا ہم اچھے دوست نہیں ہیں؟"

"میں نے کبھی ایسا دعوا نہیں کیا۔"

"لگتا ہے، آج خرم صاحب سے آپ کی ٹھیک ٹھاک لڑائی ہوئی ہے، تب ہی آپ مرچیں چبا رہی ہیں۔"

یومنہ نے غور سے زوہیب کی شکل دیکھی۔ لڑائی تو واقعی ہوئی تھی لیکن اسے کیسے معلوم ہوا۔

"کیا آپ نے آس پڑوس میں جاسوس چھوڑ رکھے ہیں؟"

"جاسوس نہیں، موکل کہیے۔" وہ لطف لے کر بولا پھر یکدم سنجیدہ ہوگیا۔ "میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا، محض آپ کو ہنسانے کے لئے لیکن یکدم خیال آیا۔ ہنسی ہنسی میں کہیں آپ کا دل نہ دکھ جائے۔"

"دوسروں کے دلوں کی آپ کو بہت پروا ہوتی ہے۔" یومنہ کے لہجے میں طنز تھا۔

"ہاں، چند دل ہیں ایسے، جو واقعی مابدولت کی نگاہِ خاص میں ہوتے ہیں اور جس کی پروا نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتی ہے۔"

"ان دلوں میں میرا شمار کب سے ہوا؟"

"میں نے کب کہا کہ آپ کا شمار بھی ان میں ہے؟" زوہیب، یومنہ کے تیوروں سے ڈر کر بولا۔

"آپ نے مجھے خط کیوں لکھا؟" وہ بالکل سنجیدہ تھی۔

"میں بھی تو یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کو برا لگا۔" اس کے لہجے میں کتنی اپنائیت تھی۔ کسی غم خوار دوست کی طرح۔

"ہاں، بہت برا لگا۔"

"براہ مہربانی آپ میرے معاملے میں آئندہ اس قدر انوالومنٹ ہوئیے گا۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ میں چاہے جیسے بھی ہینڈل کروں۔ اگر بالفرض آنٹی کو یا ارم کو چند ایک باتیں میں نے بتائی ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ....."

"دیکھیں یومنہ! آپ پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہیں، کیوں اپنی زندگی کو جہنم میں زبردستی جھونک رہی ہیں۔ آپ کی زندگی کا ابھی آغاز ہوا ہے۔ ساری عمر ایسے ہی بتانے سے کہیں بہتر نہیں کہ آپ۔" زوہیب جذباتی ہو رہا تھا پھر یکدم خاموش ہوگیا اور لب سختی سے بھینچ لیے۔

اس وقت اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنا معاملہ کسی کے ساتھ شیئر کرے۔ کیا زوہیب اچھا سنت ثابت ہوسکتا ہے؟ وہ ذہنی طور پہ بہت ڈسٹرب تھی اور پھر وہ کھلتی چلی گئی۔

"خرم سے میری نسبت چھ سال رہی ہے۔

جب میں میٹرک میں ہی تھی، تب ہی سے خرم کی امی نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ مجھے وہ اپنے بیٹے کے لئے لیں گی۔"

ان کی کسی نے حوصلہ افزائی نہیں کی۔ امی سخت خلاف تھیں کہ وہ ابو کے خاندان میں اپنی بچی کو نہیں دیں گی۔ ابو بھی خاموش تھے۔ ابھی میری تعلیم جاری تھی اور وہ جلد شادی نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن سال چھ ماہ میں خرم کی امی جب بھی آتیں اپنا مدعا زور و شور سے واضح کر کے جاتیں۔ پتو ان کے کیے کا خاص اثر نہ ہوا، البتہ خاندان بھر میں شور ہوگیا کہ یومنہ کی شادی خرم سے ہوگی طرح رشتوں میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ یوں سمجھئے کہ ان لوگوں کے قدم ایسے پڑے کہ کوئی دوسرا چوکھٹ پہ آیا ہی نہیں۔ میرا نصیب خرم کے ساتھ ہی تھا۔

شاید میرے والدین نے میرے لیے بہتر یہی کیا تھا کہ ماحول کی تبدیلی کا مطالبہ کر دیا تھا لیکن بڑی اماں یہی کہا کرتی تھیں کہ ماحول بدلنے سے فطرت نہیں بدلتی۔

آج صبح خرم نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے ساتھ گاؤں چلوں اور وہیں رہوں کیونکہ اس کی ماں بیمار ہے اور میں ان کی خدمت کروں۔ اگر خرم کسی اور طریقے سے مجھ سے یہ سب کہتا تو شاید میں مان لیتی لیکن وہ سمجھتا ہے کہ مادیت پسند لڑکی ہوں۔ مجھے دھن دولت سے پیار ہے، رشتوں سے نہیں۔

یقین جانیے، میرے اندر ایک طوفان آ جاتا ہے جب میں یہ سوچتی ہوں کہ میں اس شخص کے لئے اپنا آپ مٹاؤں جس نے مجھے کبھی نرمی سے نہیں پکارا، محبت تو درکنار۔" یہ کہتے ہوئے اس نے زوہیب کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہوگئی۔

"میں اتنی ضدی نہیں ہوں لیکن خرم کے رویے نے مجھے لگتا ہے، بہت ہٹ دھرم بنا دیا ہے۔ مجھے یوں لگنے لگا ہے جب تک میں اس کی ہر زیادتی کا جواب اسی وقت نہیں دے لوں گی، میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ مجھے اس کی زیادتی یاد آ رہی تھی۔ اس نے گھر آئے مہمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اسے اس چیز کا احساس ہو۔ تب ہی میں نے کہہ دیا۔

اول تو میں نے ٹھیکہ نہیں لیا ہے تمہارے کہنے کو سنبھالنے کا اور اگر تم سمجھتے ہو کہ میں ان کی دیکھ بھال کر سکتی ہوں تو انہیں یہیں لے آؤ۔ ابھی آپ وہوا ہوگی اور صاف ستھرا ماحول۔ آدھی بیماری تو ایسے ہی ختم ہو جائے گی پھر شہر میں اچھے سے اچھے ہسپتال بھی ہیں۔ وہ دنوں میں بھاگی پھریں گی۔ میں بھی دیکھ بھال کر لوں گی۔

اس نے یہ سب سن کر پتا ہے کیا کہا۔

ہمیں تو پہلے ہی معلوم تھا تم اس تاج محل سے نکلنا ہی نہیں چاہتیں۔ تمہیں ڈر ہے کہ تمہیں کسی نہ کسی بہانے سے گاؤں لے جانا چاہتے ہیں اور تمہارے پیچھے ہی مکان کو بیچ دیں ہے نا یہی خیال ہے نا تمہارا؟

پھر مجھ سے لڑنے لگا کہ جو لوگ گاؤں میں رہتے ہیں کب ان کی صحتیں اچھی نہیں ہوتیں ان کے آباؤ اجداد وہیں رہے ہیں۔ سو سو سال کی عمریں پا کر گئے ہیں اور میں اسے نئے سبق دے رہی ہوں۔ صرف اپنے مفاد کی خاطر۔ میں بھلا اس شخص کے آگے کیا بولتی، خاموش ہو گئی۔"

"بالکل ٹھیک کیا آپ نے" زوہیب نے اس کی تائید کی۔

پہلی بار اس کی بات کی کسی نے تائید کی تھی۔ اسے خوشی اور اپنائیت کا ملا جلا احساس ہوا، وہ جلد ہی سنبھل گئی۔

"میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس نے خود پہ جو بنیادی خول چڑھا رکھا ہے اسے اتارو۔ یا شاید وہ ضرورت سے زیادہ ہی احساس برتری کا شکار ہے۔"

"وہ احساس برتری کا نہیں، احساس کمتری کا شکار لگتا ہے۔ وہ آپ کی خوبیوں کو ماننا نہیں چاہتا ہے۔ اس لیے ہمہ وقت آپ سے خود کو منوانا چاہتا ہے۔"

"احساس کمتری۔" یومنہ تلخی سے ہنسی۔

"اسے کس چیز کا احساس کمتری ہوگا۔ دھن دولت، عزت اور شکل وصورت بقول اس وہ تو اپنے پنڈ کا مہاراجہ ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں وہ واقعی احساس کمتری کا شکار ہے۔ میں اس سے زیادہ نہیں، لیکن چند ملاقاتوں سے ہی بھانپ گیا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ جس روز اس کی طبیعت خراب تھی اور لوگ اسے ہاسپٹل لے کر گئے تھے۔ میں اندر کمرے میں اس کے پاس تھا جیسے ہی اس کی طبیعت بحال ہوئی۔

سب سے پہلے اس نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ اسے یہاں کون لے کر آیا ہے۔ میں بتایا کہ ہم لوگ۔ وہ ٹھٹکا۔ پھر شکی لہجے میں بولا۔

"تم یومنہ کے کیا لگتے ہو؟" مجھے افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ میں نے کہا۔

"جو میں آپ کا لگتا ہوں۔ وہی آپ کی بیوی کا بھی لگتا ہوں۔ صرف پڑوسی" لیکن اسے اطمینان نہیں ۔وہ میری طرف دیکھتا رہا۔

"صرف پڑوسی ہی نہیں۔ تمہارا کوئی پرانا تعلق بھی ہوگا۔"

"کیسی بات کر رہے ہیں خرم صاحب آپ؟"

"میں تو آپ لوگوں سے ملا ہی یہاں آ کر ہوں۔ عرصہ ہو گیا میری رہائش تو باہر کی ہے۔"

"ہونہہ یہ جو لڑکیاں مردوں کے ساتھ پڑھتی ہیں نا۔ برسوں پرانے دوست ان کے نکلتے رہتے ہیں، شادی ہو گئی تمہاری؟"

"ابھی نہیں ہوئی۔"

"کیوں؟"

"کوئی اچھی سے لڑکی ملے گی تو اس سے شادی بھی کر لیں گے۔"

"اچھی سی لڑکی۔" وہ تمسخرانہ ہنسا۔

"یہ اچھی سی لڑکی کیا ہوتی ہے؟" اس کے سوال میں کئی سوال پوشیدہ تھے۔ میں ٹھٹکا پھر سنبھل گیا۔

"صاحب، آپ خود شادی شدہ ہیں۔ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اچھی عورت اور بری عورت میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اچھی عورت وہ ہوتی ہے۔ جو صرف ایک مرد کی ہوتی ہے، بری عورت وہ ہوتی ہے جو دل کہیں لگاتی ہے اور بیاہ کہیں رچاتی ہے۔ اپنے ارمان پورے کر کے آنیوالی عورت کبھی اپنے مرد کو سکھ نہیں دیتی۔ نت نئی فرمائشیں اور جھگڑے اور ہر وقت مرد کا جینا حرام کیے رکھتی ہے ماشاء اللہ خرم صاحب آپ کی بیوی تو خاندانی عورت لگتی ہیں۔"

"خاندانی تھی جبھی تو ہم نے شادی کی تھی۔ لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ ہمیں آتے ہی پیر کی جوتی سمجھے گی۔ ہم ایک مقام رکھتے ہیں پنچایتوں میں فیصلے تب تک نہیں ہوتے جب تک ہماری صلح شامل نہ ہو۔ بڑے بڑے پیروں فقیروں کے ہاں آنا جانا ہے ہمارا، بڑا کرم ہے اللہ کا ہم۔ بن پڑھے بھی ہمیں دین دنیا کا بہت کچھ پتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔" میں مزید کیا کہہ سکتا تھا وہ میری طرف دیکھنے لگا کہ ہم کوئی الو کے پٹھے نہیں ہیں۔ جو اپنی عورت کا معاملہ تجھ سے کہہ سن رہے ہیں ہم جب بھی تمہارے جیسے کسی بھی پڑھے لکھے مرد کو دیکھتے ہیں ہمیں لگتا ہے۔ ہماری عورت ایسے ہی کسی مرد کو پسند کر سکتی تھی۔

تب ہی وہ ہم سے ہر وقت کھار کھائے رہتی ہے۔ ہم سے تو کیا۔ اپنے ماں باپ کو اپنی قسمت کو کوستی رہتی ہے۔ کیوں پڑھا دیتے ہیں ماں باپ بیٹیوں کو اتنا کہ ان کے دماغ ساتویں آسمان پہ چڑھ جاتے ہیں۔ پھر داماد بھی ڈھونڈ لیں ان کے معیار کے۔ ہم تو جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے۔"

"میں خرم صاحب سے ملنے کے بعد بہت بے چین رہا اور پھر میں نے سوچا شاید خرم ٹھیک کہہ رہا ہو۔ واقعی آپ کا کوئی آئیڈیل ہو۔ میں نے ازراہ ہمدردی آپ کے قریب آنے کی کوشش کی

وہ خط بھی اسی ایک لمحے کی سازش تھی۔" یومنہ کی آنکھیں پھٹ گئیں اور اس کا دل جیسے تھم گیا۔" معاف کیجئے گا یومنہ جی! میں نے اپنے تئیں صرف آپ کو آزمایا تھا۔"

مگر آپ کے ردِعمل پر میرے اندر اطمینان اتر گیا۔

میرا اعتماد آپ پہ مزید بڑھ گیا۔ میں بہت دن سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ شخص برا ضرور ہے۔ لیکن دل کا اچھا ہے۔ تب ہی تو وہ ایک اجنبی سے اپنا حالِ دل کہہ گیا۔" نجانے اور زوہیب کیا کیا کہہ رہا تھا۔

یومنہ کی سوئی صرف ایک ہی جملے پہ اٹکی تھی۔

"میں نے آپ کو آزمایا تھا۔"

اگر وہ اس آزمائش میں فیل ہو جاتی۔ اس نے پرزور مخالفت کب کی تھی۔ بس خاموشی اختیار کر لی تھی۔

اس رات اس کی بے چین سوچوں نے کتنا بے قرار کیا تھا وہ کیسے لمحے تھے۔

وہ اس نہج پہ بھی پہنچ گئی تھی کہ اگر خرم نے اپنا رویہ درست نہیں کیا تو وہ کوئی راستہ تلاش کرے گی وہ راستہ کیا تھا؟

اس نے سوچا ضرور تھا۔ بے شک ان سوچوں کو بعد میں جھٹک دیا تھا۔ اگر وہ خود کو نہ سنبھالتی اور بھٹک جاتی تب اس کی حرمت اور عزت کیا رہتی نہ اِدھر کی اور نہ اُدھر کی۔ اسے خود سے گھن آنے لگی تھی۔

☆☆☆

خرم دن رات کے کسی لمحے میں گھر نہیں آیا تھا۔ وہ بھی اس کے متعلق کیا ایسی ہی سوچ رکھتا ہوگا۔

"آج مجھے یہ کیا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ماں باپ کا اعتماد بحال رکھا شوہر کا کیوں نہ رکھ سکی اور لوگ مجھے آزما بھی گئے۔ میرے پروردگار! اس نے آسمان کی طرف دیکھا "بے شک تو ہی تھامنے والا ہے۔"

آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک رہے تھے "خرم نے شاید ایک بار صحیح کہا تھا۔ میں اپنے والدین کی لاڈلی نہیں نمک حرام اولاد ہوں۔ تبھی تو ہر وقت ناشکری کا کلمہ میری زبان پر رہتا ہے۔"

اس نے ارم کے گھر سے اپنے ماں باپ کے گھر فون کیا تھا اور گاڑی بھیج ڈرائیور کے منگوائی تھی۔ وہ گاؤں جانا چاہتی تھی۔

اس نے اپنی ذات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اسے سرخرو کرنا تھا تو صرف اپنی تعلیم کو۔

پورا راستہ لایعنی سوچوں میں گزرا۔ گھر کے آگے گاڑی رکی۔ اس کی سوچیں بھی رُک

گئیں۔ اردگرد کا ماحول دیکھ کر اسے ابکائی آ گئی۔ وہ جیسے خواب سے جاگی تھی۔

دروازے کے باہر ہی گائے بھینس جگالی میں مصروف تھیں اردگرد پھیلی نجاست، متعفنات ہوئی بکریاں۔ ایک طرف دنبہ بھی بندھا تھا۔ ان کے آگے گھاس کا ڈھیر تھا۔ مکھیوں اور مچھروں کی یلغار اور تیز چمکتی ہوئی دھوپ۔

اس نے شہر سے گاؤں آنے میں اتنی دیر نہیں سوچا تھا۔ جتنا دیر گاڑی سے پاؤں باہر رکھنے کے بارے میں سوچا۔

وہ اندر صحن میں آ گئی۔ سامنے ہی عجب تماشہ اس کا منتظر تھا۔ صالحہ سامان باندھے کھڑی تھی۔ گود میں سب سے چھوٹا بچہ تھا۔

سلیمہ ایک طرف سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ خرم ایک طرف کھڑا تھا۔ خرم کا باپ اور بھائی بھی گھر میں موجود تھے۔

اس نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے صالحہ کے یہ الفاظ سنے تھے۔

"میں اس گھر سے جا رہی ہوں۔ میں کوئی کم ذاتوں کی وی نہیں ہوں۔ جو تمہاری خدمت بھی کروں اور مار بھی سہوں۔ روز بروز کی ذلت میرے سے سہی نہیں جاتی۔ اب میں تبھی اس گھر میں آؤں گی جب میرا بھی علیحدہ ٹھکانہ ہوگا۔ کوئی بڑے باپ کی وی نہیں ہے۔ جو علیحدہ کوٹھی لے کے وی ہے اسے بڑا مان تھا تم ماں بیٹوں کو۔ میں جاہل تو پندرہ سال گزارا کر گئی۔ اس سولہ جماتن نے تو پندرہ دن بھی تمہارے ساتھ نہ بتائے۔ میری آہ پڑی ہے تم پہ صبر پڑا ہے میرا وہ پڑھی لکھی ہی تمہاری عقل ٹھکانے لگائے گی۔ جس کی عقل سے تم نسل سنوارنے چلے تھے۔"

اس کے ساتھ ہی صالحہ کی زبان اور قدم رُک گئے۔ اس کی زبان کیا رُکی سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں۔ اور ایک نقطے پر رُک گئیں اور وہ نقطہ کیا تھا۔ یومنہ ہمدانی۔

"میں یہاں ہمیشہ آپ لوگوں کے ساتھ رہنے آئی ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

یک بیک صحن کا منظر ہی بدل گیا جو سر پکڑے بیٹھیں تھی۔ خوشی سے اس کی طرف لپکیں اور اس سے لپٹ گئیں۔

اس نے بے ساختہ خرم کی طرف دیکھا۔ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کو چھپا نہیں پایا تھا۔

یومنہ اور اس کی آنکھیں چار ہوئیں، اس نے جلدی سے پیٹھ موڑ لی۔ البتہ اس کے ہونٹوں کی نرم مسکان یومنہ سے چھپ نہ سکی تھی۔

طمانیت کی ایک لہر یومنہ کی رگ و پے میں اتر گئی۔

"تو بہت اچھی ہے وہیے! تُو نے ہمارا بھرم رکھ لیا۔" خرم کے باپ نے اس کے سر پہ

ہاتھ رکھا۔

''میں نے آپ کا نہیں اپنی سولہ جماعت کا بھرم رکھا ہے۔ اگر آج میں بروقت یہ فیصلہ نہ کرتی۔ تو لوگوں کا اعتماد تعلیم سے اٹھ جاتا۔ پھر تعلیم کہاں ہوتی۔''

''ترقی یافتہ عورت اور گھریلو عورت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوں گے تو وہ نسلوں کی امین بنا سکیں گی۔ آجا دھیے! اندر چل تھک گئیں ہوگی۔ سلیمہ اسے لے کر اندر چلی گئی۔ تُو نے ایسا کر کے ہمارے دل میں جگہ بنالی ہے دھیے۔''

''تم نے ایسا کر کے ہمارے بھی دل میں جگہ بنالی ہے۔ اب ہمارے شہر اور گاؤں کے گھروں میں کوئی فاصلہ نہیں رہے گا۔'' خرم مسکراتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

......✿......

کیسے مانوں میرا ہے

ساون کا موسم عروج پر تھا۔ دن رات کی بارش نے گرمی کی شدت ہی کیا' دلوں کی زاری بھی دور کردی تھی۔

کبھی رات کو مینہ برستا تو چھتوں اور صحنوں میں سونے والے بے چین ہو جاتے اور جو دن مینہ برستا تو ہر قسم کا نظام تلپٹ ہو جاتا۔

خاص طور پر ملتان شہر میں' جہاں کی سڑکیں ناہموار اور سیوریج کا انتظام غیر مؤثر تھا۔ اس کے باوجود لوگ کتنے زندہ دل تھے کہ ساون کے مہینے کو دل کھول کر انجوائے کر رہے تھے۔ وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھڑی اپنے پوائنٹ کا انتظار کر رہی تھی۔

''تیز ہوا کے جھونکے کتنے بھلے معلوم ہو رہے ہیں بشرطیکہ ان کے ساتھ بوندوں کی بوچھاڑ نہ ہو۔'' اس نے فائل سے اپنے بھیگتے کپڑوں کو جھاڑا اور بیزاری سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دور دور تک کوئی سواری کا امکان نہیں تھا' کسی سے لفٹ لینا وہ اپنی سخت توہین سمجھتی تھی۔

آج اس کا بھی کوئی بھائی ہوتا تو اسے یوں کوفت سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ یک لخت پسندیدہ موسم اسے بہت برا لگنے لگا۔ قبل اس کے کہ انتظار کی کوفت سے پریشان ہو کر وہ رونا شروع کر دیتی زن سے موٹر سائیکل اس کے پیروں کے پاس آ کر رکی۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ کیا بدتمیزی تھی؟'' اس نے عاذان کو گھور کر دیکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح بے فکری سے ہنس پڑا۔

''بیٹھیے۔''

مریم چپ چاپ اس کی بائیک پہ سوار ہو گئی۔

''ہر جگہ، ہر مقام پہ کھڑا ہو کر سوچنا چھوڑ دیجئے۔ سوچنا اچھا ہوتا ہے لیکن اتنا جتنی انسا کی عمر اور تجربہ ہو۔ سوچنے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ بڑھ جاتے ہیں۔ خاص طور پر خواتین کو کم کم سوچنا چاہیے' بصورت دیگر وہ جلد بوڑھی نظر آنے لگتی ہیں۔ پریشانیاں اور فکرات اٹھانے کے۔ زیادہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو بھیجا ہے خواتین کو صرف مردوں کی دل لگی کے لئے اتارا ہے۔''

''تمہیں امی نے بھیجا ہے یا خود آئے ہو؟'' جہاں اس کی بائیک اسٹارٹ ہوئی تھی، زبا بھی چل پڑی تھی۔ مریم نے اَن سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ ہمیشہ ایسا کیوں سمجھتی ہیں کہ میں نیکی خاص طور پر آپ کے معاملے میں ، راست نہیں کر سکتا۔ کیا مجھ پر ٹیکس لگ جائے گا؟''

''شکر ہے کہ تم آگئے اگر تھوڑی دیر تک نہ آتے تو میں ساری کی ساری بھیگ جاتی۔''

''صرف کپڑے ہی تو بھیگتے۔ کون سا آپ خود بھیگ جاتیں۔ دنیا میں کچھ ہے ایسا جو آپ پہ اثر کرے۔''

''ہاں۔ میری ماں کا پیار......''

''کاش میں آپ کی ماں ہوتا......''

''بکو نہیں۔ یہ بتاؤ صبح تم مجھے دیکھ کر ہنس کیوں رہے تھے؟''

''مسلمان کا تو مسکرا کر دیکھنا بھی صدقہ ہے۔ نیکی کر رہا تھا بھلا پوچھنے کی بات تھی۔''

''سدھر جاؤ عاذان۔''

''سدھر جاؤں گا بشرطیکہ آپ سدھار دیں تو۔'' عاذان سوچ کر رہ گیا۔

گھر آ چکا تھا۔ مریم اتر گئی۔ ''آؤ اندر نہیں آؤ گے؟''

''آؤں گا لیکن ابھی جلدی ہے۔ تائی امی کو سلام کہنا۔''

مریم چپ چاپ کھڑی رہی۔ جیسے پھر سوچ میں ڈوب گئی ہو۔

''کیا بات ہے؟'' عاذان کو تشویش ہوئی۔

مریم کے چہرے پہ ازلی وقار اور سنجیدگی تھی۔

''شکریہ' تم میرے اس کٹھن وقت میں کام آئے۔''

عاذان نے سر پیٹ لیا۔ جی چاہتا تھا سر دیوار میں مارے، اس نے سوچا تھا جانے ا سنجیدگی سے کیا کہنے والی ہے۔

مریم اس کی کیفیت پہ ہنس پڑی۔ عاذان اسے گھورتے ہوئے بائیک موڑنے لگا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے پیدل بائیک گھسیٹتا چلا آ رہا تھا۔ بال' کپڑے سب کچھ بارش میں بھیگ کر چپک گئے تھے۔

''نیکی کر دریا میں ڈال۔ بے مروت نے ایک گلاس پانی کا بھی نہیں پوچھا۔ کسی اور لڑکی کو اتنی لفٹ کراتا تو وہ دس نخرے اٹھاتی۔ ثواب نہ سہی خوشی تو ملتی۔''

سامنے نگاہ پڑی وریشہ بالکنی میں کھڑی ہنس رہی تھی۔

''بندریا۔'' وہ جل تو گیا۔ ''ہر وقت دانت دکھاتی رہتی ہے۔''

اس نے بائیک پورچ میں کھڑی کی اور سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ فریش ہو کر باہر آیا تو جی جل کر راکھ ہو گیا۔

محترمہ ابھی بالکنی میں ٹنگی ہوئی تھیں اور اب سر پہ آن پہنچیں۔

''کیا پکایا ہے؟'' وہ نروٹھے پن سے بولا۔

''قیمہ بھری مرچیں، لیکن پہلے جا کر وریشہ کو دہی لا دو......''

سائرہ نے بیٹے سے کہا تو بڑے رسان سے تھا لیکن بیٹا متھے سے اکھڑ گیا۔

''کیوں؟؟ کیا میں اس کا ''کاما'' لگتا ہوں جو ہر وقت میرے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔ دہی لا دو، پودینہ لا دو۔ ببلو کے بال کٹوا دو۔ ذرا بھائی سرخی پاؤڈر والے کو روکنا، مجھے پراندہ خریدنا ہے، ذرا ایک بوتل تو لا دو، دو مہمان آئے ہیں۔ کنجوس ایک بوتل میں پانی ڈال کر دو مہمانوں کو پلاتے ہیں۔''

''اگر پلاتے ہیں تو تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

''تائی امی! دیکھ لیں اسے۔ ضرورت سے زیادہ ہی بدتمیز ہو گیا ہے۔ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھنے لگا ہے۔ طرم خان کا پوتا ہو جیسے۔''

''اے۔ اے۔ میرے دادا پہ مت جانا۔''

''کیوں۔ کیوں نہ جاؤں، اگر تمہارے دادا ہیں تو میرے بھی دادا ہیں۔ میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے۔ جو تمہاری رگوں میں ہے۔''

''ہاہاہا۔'' عاذان اس کے سرخ چہرے کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

''دن بہ دن تم کتنی موٹی ہوتی جا رہی ہو۔ کبھی اس بارے میں سوچا ہے تم نے؟'' اس نے وریشہ کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا تو وہ جز بز سی ہو گئی۔

''اگر موٹی ہوں تو اپنے لیے، تمہارے گلے تو نہیں پڑ رہی۔''

''اللہ اکبر۔ میں نے گلے میں ڈال کر کیا ڈھول پیٹنا ہے۔ میں نے تو اپنے جم خانے کے باہر لکھوا رکھا ہے۔''

"صحت بڑی نعمت ہے۔ خبردار موٹے افراد کی صحبت سے دور رہیے۔"

"اوہ۔ ہو۔ بڑا خوبصورت جسم ہے نا تمہارا۔ شرٹ اتارتے ہو تو یوں لگتا ہے گوشت میں رگوں کی جگہ سانپ بچھو رینگ رہے ہوں۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ ایک خوبصورت مرد کو دیکھتے ہوئے۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ صبح صبح ہمارے لان میں آ کر کرتب دکھاتے ہوئے۔"

"وہ لان ہمارا ہے۔"

"جتنا حصہ تمہارا بنتا ہے اس میں دیوار کھڑی لو۔"

"دریشہ! عاذان! کیا بکواس ہے یہ؟"

"بکواس تائی امی! میں نہیں یہ کر رہا ہے۔"

"عاذان! میں کہتی ہوں زبان بند کروا اپنی۔"

"حاسد! جلتی ہے مجھ سے۔"

"جلے گی میری جوتی۔"

"تب ہی تو صبح صبح جوتیاں گھستی ہے۔ بلڈوزر کی بھی سیڑھیاں چڑھتے اترتے دیکھا ہے امی آپ نے۔ ہائی واوے کتنا وزن کم ہوا؟"

"تائی امی!" دریشہ بری طرح روہانسی ہو گئی اور پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

"تمہیں اس کے وزن کی اتنی فکر کیوں ہے۔ تمہیں اٹھانا ہے کیا وزن؟" امی نے عاذان کے کان کھینچے۔

"لاحول ولا کہیے۔ میں ہاڈی بلڈر ہوں، ویٹ لفٹر نہیں۔ یہ وزن تو کرین ہی اٹھائے گی۔"

اس کے ساتھ ہی وہ جھپٹ ماں کے پہلو سے کھسک لیا۔ سائرہ بیگم ماتھا پیٹتی رہ گئیں۔

☆☆☆

اس نے رو رو کر آنکھیں ہی کیا ناک بھی سجالی تھی۔ اسی رفتار سے وہ پکوڑے اتار رہی تھی اور اسی رفتار سے آنسو بہا رہی تھی۔

"میری بھی کیا زندگی ہے۔ صبح سے لے کر رات تک کام ہی ختم نہیں ہوتے۔ رات بھی سکون سے نہیں کٹتی۔ کسی کو باتھ روم جانا ہے تو آپی کو اٹھایا جائے گا۔ کسی کو ڈرگ رہا ہے تو آپی کے بستر میں گھس جائے گا۔ کسی کو آدھی رات کو بھوک لگ جاتی ہے پھر صبح سویرے اٹھنا۔ امی کی دوا، بچوں کو اسکول بھیجنا، پھر سارے گھر کا کام۔ بہن بھائیوں کے اسکول سے گھر آنے تک جلدی جلدی کھانا تیار کرنا، شام کو سب کو ہوم ورک کرانا۔ سب کی چیزیں چیک کرنا۔ امی تو پیدا کر کے بے فکر ہی ہو گئیں

کٹ کی ٹیم اکٹھی کرنا ہی فرائض منصبی میں شامل تھا اور ابو۔ انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا بچہ کس کلاس میں پڑھ رہا ہے۔ بس بچوں کی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں، وہی کافی سمجھنے کے شروع میں وہ لگا بندھا خرچ امی کے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں۔ امی جوازل سے کنجوس کی مالک ہیں سوائے بچے پیدا کرنے کے۔ انہوں نے کبھی فراخ دلی کا ثبوت نہیں دیا اب بھی بلڈ پریشر اور شوگر کی وجہ سے ڈاکٹر حضرات زور نہ دیتے تو ابھی یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ان کے خیال بچے انہیں بخشوانے کا ذریعہ ہیں۔

نجانے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس فوج میں سب سے پہلے کیوں بھیج دیا تھا۔ باقی سات ہر نئے ماڈل کی طرح بدل بدل کر آتے رہے بس میری طبیعت کی انکساری اور جذبۂ خدمت کی اس گھر کا نظام چل رہا ہے، وگرنہ گھر کا نقشہ ایتھوپیا کے قحط زدگان سے کم دکھائی نہ دے۔ وقت کھانے پہ جو ماتم ہوتا ہے۔ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید قائداعظمؒ نے یہ قول میرے تھا کام۔ کام اور صرف کام لیکن اتنے کام کے باوجود۔ وزن کم نہیں ہوتا۔ کوئی اور لڑکی میری ہوتی تو سوکھ کر کانٹا بن چکی ہوتی ایک میں ہی منحوس نہیں گھٹتی۔"

"میرا خیال ہے با آواز بلند بہت سوچا جا چکا ہے، اس سے قبل یہ وہی لسی بن جائے۔ برتن ڈال لیجیے۔"

عاذان مشینوں کی سی صورت بنائے سامنے کھڑا تھا۔

اس کا جی جل کر راکھ ہو گیا۔ اس سے قبل وہ اپنا جلال اس پر اتارتی۔ وہ بڑے سکون سے بولا۔

"تم یہ مت سمجھنا میں وہی دینے آیا ہوں۔ تمہارے پکوڑوں کی خوشبو مجھے باہر تک آ رہی ۔ میں نے سوچا نیکی کرنی چاہیے۔ اگر تم یہ سارے پکوڑے کھا گئیں تو مزید موٹی ہو جاؤ گی۔ سو ا مدد کرنے آیا ہوں۔"

دریشہ کے تو آگ لگ گئی۔ جیسے ہی عاذان نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کھینچ کر کفگیر اس کی پلیٹ پر دھر دیا گرم گرم کفگیر پلیٹ پہ کیا لگا جو عاذان کی آہ و بکا شروع ہوئی امان الحفیظ۔ سارا ہی گھر اکٹھا ہو گیا۔

فاطمہ بیگم صورت حال سے واقف ہوتے ہی بیٹی پہ برس پڑیں۔ گھر کے سب بچے عاذان کے ساتھ ہمدردی کرنے لگے۔

"چچی جان! مہمانوں کے ساتھ آپ کے گھر میں ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔" عاذان موقع سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"ارے میرے بچے! تو مہمان کیوں ہونے لگا۔ پاگل ہو گئی ہے یہ تو....."

"دراصل عاذان بھائی! آپی ہمیں ہر وقت مارتی رہتی ہیں نا۔ اس لیے ان کے ہاتھ کنٹرول سے باہر ہو گئے ہیں۔"

"تم چپ کر دسیفی۔"

"دریشہ! عاذان کے لئے دودھ بنا کر لاؤ۔"

"نہیں۔ نہیں۔ میں تو پکوڑے کھانے آیا تھا۔"

"لیکن افسوس زخم کھانا پڑا۔" سیفی نے لقمہ دیا۔

"تم سب انتہائی نکمے اور سست ہو۔ ادھر آؤ میرے بیٹے۔"

فاطمہ بھتیجے کو اپنی ہمراہی میں برآمدے میں لے آئیں۔ اس کے زخم پہ برنال لگایا اور پھر اس کے آگے سارے ہی پکوڑے رکھ دیے۔

اب بچوں کا ہم غفیر تھا اور عاذان تھا۔ دوسرے ہی لمحے سب پچھلی بات کو بھول کر موسم اور پکوڑوں سے انجوائے کر رہے تھے۔

دریشہ اس صورتحال پہ جلتی کڑھتی اپنے کمرے میں آ گئی اور اپنا پسندیدہ ناول پڑھنے لگی کہ یہی اس کی کوفت کو دور کرنے کا ذریعہ تھا۔

☆☆☆

"آہ۔ ہا۔ بڑی خوشبوئیں آ رہی ہیں، لگتا ہے مچھلی فرائی کی جا رہی ہے۔" ولید حسن جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے نیناں کو گود میں اٹھا لیا۔

"اتنے گندے کپڑے کر رکھے ہیں اور پاؤں دیکھو کیسے کیچڑ میں لت پت ہو رہے ہیر آپ کی مما یقیناً کچن میں مصروف ہوں گی۔" وہ بولتے ہوئے کچن میں آ گئے، جہاں نائلہ پسینے شرابور تھیں۔

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ کم از کم ایگزاسٹ ہی آن کر لیتیں۔"

"ایگزاسٹ بھی آن ہے اور کھڑکی بھی کھلی ہوئی ہے۔"

"لیکن چولہے کی گرمی توا سے سی کی ٹھنڈک نہیں بن سکتی۔"

"جلدی سے چینج کر لیجئے۔ آپ کی پسندیدہ ڈش تیار ہے۔" نائلہ نے کہا۔

ولید نے اپنے حلیے پہ نگاہ ڈالی اور پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔ "بارش نے اتنا موقع..... نہیں دیا کہ گاڑی میں ہی بیٹھ جاؤں تا بوتوڑ حملہ کر دیا۔ ستیاناس کر کے رکھ دیا کپڑوں کا۔"

نائلہ ہنسنے لگی۔

"چلیے کسی نے تو آپ کو گندا کیا۔" ولید بھی ہنس پڑے۔

فریش ہو کر نکلے تو کھانا تیار تھا۔ بچے بھوک سے بے چین ہو رہے تھے۔

"میرا خیال ہے اس حبس زدہ ماحول میں بیٹھ کر کھانا اس موسم کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ایسا کرتے ہیں چھت پر چلتے ہیں یا پھر لان میں آ جائیے۔"

"نہیں بھئی! بوندا باندی ابھی جاری ہے۔ کپڑے پھر گندے ہوں گے۔" ولید حسن نے انکار کر دیا۔ نائلہ منہ بسور کر رہ گئی۔

"چلو ایسا کرتے ہیں برآمدے میں ٹھیک رہے گا۔" ولید نے درمیانی تجویز نکالی۔

"آپ کو بالکل موسم انجوائے کرنا نہیں آتا۔" نائلہ جلدی جلدی کھانا کھاتے ہوئے بولی۔

"آپ کو دیکھ لیتے ہیں، سارے موسم انجوائے ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کے تو سارے موسم بس مجھ سے شروع ہوتے ہیں اور مجھ پہ ختم۔ بھلا میں کون سا موسم ہوں؟" نائلہ نے اترا کر پوچھا گویا دانستہ اپنی تعریف کرانا چاہتی ہو۔

"ویسے تو موسم بہار ہو لیکن جب پیار برسانے پہ آتی ہو تو موسم برسات بن جاتی ہو۔ مگر مجھے برسات کا موسم زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ ہر چیز گندی کر دیتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو، صبح لان کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ اب جگہ جگہ پانی کھڑا ہے۔ سارے پھول ٹوٹ کر ادھر اُدھر گر گئے ہیں۔"

"مجھ سے پوچھیے تو لان اب زیادہ خوبصورت لگ رہا ہے۔ ایک دم دھل کر نکھر گیا ہے، پرانے خزاں رسیدہ پتے اور پھول جھڑ کر گر گئے ہیں۔ نئے پتے اور کونپلیں ہوا کے ساتھ جھوم رہے ہیں۔ زندہ دل لوگوں کی طرح شاد آباد۔"

"یعنی آپ کی طرح....." ولید حسن نے لقمہ دیا۔ نائلہ ہنسنے لگی۔

بچے مچھلی سے الجھ رہے تھے۔

"ارے بھئی۔ بچوں کے حلق میں کانٹے پھنس جائیں گے۔ کچھ ادھر بھی توجہ دو۔"

"یہ بڑی مصیبت ہے۔ پہلے صاحب کو صاف کر کے دو پھر بچوں کو۔" نائلہ اپنا لقمہ چھوڑ کر بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"بچوں کو آپ کی توجہ کی بہت ضرورت ہے۔ کل میں ان کی کاپیاں چیک کر رہا تھا، دو روز تک مسلسل ہوم ورک نہیں ہوا۔"

"ہاں۔ بارش کی وجہ سے ان کے ٹیوٹر نہیں آئے۔"

"تو آپ کو توجہ دینی چاہیے نا۔"

"ولید! سارا دن گھر کے کام کاج میں کہاں اتنی فرصت ہوتی ہے کہ بچوں کے ساتھ بھی سر کھپایا جائے۔"

"گھر کے کام تو ساری عورتیں کرتی ہیں، یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ نیناں کے ناخن دیکھے ہیں کتنے بڑھے ہوئے ہیں۔"

نائلہ نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا، واقعی ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ وہ شرمندہ ہوگئی۔

"سوری۔ دراصل مجھے خیال نہیں رہا۔ میں کھانے کے بعد کاٹ دوں گی۔"

"آپ کو اکثر چیزوں کا خیال نہیں رہتا۔ ٹیپو سے پوچھیے، اس کے بازو پہ چوٹ کیسے لگی؟"

"فٹ بال کھیلتے ہوئے۔"

"مگر اس نے تو مجھے بتایا کہ یہ کلاس میں ڈائس پہ چڑھتے ہوئے گرا تھا۔" ولید نے جرح کی۔

"اچھا!" نائلہ نے لاپروائی سے کہا۔ "شرارتی بھی تو بہت زیادہ ہے۔ بالکل نہیں سنتا میری۔"

"ایک تعلیم یافتہ ماں کے منہ سے ایسی تاویل اچھی نہیں لگتی۔ آپ بچوں پر توجہ دیا کریں۔ اسے جھوٹ بولنا بھی آ گیا ہے۔ آپ کو فٹ بال کا کہا اور مجھے ڈائس کا' ہوسکتا ہے کوئی تیسری وجہ ہو۔"

"کم آن ولید! آپ تو بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ بچے ایسی آنکھ مچولی کرتے رہتے ہیں۔ اب خدانخواستہ میرا بیٹا کسی کا قتل تو نہیں کر کے آیا۔"

"نائلہ! یہ بچوں کی تربیت کا دور ہے' ان کی عادتیں ابھی سے پختہ ہوں گی تمہاری غفلت میری نسل کو برباد کرسکتی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

نائلہ حق دق رہ گئی۔

"آئی ایم سوری! کھانا تو کھا لیجیے۔"

"بس میں نے کھا لیا۔ آپ بچوں کو کھلا کر چائے بنا دیجیے گا۔"

نائلہ کا دل بجھ گیا اس نے کتنی محنت کی تھی۔ وہ بے دلی سے کھانا کھانے لگی۔ پھر جلد ہی اس نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

وہ چائے بنا کر بیڈ روم میں آئی تو ولید کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ نائلہ نے ایک کپ ولید کے سامنے رکھ دیا اور ایک کپ خود اٹھا لیا۔

"تھینک یو۔" وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پہ ذرا بھی پچھلی بات کا عکس نہیں تھا جبکہ نائلہ مکمل طور پر پچھلی بات کے زیر اثر نظر آ رہی تھی۔

"بچے سو گئے؟"

"نہیں، ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔"

"ہمیشہ کی طرح مچھلی بہت مزے دار بنی تھی۔"

(جب ہی آپ نے اتنا کھایا کہ میرا ابھی پیٹ بھر گیا۔)

"نجانے کیا بات ہے۔ میں جلدی تلخ ہو جاتا ہوں۔"

"شکر ہے۔ آپ کو اپنی اس خوبی کا اندازہ ہے۔" نائلہ کا لہجہ تلخ تھا۔ ولید اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔

"تم جانتی ہو، مجھ سے بے ترتیبی بالکل برداشت نہیں ہوتی۔ میں جس جگہ صبح تاول ٹانگ کر جاؤں اگر مجھے شام کو وہاں نہ ملے۔ تو مجھے غصہ آ جاتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ جو اپنی ذرا ذرا سی چیز کے لئے بیویوں کو پکارتے ہیں۔ اب یہ لا دو۔ اب وہ دے دو۔ یہ کہاں ہے اور وہ کہاں ہے۔ مجھے سخت کوفت ہوتی ہے ایسے جملوں سے۔ میں اپنی ذات پہ انحصار کرنے والا شخص ہوں اور تم جانتی ہو، اگر میری ہر چیز مجھے میرے مقام پہ مل جائے تو میں تمہیں تنگ بھی نہ کروں۔"

"لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے۔" نائلہ نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔ "اب آپ کی زندگی میں بچے بھی شامل ہیں اور بچے فی الحال توازن اور غیر توازن سے ناواقف ہیں۔ میں اپنی ذات سے ہر چیز ترتیب سے اس کی جگہ پر رکھ سکتی ہوں لیکن یہ ممکن نہیں کہ بچے بے ترتیبی نہ کریں۔"

"مجھے تمہاری اس بات سے اختلاف ہے۔ بچے سیکھنے کی عمر میں ہیں جو کچھ ہم سکھائیں گے وہی تو سیکھیں گے اور پھر کہا جاتا ہے بچے ماں باپ کی عادتیں لیتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ بچے میری عادتیں بالکل نہیں لے رہے اور تمہاری عادتیں اپنا رہے ہیں۔" نائلہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

"میں یہ نہیں کہتا تمہاری طبیعت میں سہل پسندی ہے۔ ہاں لاپروائی کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہی لے لو۔ آج تک تم نے کبھی کسی بوتل کا ڈھکن صحیح طرح بند نہیں کیا۔ اکثر تم کپڑے نکال کر وارڈ روب کھلا چھوڑ دیتی ہو۔ کوئی دراز، کوئی اٹیچی تم صحیح بند نہیں کرتیں۔"

"ولید! یہ سب جلدی میں ہوتا ہے۔ ادھر بچوں کو اسکول جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ادھر آپ کو آفس جانے کی اور پھر میں سب کچھ بعد میں کور کر لیتی ہوں۔"

"یہی بات میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ اگر تم وقت پہ یہی سب کچھ کر لو تو اس طرح بچوں پہ اچھا اثر پڑے اور انہیں بھی ہر چیز سنبھال کر رکھنے کی عادت پڑ جائے۔"

نائلہ لاجواب ہوگئی تھی یا زچ ہوگئی تھی۔ بہرحال وہ خاموش ہوگئی۔ اور ذرا توقف سے بولی۔

"ولید! آپ کو معلوم ہے میں تعلیم سے ابھی فارغ ہی ہوئی تھی کہ والدین نے شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ میں نے ہر قسم کی گھرداری میں دلچسپی شادی کے بعد لی ہے، وہ بھی شاید آپ کی وجہ سے۔ شاید آپ کی آئیڈیل بیوی وہی ہو سکتی تھی جو گھریلو امور میں طاق اور چاق و چوبند ہو۔ میں اول دن سے ان ہی کوششوں میں لگی ہوئی ہوں لیکن پھر بھی مجھ سے بہت سی کوتاہیاں ہو

جاتی ہیں۔ شاید یہ سب کچھ میرے لیے کچھ آسان ہو جاتا اگر میں کچھ عرصہ اپنی ماں کی زیرِ نگرانی رہتی۔ آپ جانتے ہیں میرے والد فوج میں تھے۔ ڈسپلن فوج کا سب سے پہلا اصول ہے۔ ہمارے گھر میں بہت لگی بندھی زندگی تھی بلکہ ہمارے گھر میں صرف ٹھاٹھ تھے اور اصول تھے۔ اس کے سوا کوئی تیسری چیز نہیں تھی میں اس بات کا اقرار کرتی ہوں۔ مجھے ڈیڈی کے اصولوں سے بغاوت کرنے میں لطف آتا تھا۔ میں نے کبھی۔ ان کی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ ماسوائے نماز کی عادت کے۔ شاید میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی اور گھر بھر کی رونق، اس لیے میری غلطیوں کو سب نظر انداز کر دیتے تھے۔

لیکن یہاں آ کر احساس ہوا۔ یہی لاپروائی میری سب سے کمزوری ہے۔ میں ہر ممکن اپنی کمزوریوں پہ غالب آنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں لیکن انسان ہی تو ہوں۔ کوتاہی ہو ہی جاتی ہے۔"

ولید نائلہ کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ خاموش ہوئی تو وہ تھوڑا سا مسکرا دیے۔

"مجھے تمہاری یہی عادت اچھی لگتی ہے کہ تمہیں اپنی شخصیت کا پورا ادراک ہے اور تم اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہو لیکن مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ تم بچوں کے سامنے بار بار سوری کا لفظ استعمال کرو۔ بچوں کے سامنے میں کبھی تمہیں آپ کے بغیر مخاطب نہیں کرتا۔ پھر میں کیسے یہ بات گوارا کروں کہ میری عزیز از جان بیوی مجھ سے حیثیت میں بار بار کم ہوتی رہے۔"

انہوں نے رسان سے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"آئی ایم سوری۔ میرا رویہ تمہیں ڈس ہارٹ کر دیتا ہے۔"

نائلہ شکوہ بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"ہماری زندگی میں سوری کے سوا کوئی دوسری چیز ہے۔"

"ہاں!" ولید جھٹ بولے۔ اس سے پیشتر وہ کسی گستاخی کا ارتکاب کرتے، ڈور بیل بجی۔ دونوں ہی متوجہ ہو گئے۔

"اس وقت کون آ گیا۔ رقیب روسیاہ نہ ہو تو۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے۔ نائلہ کو ہنسی آ گئی۔ دوسرے ہی پل عاذان ولید کے ہمراہ آ رہا تھا۔

"السلام علیکم چاچی جی!" نائلہ نے گھور کر دیکھا۔

"تم باز نہیں آؤ گے۔ اس لفظ سے؟"

"لیجیے چاچو! اب ذرا آپ ہی تصفیہ کیجیے۔ چاچی کو چاچی نہ کہوں گا تو کیا چی، کہوں۔"

"بھئی، ہماری اتنی اسمارٹ اور کم عمر بیوی پہ یہ لفظ واقعی سوٹ نہیں کرتا۔"

"تو پھر آنٹی ٹھیک رہے گا۔"

"اوں۔ ہوں۔" ولید نے انکار کیا۔

"ٹھیک ہے تو پھر کیلی، سب سے زیادہ مناسب ہے۔ کیلی! یہ امی نے آپ لوگوں کے لیے حلوہ بھیجا ہے۔"

ولید اور نائلہ دونوں ہی ہنس پڑے۔

"بے وقوف!" نائلہ کہتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

"بھئی عاذان! اگر تم نے نائلہ کو کیلی بنایا تو میں تم پہ سخت نگاہ رکھوں گا۔" ولید نے ہنس کر ارنگ دی۔

"فار گاڈ سیک!" عاذان خود بھی ہنس پڑا۔ "چاچو کا اتنا سا دل ہے۔"

"جب اتنی خوبصورت بیوی ملے گی تو تمہارا دل بھی اتنا سا ہو جائے گا۔" ولید نے ہنستے ہوئے رازداری سے کہا۔ عاذان دل کھول کر محظوظ ہوا۔

اتنے میں نائلہ اس کی تواضع کا سامان لے آئی۔

"واؤ۔ فنٹاسٹک۔ فرائی فش۔" وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔

"ذرا آہستہ۔ کہیں کانٹا نہ پھنس جائے۔"

"آہ۔ ہا۔ کانٹا تو چبھ چکا۔ مگر نکالے کون؟"

"کیا مطلب؟" نائلہ حیران ہوئی۔

"اس کانٹے کا نام کیا ہے؟" ولید فوراً سمجھ گئے۔

"تایا جان کی نمبر ون سپوتی۔ مریم جوا حسن۔" اس نے دھڑلے سے بتایا۔

"نان سینس۔ وہ تم سے چار برس بڑی ہے۔"

"خواب اور محبت حیثیت نہیں دیکھتے۔" نائلہ نے فوراً عاذان کی حمایت کی۔

"کتنا اَن بیلنس لگے گا سب کچھ۔" ولید نے بیزاری سے کہا۔

نائلہ خاموش ہو گئی۔

(بیلنس تو آپ کی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔)

"بھئی عاذان! میں تو یہی مشورہ دوں گا۔ لڑکا بڑا اور لڑکی چھوٹی ہی اچھی لگتی ہے۔ اب ہماری جوڑی ہی کو دیکھ لو۔" وہ تفاخر سے گویا ہوئے۔

عاذان ہنس پڑا۔

(آپ سے مشورہ کون مانگ رہا ہے۔ بات تو مشورے کی حد سے باہر جا چکی ہے۔)

"محبت مشورہ کر کے نہیں ہوتی۔" وہ جرأت سے بولا۔

نائلہ ہنستے ہوئے وہاں سے کھسک لی۔ وہ جانتی تھی۔ عاذان بھی ان ہی کا خون ہے۔ ممکن ہے کہ بات نہ منوا سکے۔

☆☆☆

صبح کی تازہ ہوا سبک روی سے چل رہی تھی۔ پچھلی ایک رات اور ایک دن مسلسل بار کے بعد آسمان کی نیلاہٹ اور بھی حسین لگنے لگی تھی۔ سورج کی روشنی بھی مدھم تھی۔ قوی امکان تھوڑی دیر تک دور دور منڈلاتی سرمئی بدلیاں۔ یکجا ہو کر سورج کو اپنی آغوش میں چھپا لیں گی اور جو چھاجوں چھاج مینہ برسے گا۔ تو دھرتی جل تھل ہو جائے گی۔

وہ لان میں کھڑی چنبیلی کے پھول توڑ رہی تھی۔

"السلام علیکم!" مریم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ صبح کی طرح نکھرا ستھرا سامنے کھڑا تھا۔

"صبح بخیر۔" وہ شگفتگی سے بولی پھر مصروفیت سے گویا ہوئی۔

"تم روزانہ صبح مجھے سلام کرنے کیوں آتے ہو؟"

"اس لیے کہ سلام کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"اپنے بزرگوں کو سلام کیا کرو۔ ہوسکتا ہے ان کی دعاؤں سے تمہیں کچھ مل جائے۔"

"آپ کا رویہ بھی تو میرے ساتھ بزرگانہ ہی ہوتا ہے۔" وہ جل کر بولا۔

"کیوں۔ کیا میں تم سے بڑی نہیں ہوں؟"

"مگر بزرگ تو نہیں ہیں۔ ہاں لیکن یہ بزرگانہ لباس یعنی یہ سفید رنگ آپ پہ بہت کر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے......"

"جیسے میں کوئی بڑھیا ہوں۔"

"نہیں۔ جیسے پرستان کی پری زمین پہ اتر آئی ہو۔"

"شکریہ۔" مریم نے نرمی سے کہا۔

عاذان تلملا گیا۔

"آپ نے تو ایسے شکریہ کہا ہے جیسے کسی بچے نے ٹیچر کی تعریف کی ہو۔"

"تم بھول گئے ہو شاید۔ میں تمہاری ٹیچر بھی رہ چکی ہوں۔"

(اگر آپ دنیا میں پہلے آ گئی تھیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔) اس نے جز بز ہو کر سوچا۔

"ایک کام کر دو۔ ہما اور فائزہ کو کالج چھوڑ آؤ۔"

"کیوں۔ آپ یونیورسٹی نہیں جا رہیں؟"

"نہیں۔ بس جی نہیں چاہ رہا۔"

"شکر الحمدللہ! آپ کا بھی چھٹی کرنے کو جی چاہا ویسے آپ کو سال کے آخر میں چھٹی نہ کرنے پہ ٹرافی تو ضرور ملتی ہوگی۔"

مریم نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" وہ ذرا سنجیدہ ہو گیا۔

"ہوں۔"

"پڑھنا آپ کا شوق ہے یا مجبوری؟"

"دونوں ہی..... تمہیں معلوم ہے ابو کی ڈیتھ کے بعد ہم لوگ کتنے اکیلے رہ گئے ہیں۔ کوئی بھائی ہوتا تو شاید ایسا نہ سوچتی لیکن اب مجھے نوکری کرنی ہے اور میری تعلیم کا یہ آخری سال ہے۔"

"آپ نوکری کریں گی؟"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟" مریم کے چہرے پہ وہی سکون تھا۔

"جانتی ہیں آپ کس خاندان کی لڑکی ہیں۔ کیا ایسا پہلے کبھی ہوا ہے کون اجازت دے گا۔"

"میرے حالات مجھے اجازت دیتے ہیں۔" مریم کا انداز ہنوز تھا لیکن عاذان بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

"تایا جان کتنا کچھ چھوڑ کر گئے ہیں آپ سب کے لئے، کیا وہ کافی نہیں ہے اور پھر بڑے ابا تو ہرگز نہیں مانیں گے۔"

مریم خاموش ہو گئی جیسے اس نے ٹال دیا ہو۔

عاذان کا دل چاہا کہ اسے جھنجھوڑ دے اور پوچھے تم مجھے بچہ کیوں سمجھتی ہو۔ کیا میں اتنا ناکارہ اور بے وقوف ہوں کہ تم مجھ سے کچھ شیئر نہیں کر سکتیں۔

اتنے میں ہما اور فائزہ اندر سے آتی نظر آئیں۔ فائزہ مڈل کر رہی تھی اور ہما نے انٹر میں داخلہ لیا تھا۔

"آپی! آپ یونیورسٹی نہیں جا رہیں؟"

"نہیں۔ میرا جی نہیں چاہ رہا۔ آج تم لوگوں کو عاذان چھوڑنے جائے گا' امی سے گاڑی کی چابی لے آؤ۔"

عاذان خاموشی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا جبکہ مریم کھڑی پھول چنتی رہی۔

☆☆☆

"اب تمہارا زخم کیسا ہے؟"

وہ مریم کی باتوں میں الجھا ہوا تھا، تب ہی دریشہ کی آواز پہ چونک گیا۔

"کیوں؟ کیا نمک چھڑکنا ہے؟" وہ جل کر بولا۔

"کبھی تو سیدھے منہ بات کرلیا کرو۔" وہ شرمندہ نظر آرہی تھی۔

"آخر چکر کیا ہے؟" اس نے دریشہ پہ گہری نگاہ ڈالی اور پھر اس کی سج دھج سے فوراً بجھ گیا۔ یقیناً کہیں جانے کا پروگرام تھا۔

اسے اپنی طرف اتنی محویت سے تکتا دیکھ کر دریشہ اترا گئی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

"موٹا انسان کچھ بھی پہن لے، صرف موٹا ہی لگتا ہے اور کچھ نہیں۔ اور تم مجموعی طور صرف موٹی ہو۔"

حالانکہ وہ موٹی نہیں تھی۔ البتہ عام لڑکیوں کی نسبت بھرے بھرے جسم اور گول چہرے بدولت صحت مند لگتی تھی۔ رنگ گورا اور بھوری آنکھیں تھیں۔

دریشہ کلس کر رہ گئی۔ لیکن اسے اپنا مطلب تھا سو چاپلوسی سے بولی۔

"خیر اس بات کو چھوڑو۔ مجھے ذرا میری سہیلی کے ہاں تو چھوڑ آؤ۔"

"سبحان اللہ۔ مجھ سے کام نکلوانے کا کتنا عرصہ پہلے ٹھیکہ پاس کرایا تھا۔ چلو یہاں سے میں نہیں جاتا۔ جاؤ جا کر اپنے بچے سنبھالو۔"

"اپنے بچے؟" وہ چیخ پڑی۔

"یعنی اپنے سات عدد چھوٹے بہن بھائی۔"

"اگر میرے اتنے سارے بہن بھائی ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"قصور تو بابا بلھے شاہ کا ہے۔" وہ جھٹ بولا۔

اسی لمحے ببلو اور نکی روتے ہوئے آئے۔ ان کے پیچھے پانچ کی اور فوج تھی۔

"کیا ہوا؟ کچھ پتا تو چلے۔" دریشہ پریشان ہوگئی۔

جبکہ عاذان کے گھر والے بھی اکٹھے ہوگئے تھے۔

"آپی! ببلو نے ناک میں کاغذ ٹھونس لیا تھا۔" سیفی نے اٹکتے ہوئے بتایا۔ "ہم نے نکالنا چاہا مگر وہ اور اوپر چلا گیا، ہم نے گیلری میں عاذان بھائی کو دیکھا تو انہیں بتایا کہ ببلو نے ناک میں کاغذ ٹھونس لیا ہے۔ کیا کریں۔ عاذان بھائی نے ترکیب بتائی ماچس کی تیلی جلا کر ناک میں لگالو۔ کاغذ جل کر نیچے گر جائے گا۔"

"اوہ...... مائی گاڈ!" دریشہ چکرا گئی۔ "تم نے ایسا کیا تو نہیں۔"

"نکی نے ایسا ہی کیا۔ ماچس سلگا کر ناک پہ لگادی۔ اس کی ناک جل گئی۔"

"ناک تو اس کی جلی ہے مگر نکی کیوں رو رہی ہے؟"

"امی نے اسے بہت مارا اسی لیے رو رہی ہے اور امی آپ کو بلا رہی ہیں۔ ہم سب اس لیے آئے ہیں۔"

دریشہ کا دل چاہا کہ اپنا سر دیوار میں مارے۔ دو پل کا بھی سکون نہیں سب کو ہوم ورک کرتا چھوڑ کر آئی تھی اور یہ قیامت برپا ہوگئی۔

وہ اپنا غصہ ضبط کرتی، اپنی پلٹن کے ساتھ پلٹ گئی۔

بچوں کی قطار کے ساتھ اسے جاتا دیکھ کر عاذان ہمیشہ کی طرح شرارت سے گانے لگا۔

کٹ کٹ کرتی آئی مرغی
اپنی فوج کو لائی مرغی
فوج میں اس کے بچے سارے
ننھے منے پیارے پیارے

"عاذان بھائی۔ کبھی وقت کی سنگینی کا بھی خیال کرلیا کیجیے۔" مشعال نے جاتی ہوئی دریشہ کو ترحم سے دیکھا۔

"ببلو کی ناک جل گئی ہے۔ آپ کو یہ شرارت کرنے سے پہلے سوچ تو لینا چاہیے۔ امی کو معلوم ہوگیا تو بہت ناراض ہوں گی۔"

"ارے چھوڑو۔ ان کا تو روزانہ کا معمول ہے۔ پہلے تو ہر چیز پہ ریسرچ کرتے رہیں گے پھر جو چیز سمجھ میں نہیں آئے گی اسے ناک میں ڈال لیں گے۔ تمہیں یاد ہے اس سیفی صاحب نے خود ناک میں آٹھ آنے کا سکہ ڈال لیا تھا۔ وہ بھی کلاس روم میں بیٹھے ہوئے۔ نجانے کیوں ان بہن بھائیوں کو اپنی ناک ہی سب سے محفوظ جگہ معلوم ہوتی ہے اور کس مشکل سے وہ سکہ نکلا تھا۔ ہاسپٹل تک جانا پڑ گیا تھا اچھا کیا میں نے۔ ببلو کا یہ عبرت ناک انجام دیکھ کر آئندہ کوئی ایسا نہیں کرے گا۔"

"بھائی! افسوس کی بات ہے۔"

"زیادہ افسوس نہیں کرو۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے، کھانا نکال دو۔ ان کی مدد کے لیے میں ظفر کو بھیج رہا ہوں۔"

مشعال چپ چاپ کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

صبح کی سفیدی پھوٹ کر چاروں طرف پھیل گئی تھی لیکن موسلا دھار بارش جاری تھی۔ ملتان میں اس نے ساون اتنا ٹوٹ کر برستے کم دیکھا تھا ورنہ یہاں گرمی اور گرد کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شادی کے

سے پہلے وہ کبھی ملتان نہیں آئی تھی لیکن ... بیاہ کر آئی تھی، کبھی ملتان سے باہر نہیں گئی تھی۔

بارش کا منظر کتنا خوبصورت ... جیسے کوئی جیون ساتھی پیار لٹا رہا ہو۔

ساری کونپلیاں دھل کر نکھر گئی تھیں۔ درخت اور پودے ہوا سے جھوم رہے تھے۔

پھولوں کا موسم تھا۔ چڑیوں کے گیت تھے۔ کوئلوں کی کوکو تھی۔ جنگلی کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور برستی ہوئی ننھی ننھی بوندیں۔ سب ہی تو اس کے ہمراز تھے۔ اس کے دوست تھے۔

وہ آسمان پہ بنتی قوس قزح کی لکیر کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی دو مضبوط بازو نرمی سے اس کے گرد حمائل ہو گئے اس نے کسمسا کر دیکھا۔ وہ ولید کی سپردگی میں تھی۔

''میں ابھی آپ کو جگانے ہی والی تھی۔''

''ان زلفوں میں کھو کر جاگنے کا دل نہیں کرتا۔''

''کیا کرتے ہیں۔ میرے بال کھینچ رہے ہیں۔'' وہ نرمی سے الگ ہو گئی اور بالوں میں برش کرتے ہوئے بولی۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے امی کا فون آیا تھا۔''

''اتنی صبح۔ خیریت تو تھی؟''

''ہاں، خیریت ہی تھی۔ امی بتا رہی تھیں وہ لوگ بڑے بھیا کے پاس سوات جا رہے ہیں۔ کچھ عرصہ کے لیے۔ نیناں اور ٹیپو کو بھی ساتھ لے جانے کا کہہ رہی تھیں۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''ہمیشہ والا جواب۔ اگر آپ چاہیں گے تو ضرور بھیج دوں گی۔''

ولید خاموش ہو گئے۔

''کیا آپ کو میری بات بری لگی؟''

''میرا خیال تھا کہ آپ بہتر جج کر سکتی ہیں اور زیادہ بہتر یہ ہوتا آپ خود ہی جواب دے دیتیں۔ ہم اپنے بچوں کو دوسروں کے ساتھ کیوں بھیجیں۔ کیا ہم انہیں سیر نہیں کرا سکتے۔''

''وہ ان کے نانا نانی ہیں۔ دوسرے کیوں ہونے لگے۔'' نائلہ کو برا لگا۔

''مگر میں نہیں چاہتا کہ ہمارے بچے کسی پہ بوجھ بنیں پھر ان کی پڑھائی کا بھی حرج ہو گا۔ تھوڑا سا بڑے ہو جائیں، ہم خود انہیں سیر پہ لے جائیں گے تاکہ انہیں یاد رہے۔''

اس کے بعد وہ باتھ روم میں چلے گئے۔ نائلہ خاموشی سے کچن میں آ گئی۔

''اور بھئی سہیلی! کیا حال ہے؟'' عاذان اچانک نمودار ہوا۔

''وہی ہڈی وہی کھال ہے۔'' وہ بے دلی سے بولی۔

''خیر ہے۔ کہیں صاحب سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔''

(روزانہ ہی ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ میں خود ہی مفاہمت کر لیتی ہوں لیکن کیا شادی ا چیز کا نام ہے ایک منواتا رہے اور ایک مانتا رہے۔)

''کہاں کھو گئیں؟''

''کہیں نہیں۔ چائے پیو گے؟''

''میں تو بہت جلدی میں ہوں۔''

اتنے میں ولید بھی کچن میں آ گئے۔

''دراصل میں آپ لوگوں کو دعوت دینے آیا تھا۔ ہم سب بڑے ابا کی طرف جا رہے ہیں۔ پکنک پارٹی عاذان کی طرف سے ہو گی۔''

''ہاں۔ تمہارے تو باپ کا باغ ہے ناں۔''

''ارے چاچو۔ باپ کا نہیں دادا کا تو ہے۔''

''لیجیے۔ آپ نے سیر کا پروگرام بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دعا سن لی۔''

ولید نائلہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ تو وہ بس مسکرا دی۔ کیونکہ وہ بھی اس پروگرام پہ خوش تھی۔

☆☆☆

جواد حسن، فواد حسن، وحید حسن اور ولید حسن چاروں کی فیملیاں دیکھ کر فاروق حسن پھولے نہ سما رہے تھے۔ حویلی میں اچانک اتنی رونق ہو گئی تھی جیسے بارات اتر آئی ہو۔ وہ بیٹوں، بہوؤں پوتا پوتی سے مل کر آبدیدہ ہو گئے۔ ہمیشہ سب کو اکٹھا دیکھ کر وہ اپنے سب سے بڑے بیٹے جواد حسن کو بہت یاد کرتے تھے۔

اب بھی خوشی کے ساتھ ساتھ غم کی کھنک بھی شامل ہو گئی تھی۔

''ابھی عمر ہی کیا تھی اس کی اچانک ہارٹ اٹیک ہوا اور بھری جوانی میں چل بسا۔ جانے کے دن تو میرے تھے۔ بچیوں کی طرف دیکھتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اگر بچیوں کی تعلیم کا سوال نہ ہو تو میں طاہرہ بیٹی کو کبھی شہر میں رہنے نہ دیتا۔ یہاں اپنے پاس رکھتا۔ لیکن یہاں نہ اچھے اسکول ہیں نہ ہی بہتر ہسپتال۔ بجلی اور گیس بھی ابھی کچھ عرصہ قبل ہی آئی ہے۔ اور تم لوگ تو جانتے ہی ہو یہاں کی سہولتیں کیسی ہیں۔''

''بڑے ابا! ہم تو خود چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے پاس شہر میں آ جائیں۔''

عاذان نے ماحول کی افسردگی سے الجھن محسوس کی تو جھٹ کہا۔

''نہیں بچے! زندگی کی چند سانسیں ہیں۔ اپنے مقام پہ پوری ہو جائیں وہی کافی ہے۔

مجھے شہر کی زندگی راس بھی نہیں آتی۔ جب بھی جانا ہوا بیمار ہی ہوا۔"

"بہت خیال آتا ہے اس بات کا کہ آپ بڑھاپے میں اتنی اولادوں کے ہونے کے باوجود تنہا رہ رہے ہیں۔ بچوں کے مستقبل کا سوال نہ ہوتو یہیں آ رہیں۔" فواد حسن نے کہا۔ ان کے آگے پیچھے سب ہی نے تائید کی۔

فاروق حسن ہنس دیے۔ بڑی نرم اور مشفق مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں سکون اور خوشیاں دے۔ بس بہو! طاہرہ کا اور بچیوں کا خیال رکھا کرو۔ تمہارا فرض بھی ہے اور اللہ بھی خوش ہوگا۔"

"آپ بے فکر رہیں بڑے ابا! میں ان کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ اتنا خیال تو شاید یہ خود بھی نہیں رکھتے۔ رات دن بس ان ہی کا خیال رہتا ہے مجھے۔" وہ مریم کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بے شک پوچھ لیجیے تائی جان سے۔"

اس کی بات پہ سب ہنس پڑے۔

"شکر ہے اداسی تو ختم ہوئی۔ بڑے ابا! ذرا یہ تو بتائیے یہ جو اتنے سارے بچے ہیں۔ بھلا کس کس کے ہیں؟" دریشہ نے ماحول کو مزید خوشگوار کرنے کے لئے پوچھا۔

فاروق حسن اپنا چشمہ ڈھونڈنے لگے۔

"آدھے تو تمہارے ہی ہیں۔" عاذان دریشہ پہ اب بھی چوٹ کرنے سے باز نہیں آیا۔"

"میرے؟" وہ چلائی۔

"ارے بھئی لڑتے کیوں ہو۔ جس جس کے ہیں، ہیں تو سب ہی میرے۔" بڑے ابا ہار مان لی۔ وہ صرف بڑے بچوں کی نشاندہی کر سکتے تھے، چھوٹوں پہ آ کر گڑبڑ کر دیتے۔

"ایسا ہے کہ کھانا تیار ہے، سب منہ ہاتھ دھولو۔ کھانا کھا کر پھر باتیں کرنا۔" ان کے حکم سب اٹھ گئے۔

کھاتے وقت گپ شپ ہوتی رہی۔ کھانا بہت لذیذ تھا، سب ہی نے جی بھر کر کھایا۔ کھانے کے بعد سب تاش کے پتوں کی طرح تقسیم ہو گئے۔

خواتین آرام کرنے کی غرض سے علیحدہ کمرے میں لیٹ گئیں۔

مرد حضرات نماز پڑھنے چلے گئے۔

بچے جھولوں اور پھسلنیوں پہ جھولنے لگے۔ نوجوان نسل ریسرچ پہ مامور ہو گئی۔

"یوں تو یہ حویلی روایتی ہے لیکن بڑے ابا کا انتخاب ولایتی ہے۔ لان میں سارے امپورٹڈ لگوا رکھے ہیں' آسٹریلیا کے طوطوں سے پنجرے بھرے پڑے ہیں۔ ہرن اور مور دیکھو۔

بھی امریکہ۔ مال لگ رہے ہیں۔"

"ارے بڑے ابا بڑی چیز ہیں۔ قسم سے اگر ابو کے بزنس کا سوال نہ ہوتو میں تو یہیں ڈیرہ ڈال لوں۔"

"اے سی کے بغیر تو صاحب کو نیند نہیں آتی اور یہاں اے سی کا لوڈ اٹھانے لائق بجلی نہیں۔ بڑے ابا خود اچھی آب و ہوا کی وجہ سے صحن میں سوتے ہیں، رات بھر تفتیش کریں گے تو ایک ہی رات میں پنجابی ہیرو بننے کے خواب رفو چکر ہو جائیں گے۔" دریشہ نے مذاق اڑایا۔

"ہاں یہ تو ہے، یہاں سہولتیں بہت کم ہیں۔ ویسے تم اگر یہاں آ کر رہو گی تو تمہارا ویٹ پرسنٹ وزن کم ہو جائے گا۔ بڑے ابا کی حویلی میں کام بہت ہیں۔ جانوروں کو چارہ ڈالنا، دودھ نکالنا، گوبر تھوپنا۔ بڑے بڑے صحن کی صفائی کرنا۔ یہ جو تم پشتو فلموں کی ہیروئن بنتی جا رہی ہو۔ ہالی وڈ کی ہیروئن بن جاؤ گی۔"

"آنی! دیکھ رہی ہیں آپ؟" دریشہ نے چڑ کر نائلہ کی طرف دیکھا۔ نائلہ اور ہما دونوں ہی ہنس رہی تھیں۔

"ارے وہ افلاطون ثانی کہاں ہے" عاذان کو اچانک خیال آیا۔

"آپی شاید نماز پڑھ رہی ہیں۔"

"ارے نماز تو مجھے بھی پڑھنی تھی۔" نائلہ کو اچانک خیال آیا۔ تو وہ ان کے ٹولے سے نکل گئی۔

ساری حویلی کو دیکھنے کے بعد وہ اس کمرے میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ سب سے مانوس جگہ یہی تھی۔ وہ جواد حسن کی تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ رنگ برنگے شیشوں اور چنیوٹ کی لکڑی سے مزین چھت و دروازے اور کھڑکیاں۔ سنگِ مرمر کے فرش۔ چوڑی چوڑی راہداریاں آج بھی کتنی جدت تھی اس ساری حویلی میں۔ لیکن سب سے آرائش و زیبائش والا کمرہ یہی تھا۔ کتنے بڑے بڑے جھومر چھت سے لٹک رہے تھے ابو کا ذوق کتنا اعلیٰ تھا۔ وہ ان کا فرنیچر دیکھ رہی تھی۔

تب ہی فاروق حسن کمرے میں آ گئے۔

"مجھے معلوم تھا میری بیٹی یہیں ہو گی۔"

وہ چونک گئی۔ "آیئے بڑے ابا....." اس نے اپنے باپ کی تصویر واپس وہیں رکھ دی۔ جہاں سے اٹھائی تھی۔

"تم میں اور جواد میں کچھ فرق نہیں، صرف قدرت نے تمہیں عورت اور اسے مرد بنا دیا وہی سنجیدہ، وہی عادتیں، پڑھنے کا شوق اسے بھی بہت زیادہ تھا۔ تمہاری طرح بہت سوچتا تھا، بڑا حساس تھا، شائد اسی لیے جلدی چلا گیا۔ خوش رہا کرو بیٹی!"

''خوش تو رہتی ہوں، بڑے ابا''

''ایسے نہیں اس طرح۔'' انہوں نے کھڑکی کے باہر اشارہ کیا جہاں عاذان، دریشہ، ہما، مشعال، اظفر، سیفی اور باقی سب مرغیوں کو ستا رہے تھے اور ایک دوسرے پہ اچھال رہے تھے۔ ان کی ہنسی قہقہے پوری حویلی میں گونج رہے تھے۔

مریم ہنس پڑی ''بھلا یہ بھی کوئی کھیل ہے۔ بے زبانوں کو تنگ کر رہے ہیں۔''

تب ہی عاذان کمرے میں آ گیا۔

''یہ کیا بورہت ہے، جہاں جاتی ہو، مدرسہ کھول لیتی ہو۔''

اس نے مریم کے ہاتھ سے کتاب چھین کر ریک میں رکھی۔

''آیئے نا بڑے ابا! یہ تو آپ کو بھی مکاتب فکر پر درس دینے بیٹھ گئی ہوں گی۔ ان کی عادت ہے جہاں جاتی ہیں اپنی تعظیم کا رعب جمانے بیٹھ جاتی ہیں۔ ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں، پڑھنے تو نہیں۔''

وہ ان کو پکڑ کر باہر لے گیا۔ مریم بھی پیچھے پیچھے آ گئی۔

''موسم دیکھیے یکا یک کتنا اچھا ہو گیا۔ سورج بھاگ رہا ہے بدلیاں اسے پکڑ رہی ہیں۔ کہیں گھٹا ہے اور کہیں ہلکی ہلکی دھوپ۔ حویلی کی سرخ دیواریں مسلسل بارشوں کی وجہ سے گیلی اور ٹھنڈی ہو کر آنکھوں کو مترنم کر رہی ہیں اور سب سے بڑھ کر فضا میں آموں کی خوشبو پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ آؤ اور ہمیں کھاؤ۔'' بڑے ابا اس کی تقریر پہ ہنسنے لگے۔

''اس لیے جلدی جلدی سب تیار ہو جاؤ۔ ہم باغ میں چل رہے ہیں۔''

عاذان نے حکم دیا اور فٹافٹ سب تیار ہو گئے۔ آموں کے درخت پھل سے لدے ہوئے تھے۔ ان کی نرم شاخوں میں بید کے رسوں کے جھولے بڑے تھے جن پر جاتے ہی لڑکیوں اور بچوں نے قبضہ کر لیا۔ بڑے ابا بان کے پلنگ پہ بیٹھ گئے۔

خواتین درختوں کے سائے میں جگہ ڈھونڈنے لگیں اور مرد حضرات ٹیوب ویل کی طرف چل پڑے۔ ٹیوب ویل کا پرنالہ سفید دودھیا پانی زور و شور سے ڈال رہا تھا۔ سب سے پہلے شرٹ اتار کر عاذان نے چھلانگ لگائی پھر اظفر اور سیفی نے تائید کی۔ سیفی سے چھوٹا کامران بھی سوئمنگ کے لئے ہمت باندھنے لگا۔

''ابو! چاچو! آپ لوگ بھی آیئے نا۔'' عاذان نے فرط مسرت سے کہا۔

''نہیں بھئی ہم تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ کہیں چک دک نہ آ جائے تم لوگ انجوائے کرو۔''

فواد حسن نے جان چھڑائی لیکن وحید اور ولید کو بخشنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔

وحید بھی نگاہ بچا کر ادھر ادھر ہو گئے۔ عاذان نے ولید کو آن لیا۔

''کمال ہے چاچو! آپ بھی بوڑھوں کی صف میں شامل ہونے جا رہے ہیں۔ جسٹ فار انجوائے منٹ۔''

''کیا کرتے ہو یار! خواتین اردگرد ہیں۔''

''تو کیا ہوا۔ ایسے ہی آ جایئے۔''

''نان سینس۔ بے وقوف نہ بنو۔ تم نے تو پینٹ پہن رکھی ہے۔ اگر بدن سے چپکی بھی پتا نہیں لگتا۔ میں قمیص شلوار کو گیلا کر کے کہاں جاؤں گا۔''

ولید ٹال کر بڑے ابا کی طرف آ گئے۔

طاہرہ، فاطمہ، سائرہ، دیہاتی خواتین کی سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ بہت ساری خواتین ان کے گرد ٹولا بنا کر بیٹھ گئی تھیں۔

ولید نے نائلہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ نائلہ کو بھی انہی کے پاس ہونا چاہیے تھا جبکہ وہ دو درختوں کے جھنڈ میں بچوں اور لڑکیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ پھر پتھر مار مار کر وہ لوگ آم توڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں عاذان وغیرہ بھی ان ہی کے پاس پہنچ گئے۔ سخت لوٹ مار بدتمیزی کا سا ماحول تھا۔ جس کو سب انجوائے کر رہے تھے۔

رات گئے سب کی واپسی ہوئی۔ دن بھر کی تھکاوٹ کی وجہ سے بچے نیند سے بے حال ہو رہے تھے اور سب ہی سست اور بے زار ہونے لگے لیکن نائلہ، عاذان، دریشہ، ہما اب بھی گیت گاتے ہار رہے تھے۔

☆☆☆

دو دن پُراسرار خاموشی میں گزر گئے۔ نائلہ پریشان تھی، آخر اس نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا اس کی وجہ سے ولید کو چپ لگ گئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بار بار ٹٹول چکی تھی لیکن کوئی بھی ایسی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، جو ولید کی ناراضی کا سبب ہو۔ رات کھانے کے بعد جب وہ بچوں کو سلا چکی تو ولید کو دودھ کا گلاس تھماتے ہوئے بولی۔

''کیا بات ہے، آپ دو دن سے چپ چپ ہیں۔ مجھ سے ناراضی ہے یا وہاں کسی سے کوئی بات ہوئی ہے۔''

ولید خاموشی سے اسے دیکھنے لگے۔ نائلہ کچھ نروس سی ہو گئی۔ اب یہ ثابت ہو گیا تھا کہ بات اسی کی ہے۔

''بیٹھو۔'' نائلہ بیٹھ گئی۔

''ہماری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

''تقریباً ساتواں سال لگ رہا ہے۔''

''ایک انسان کو جاننے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا ہے۔''

''یہ تو انسان کی شخصیت پہ منحصر ہے، کچھ لوگوں کو جاننے میں ایک پل نہیں لگتا اور کچھ لوگ صدیوں میں بھی پہچانے نہیں جاتے۔''

''میرا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے؟''

''میں سمجھی نہیں۔''

''کیا چھ سال میں ہم ایک دوسرے کے مزاج کو ذرا بھی نہیں جان پائے۔''

نائلہ خاموش رہی۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ بات کیا ہے۔

''اب ہم دو بچوں کے والدین ہیں۔ نہ تو تم ننھی بچی ہو اور نہ ہی میں، کتنا عجیب سال لگ رہا تھا تم اپنے گروپ کو چھوڑ کر بچوں کے ساتھ بچہ بن گئی تھیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ وریشہ اور ہما تم پہ کیچڑ اچھال اچھال کر ڈال رہی تھیں۔ تمہیں ایسا نہیں لگا کہ تمہاری بے عزتی ہو رہی ہے۔''

''ولید!'' نائلہ درمیان میں بول پڑی۔ ''آپ ہر چیز کو بہت باریک بینی سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو مجھ سے اختلاف رہتا ہے۔ ہم وہاں تفریح کرنے گئے تھے۔ اب تفریح جائے نماز بچھا کر نیت باندھ کر تو نہیں ہوتی کہ مخصوص رکن ادا کرتے ہیں اور بس۔''

ولید کو نائلہ کی بات بہت بری لگی۔

''تمہیں احساس ہے کہ تمہارا ان لوگوں سے کیا رشتہ ہے، انسان کو کچھ اپنے مرتبے کا بھی دھیان رکھنا چاہیے، تفریح کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کی بے عزتی کر کے خوشی حاصل کریں۔''

نائلہ کا جی چاہا کہے۔ ''بے عزتی میری ہو رہی تھی آپ کی تو نہیں۔'' لیکن وہ خاموش ہو گئی۔ ہو سکتا ہے اسی بات کا بتنگڑ بن جائے۔

''تمہیں بچوں کی ذرا پروا نہیں تھی۔ کیا تم اپنے بچوں سے بھی لاتعلق ہو گئی تھیں۔''

''بچے کھیل رہے تھے، خوش تھے۔ میں کیا انہیں وہاں پڑھاتی بیٹھ کر۔'' نائلہ بھی جل گئی۔

''صرف پڑھانا ہی بچوں کی پروا کرنا ہوتا ہے۔ کتنی بدتمیزیاں کر رہے تھے بچے......''

''بے چاروں کو پہلی بار تو آزادی ملی تھی۔ یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ ہر وقت سن سن کر بچے بیزار ہو جاتے ہیں۔''

''تو پھر ایسا کرو، اس گھر کو اصطبل بنا لو۔''

''ولید! جب ہم بچوں کو گھر میں بہت گھونٹ کر رکھیں گے۔ تو وہ ایسے ہی مظاہرے کریں

گے۔ بات آپ کو خود سمجھنی چاہیے۔'' نائلہ زچ ہو کر بولی۔

''کیا دنیا میں ہمارے ہی صرف بچے ہیں۔ اپنے قریب کی ہی مثال لے لو۔ فاطمہ بھابھی کے آٹھ بچے ہیں چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ خود بیماریوں میں گھلی پڑی ہیں۔ مجال ہے کسی بچے نے ایسا مظاہرہ کیا ہو۔ جیسے تمہارے بچے کر رہے تھے۔''

(وہ ایسے مظاہرے اپنے گھر میں کر لیتے ہیں اس لیے انہیں کہیں اور کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔)

''آٹھ بچوں کو پالنا ان کی تعلیم و تربیت۔ پھر گرہستی چلانا۔ کیا یہ سب کچھ آسان ہے؟''

''فاطمہ بھابھی سے زیادہ وریشہ ان بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اسے ہی معلوم ہے کہ وہ کیسے سنبھال رہی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک نمونہ ہے، ہر وقت بے چاری نالاں، بیزار رہتی ہے۔ بہن بھائیوں کی وجہ سے انٹر کا بھی امتحان نہیں دے سکی۔'' نائلہ نے جل کر کہا۔

''تو ٹھیک ہے، پڑھ لکھ کر اسے کرنا بھی کیا تھا۔ آگے جا کر تو یہی زندگی ہے۔ اچھا ہے ایکسپرٹ ہو کر جائے گی۔ سو طرح کے۔ جھنجھٹوں سے بچے گی، کامیاب اور خوش زندگی گزارے گی۔ لڑکیاں پڑھ کر حاصل کرتی ہی کیا ہیں۔ صرف نخرہ۔ اور نزاکت...... گھریلو لڑکیاں ہی شوہروں کو سکون دے سکتی ہیں۔''

آخری جملے پہ تو نائلہ کے آگ لگ گئی۔

وہ جھٹکے سے اٹھی۔ اپنا تکیہ اٹھایا اور بچوں کے کمرے میں سونے کے ارادے سے چلی گئی۔

☆☆☆

''السلام علیکم۔''

''تمہیں سوائے مجھے سلام کرنے کے کوئی دوسرا کام ہے۔''

''سلام کرنے سے محبت بڑھتی ہے اور تحائف لینے دینے سے بھی۔ میں کل کتاب نگر گیا تھا۔ آپ کے لیے ایک کتاب لایا ہوں۔''

''کتاب اور تم دو متضاد چیزیں ہیں، لیکن پھر بھی دیکھ لیتی ہوں۔''

''محبت کے قاتلوں کا انجام'' شکریہ۔ میں ایسا ادب نہیں پڑھتی۔''

''آپ پڑھتی ہی کیا ہیں، سوائے بوڑھے فلسفیوں کے۔ وہاں گاؤں گئی تھیں، تو بڑے ابا کو سکول کی تعمیر کا درس دے آئیں، ارے کوئی جم خانہ۔ کوئی اکھاڑہ ہی کھلواتیں۔''

مریم نے اسے ایک نظر دیکھا۔

''دیکھ کر پیار سے۔'' پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔ ''میں نے اپنی موٹر سائیکل کے پیچھے

لکھوا دیا ہے۔ اچھا جملہ ہے ناں۔"

"عاذان! تمہیں ایسے نہیں لگتا کہ تم وقت کی قدر نہیں کر رہے۔ کیوں ادھر ادھر پھرتے ہو۔ کسی مثبت اور تعمیری کام میں دل لگاؤ۔ زندگی ہمیشہ ایک پٹڑی پہ نہیں چلتی، اس میں بہت نشیب و فراز آتے ہیں اور ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ بہتر ہے اس عمر سے فائدہ اٹھاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے پرس اور گاڑی کی چابی اٹھائی اور یونیورسٹی کے ارادے سے نکل گئی۔

"آہ۔ ہا۔ اس عمر نے ہی تو خانہ خراب کر رکھا ہے۔ کاش مریم جواد حسن! میں تم سے چار سال چھوٹا نہیں بڑا ہوتا۔ تم میرے احساسات کو سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہتیں۔ کتنا سکون رہتا ہے تمہارے چہرے پہ چاہے میں بڑی سے بڑی بات کر جاؤں۔ اتنا سکون ہے اس چہرے پہ اگر پوری دنیا میں بانٹ دوں تو دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ اور ایک وہ محترمہ ہیں، ہر وقت جنگی طیارہ بنی رہتی ہیں۔"

وہ سوچتے ہوئے گھر میں داخل ہو رہا تھا کہ سامنے ہی دریشہ کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی جھٹ سلام کر دیا۔

"السلام علیکم۔"

"مجھے سلام کر کے کیا تم حشر میں بخشی جاؤ گی جو روز منہ اٹھا کر چلی آتی ہو۔"

"سلام کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔"

"کیا؟" عاذان چونک گیا۔ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا وہ سادگی سے مسکرا رہی تھی۔

"لگتا ہے بچے پال پال کر تمہارا بھی دماغ دائیوں والا ہو گیا ہے جو صبح اٹھتے ہی ہر وا میں سلام کرنے پہنچ جاتی ہیں۔ شاید کہیں سے خوش خبری مل جائے۔"

"خوش خبری تو میں تمہیں سنانے آئی ہوں۔ جسے سن کر تم ہوا میں اڑنے لگو گے۔ شگفتہ پھوپھو۔ کینیڈا سے آ رہی ہیں۔ مع فیملی۔"

"واقعی.....؟"

"جی ہاں۔ سو فیصد۔ واقعی....."

"چل موٹی! اچھی باتیں دیر سے بتاتی ہے۔"

عاذان کہہ کر اندر بھاگا۔ دریشہ غصے سے اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

☆☆☆

چاروں گھروں میں زبردست قسم کی بھگدڑ مچ گئی تھی، سب اپنے اپنے تئیں یہی چاہتے تھے کہ شگفتہ ان کے ہاں آ کر رہے۔ سو اس غرض سے ہر گھر میں صفائی ستھرائی کا انتظام ہو رہا تھا۔

ہما اور فائزہ ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھیں جبکہ مریم پردے ٹانگ رہی تھی۔

طاہرہ بیگم صوفوں کے کشن پہ کپڑے چڑھا رہی تھیں۔

"امی! پھوپھو کتنے عرصے کے بعد آ رہی ہیں۔" فاخرہ گلدان کے پھول جھاڑتے ہوئے بولی۔

"تقریباً پندرہ سال کے بعد۔"

"کیا وہ ہمیں پہچان لیں گی؟"

ہما نے پوچھا تو طاہرہ ہنس پڑی۔

"ہو سکتا ہے ہم لوگ ہی انہیں نہ پہچان پائیں۔ بہت ماڈرن جو ہو گئی ہیں۔ جوان بیٹوں کی ماں لگتی ہی نہیں۔"

"امی! پھوپھو ابو سے کتنی بڑی ہیں؟"

"تین سال بڑی پھر تمہارے ابو۔ اس طرح باقی سب۔"

"میں نے پھوپھو کی تصاویر دیکھی ہیں۔ آپی کچھ کچھ پھوپھو میں ملتی ہیں۔" ہما نے دلچسپی سے کہا۔

"کچھ کچھ نہیں بہت زیادہ۔ جوانی میں شگفتہ بالکل مریم کی طرح کی تھی۔"

"اور بڑھاپے میں آپی۔ پھوپھو کی طرح ہو جائیں گی بشرطیکہ آپی بھی پھوپھو کی طرح کینیڈا میں رہنے چلی جائیں۔"

مریم پردے ٹانگ رہی تھی۔ نجانے اس کے دل کو کیا ہوا، ہاتھ لرز کر پردہ گر گیا۔

"اللہ نہ کرے کہ میری بیٹی اتنی دور جائے۔ میں تو ہرگز بھی اپنی بچیوں کو خود سے دور جانے نہیں دوں گی۔ بس قریب قریب ہی شادیاں کروں گی۔ تمہارے سوا میرا ہے ہی کون۔"

"جی ہاں۔ گھر کی ایک کھڑکی کھولنا۔ آپی کو دیکھ لینا دوسری کھڑکی سے ہما باجی کو۔ اور تیسری۔"

"امی! میرے لیے تو آپ کو باہر ہی جانا پڑے گا۔" فائزہ آنکھیں گھما کر بولی تو طاہرہ کو ہنسی آ گئی۔

"فائزہ! تم ضرورت سے زیادہ ہی اوور ہو گئی ہو۔" مریم نے ڈانٹا تو وہ خاموشی سے کام میں لگ گئی۔ جبکہ ہما نے مسکراتے ہوئے اسے کشن مارا تھا۔

☆☆☆

نائلہ ناشتا بنا رہی تھی۔ تب ہی ولید کچن میں داخل ہوئے اور اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

نائلہ نے ایک نظر دیکھا اور اپنے کام میں لگ گئی۔

ولید مسکرا دیے اور اسے اپنی باہنوں کے حلقے میں لے لیا۔

"آئی ایم سوری......" انہوں نے آہستگی سے اس کے شانے پہ ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے کہا۔

صرف ایک جملہ پہ نائلہ نمک کی طرح پگھل گئی لیکن اس نے خود کو مضبوط کیے رکھا۔ نجانے اس کی کیسی عادت تھی۔ اول تو شاذ و نادر ہی ولید ایکسکیوز کرتے اور جب کرتے تو نائلہ کو اچھا بھی نہیں لگتا۔ ان کا جھکنا اور عاجزانہ الفاظ کہنا۔ وہ فوراً انہیں روک لیتی اور جلد ہی مان جاتی۔ شاید یہی وجہ تھی ولید کو اپنی غلطی کا احساس کم ہی ہوتا تھا۔

حالانکہ وہ پچھلے دو دن کتنی دکھی رہی تھی۔ کتنی بار ولید کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے آنکھیں گیلی ہوئی تھیں۔ ان کے الفاظ تیر کی طرح دل میں پیوست ہو کر رہ گئے تھے لیکن جب انہوں نے منانے کے لئے قدم بڑھایا تو وہ پہلے ہی قدم پہ راضی ہو گئی۔

"مجھ سے بولو گی نہیں؟" اسے جوں کا توں کھڑا دیکھ کر ولید گویا ہوئے۔

"آپ کو کیا معلوم یہ محبت کیا چیز ہے، مجھ سے پوچھیں تو بڑی ہی کمبخت ہے۔ بے مایہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ جس محبوب سے دکھ ملتا ہے۔ پھر بھی اسے ہی پکارتا رہتا ہے۔ آپ کی باتیں بری لگتی ہیں وقتی طور پر جھنجھلا جاتی ہوں، لیکن ان باتوں کے عوض آپ کی بے رخی کا سودا قبول نہیں کر سکتی۔ چلو اتنا تو ہے۔ آپ کو اپنی زیادتی کا احساس ہو جاتا ہے اور یہی میرے لیے بہت ہے میں بہت دیر تک آپ کو غم زدہ یا اپنے آگے جھکا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ شاید یہ میری فطرت کی کمزوری ہے حالانکہ آپ میرے شوہر ہیں۔ شوہر کا درجہ مجازی بھی تب ہے، جب اس سے محبت ہو۔ بنا محبت کے یہ صرف مجبوری کا رشتہ ہے۔"

ولید نے اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھے۔ نائلہ نے نرمی سے ان کے ہاتھ ہٹا دیئے۔

"ابھی تک ناراض ہو؟"

"نہیں" نائلہ نے فوراً انکار کر دیا۔ "میں زیادہ دیر آپ سے ناراض نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ کل ہی پیش رفت کر لیتے تو مجھے اتنا ملال نہ ہوتا۔ شاید آپ مجھ سے زیادہ ناراض رہ سکتے ہیں۔ تب ہی اپنی زیادتی کا احساس آپ کو ایک دن اور دو راتیں گزرنے کے بعد ہوا۔"

"احساس تو مجھے تب ہی ہو گیا تھا لیکن......"

"لیکن کیا؟" نائلہ نے ان کی طرف دیکھا۔

"لیکن۔ میں نے سوچا شاید ہمیشہ کی طرح تم اپنے قصور کو قصور مانتے ہوئے خود ہی بولنے میں پہل کرو گی۔"

نائلہ کا دل لرز گیا۔ "میری غلطی یا آپ کی دل شکنی۔"

"ہاں۔ پھر تمہارے رویے کی بدولت مجھے اپنے لفظوں کا احساس ہو گیا تھا۔ تب ہی تو

سے معافی مانگنے چلا آیا۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے نائلہ کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ تڑپ اٹھی۔ "آپ کو معلوم ہے مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔"

اس نے ان کے ہاتھ کھول دیے۔

"تھینک گاڈ...... کہ تم مان گئیں۔" وہ ناشتے کی میز پہ بیٹھ گئے۔

"میں تو مان ہی جاتی ہوں۔ کبھی آپ بھی مان لیا کریں۔"

"کیا؟" وہ دلچسپی سے بولے۔

"جو میں منواؤں۔" اس نے ہلکے پھلکے سے انداز میں کہتے ہوئے ناشتا ان کے سامنے رکھا۔

"کبھی آپ نے منوانے کی عادت ہی نہیں ڈالی۔ تو پھر بھلا بتاؤ کیسے مانیں۔"

(مجھے آپ سے بے حد محبت ہے اور ہر وقت میں چاہتی ہوں اس کا اظہار زیادہ سے زیادہ کروں۔ اس چکر میں آپ کی زیادتیاں بھی بھول جاتی ہوں۔ شاید میں جانتی ہوں۔ آپ سے زیادہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔)

نائلہ ہنس پڑی۔ یقیناً یہ اس کی کمزوری تھی۔

"بچے نہیں اٹھے ابھی؟"

"نہیں۔ دیر سے سوئے تھے۔"

"شگفتہ آپا آ رہی ہیں۔ تمہیں معلوم تو ہو گیا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ اپنی ضروری خبریں غیروں سے معلوم ہوتی رہتی ہیں۔" وہ پُرشکوہ لہجے میں بولی۔

ولید نادم سے ہو گئے۔ "اب بس بھی کرو۔ کتنا شرمندہ کرو گی۔"

نائلہ مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ ناشتے کی میز پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ صبح کا سورج طلوع ہوا تھا تو صلح کا پیام لے کر آیا تھا۔ غروب ہوا تو بگڑا جوں کا توں تیار تھا اور یہ کوئی آج کی بات تو نہیں تھی۔ پچھلے سات برس سے یہی ہو رہا تھا، ان کی جنبشِ ابرو پہ لبیک کہتی تو ٹھیک تھا۔ ذرا سی چوک ہوئی اور ناراضی تیار۔

اب بھی کچھ ایسی صورتحال درپیش تھی۔

پرسوں شگفتہ آپا آ رہی تھیں۔ اسی خیال کے تحت اس نے خود کو میکئین کے بارے میں سوچا۔ گھر کی صورتحال پرفیکٹ تھی۔ ولید کی نفاست نے اس کو بھی وہمی بنا دیا تھا۔ گھر کا گوشہ گوشہ چم چم کرتا رہتا لیکن بذاتِ خود وہ کچھ ماندی سی ہو گئی تھی، بہت دن ہوئے تھے پارلر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ گھر

کی مصروفیت اور میاں کی نخروں میں فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔

اب جو نند کی آمد کا علم ہوا تو اس نے گہری مصروفیت میں سے وقت نکال لیا تھا۔

ٹیوٹر بچوں کو پڑھا کر جا چکا تھا۔ بچوں کے سونے کا ٹائم بھی نہیں تھا۔ سو اس نے بچوں فاطمہ کی طرف چھوڑ دیا کہ دوسرے بچوں میں ان کا دل لگا رہے گا اور وریشہ کو اپنی مصروفیت کا بتا نی گئی۔ اس کا اندازہ تھا اس کی واپسی ایک گھنٹے تک ہو جائے گی لیکن وہاں توقع سے زیادہ وقت لگ

تین گھنٹے کے بعد جب وہ گھر پہنچی تو گھر کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ جا بجا پانی اور گندگ گیلے کپڑوں کا ڈھیر۔ ڈرائنگ روم کی حالت جنگ کے بعد کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ نائلہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا بڑا کارنامہ صرف اس کے بچوں نے انجام دیا ہے۔

لیکن آنکھوں کے سامنے جو نقشہ تھا۔ اسے جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سب سے بڑا قیامت تو یہ تھی کہ ولید گھر آ چکے تھے اور جائے وقوعہ پر کسی سخت سپاہی کی طرح بیٹھے تھے۔ بچے ول کے سامنے مجرموں کی طرح نظر بند تھے۔

''یہ سب کس نے کیا ہے؟'' وہ بچوں پہ ناراض ہوئی۔

ٹیپو چپ رہا۔ نیناں نے بتایا۔ ببلو، نکی، حرا اور راجو وغیرہ ان کے ساتھ آ گئے تھے اور سب نے مل کر گھر کی یہ حالت کی ہے۔

نائلہ کا دماغ چکرا گیا۔ ''میں تمہیں وہاں اس لیے چھوڑ کر آئی تھی کہ تم مددگاروں کو بلا کر گھ کا یہ حلیہ کرو۔ تمہارے کپڑے کہاں ہیں ٹیپو؟'' ٹیپو کو صرف نیکر میں دیکھ کر وہ غرائی۔

''ببلو وغیرہ نے باتھ روم میں پھینک دیے۔''

باتھ روم کی بری حالت تھی، جا بجا صابن پڑا پگھل رہا تھا۔ شیمپو کی شیشی کھلی پڑی تھی۔ غضب تو یہ تھا۔ ولید کی شیونگ کٹ سارے باتھ روم میں بکھری تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہاں سے سمیٹنا شروع کرے۔

''جی تو چاہ رہا ہے ڈنڈا لے کر تمہیں سیدھا کر دوں۔''

ولید خاموشی سے بیٹھے، سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ اچانک نائلہ کو خیال آیا تو قریب رسان سے بولی۔

''میں ذرا پارلر تک چلی گئی تھی، بہت دن ہو گئے تھے اسکن بھی بہت رف ہو رہی تھی، بچوں فاطمہ بھابی کی طرف چھوڑ کر گئی تھی۔ لیکن دیکھیے انہوں نے کیا گل کھلایا۔ ہر چیز کا بیڑا غرق کر دیا۔''

وہ صوفوں کے گیلے کشن ہاتھ سے جھٹکتے ہوئے بولی۔

''شیمپو صابن سب کچھ برباد کر دیا۔ اور یہ برتن کیوں نکل آئے تھے۔ ایسی کون سی دعوت

ہو رہی تھی۔''

وہ بجلی کی سی تیزی سے ایک ایک چیز سمیٹ رہی تھی اور بچوں کو ڈانٹ رہی تھی۔

پھر وہ واش بیسن پہ سے درجن بھر صابن اٹھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ دو صابن واش بیسن پہ رکھے ہوں ولید ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ آج بچوں نے اس سے کیا انتقام لینے پہ کمر باندھی تھی۔ مہینے بھر کا صابن بیسن پہ لا ڈالا تھا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

''یہ تو روزمرہ کی بات ہے۔ واش بیسن پہ بیک وقت تین تین صابن رکھے رہتے ہیں۔ دو اور فالتو آ گئے تو کیا ہوا۔''

ولید کا طنزیہ لہجہ ابھرا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''آپ کو معلوم ہے۔ ٹیپو سیف گارڈ استعمال کرنے لگا ہے۔ نیناں میرے ساتھ کیپری استعمال کرتی ہے ٹائلٹ کے ہاتھ دھونے کے لئے ڈیٹول سوپ رکھا رہتا ہے۔'' وہ وضاحت کرنے لگی۔

''یہ میری لاپروائی نہیں ہے۔ گھر کی ضروریات ہیں اور میں اپنے گھر پہ اسے اثر انداز بھی نہیں ہونے دیتی۔''

''ایسی کون سی چیز ہے جو گھر پہ اثر انداز نہیں ہوتی اور کیا کیا ہیں گھر کی ضروریات۔ یہ آپ کی مین میخ۔''

انہوں نے نائلہ کے صاف ستھرے دلکش چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر طنزیہ لہجے میں بولے۔

''مسز ولید حسن! یہ بات مان لیجیے۔ عورت کا حسن شادی کے بعد۔ اس کا لباس اور اس کے چہرے کی بیوٹی نہیں ہے۔ اس کے گھر اس کے بچوں میں ہوتا ہے، اس کے کچن، اس کے باتھ روم میں ہوتا ہے۔''

اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

نائلہ کا دل بجھ سا گیا۔

پارلر سے وہ کتنی فریش ہو کر نکلی تھی۔ سوچا تھا ولید اسے دیکھیں گے تو ان کی طبیعت خوش ہو جائے گی لیکن الٹا کیا ہوا، گھر کی حالت دیکھ کر خود اس کی طبیعت ہری بھری ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شگفتہ کی آمد کے روز چاروں گھروں میں بہت ہلچل و ہنگامہ تھا۔

وہ اپنے دو جوان بیٹوں کے ہمراہ تشریف لائی تھیں۔

بڑے بیٹے کا نام سمیع اللہ اور چھوٹے کا نام عبداللہ تھا۔ سمیع کی عمر تقریباً تیس سال کے لگ

بھگ پنچ چکی تھی جبکہ عبداللہ کی چھبیس تو ضرور تھی۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک کنوارے تھے۔ شگفتہ کی آمد کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اپنے ہونہار، خوبصورت بیٹوں کے لئے وطنِ عزیز سے بہوئیں تلاش کرنے آئی تھیں۔

دونوں کا علیحدہ علیحدہ اپنا ذاتی بزنس تھا۔ اپنی رہائش اور سب سے اعلیٰ خوبی۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہاں کی شہریت بھی حاصل تھی۔ ایسے لڑکے ہر لڑکی کا خواب ہو سکتے تھے۔ پہلے دن وہ جواد حسن کے ہاں رہیں۔ باقی تینوں گھرانے بھی وہیں مدعو تھے۔ اسی روز تعارف کا مرحلہ طے ہوا۔ ایک دوسرے کے متعلق معلومات۔ نظروں ہی نظروں میں تبادلۂ خیال ہوا۔

دوسرے روز فواد حسن کے ہاں دعوت تھی۔ عاذان نے دونوں کزنز کو پورے ملتان کی سیر کرائی۔

تیسرے روز حمید حسن کے ہاں دعوت تھی۔ جہاں بچوں کی پلٹن سے شگفتہ بے حد محظوظ ہوئیں۔

چوتھا روز بہت پُرسکون تھا۔

"جیسے انسانوں کی شخصیت ہوتی ہے۔ ویسے ہی ان کے گھروں کے ماحول ہو جاتے ہیں۔" شگفتہ نے کھانے کے بعد ولید کے گھر کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ نائلہ برتن سمیٹتے ہوئے ہنس دی۔

"مثلاً" اس نے جان بوجھ کر بات بڑھائی۔

"یہی جیسی ولید کی عادت تھی۔ اس نے اپنی فیملی بھی مختصر رکھی۔ گھر کا اسٹائل اور ڈیکوریشن۔ سب ولید کی شخصیت کی نمائندگی کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اسے بیوی ہم خیال اور ہم مزاج ملی ہے۔ اور مجھ سے پوچھو تو۔ سلیقہ مند اسمارٹ اور خوبصورت بیوی مرد کے لئے سب سے زیادہ آسودگی کا سبب ہوتی ہے۔"

(دنیا میں ایسے بھی مرد ہوتے ہیں۔ جنہیں اسمارٹ اور خوبصورت بیوی سے زیادہ اپنا گھر اور اپنے بچے سجے سنورے اچھے لگتے ہیں، بیوی تو صرف سلیقے کے لئے ہوتی ہے۔) نائلہ برتن اٹھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

وہ دو روز سے ولید کے رویے کی وجہ سے بجھی بجھی سی تھی۔ حالانکہ ولید اس سے بول بھی رہے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ رویوں میں تناؤ ہو۔ اکثر ولید بڑی سی بڑی دل شکنی کرنے کے باوجود معمول سے زندگی گزار رہے ہوتے تھے جبکہ وہ خود کتنی حساس ہو جاتی تھی۔

"لائیے۔ میں تمہاری مدد کر دیتی ہوں۔" شگفتہ نائلہ کی مدد کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

"ارے نہیں رہنے دیں۔ ولید دیکھیں گے تو خفا ہوں گے۔"

"تو بھئی۔ اسے خود دیکھنا چاہیے ناں۔ مہمان وغیرہ آتے ہوں گے تو تمہیں تو بہت تنگی ہوتی ہو گی۔ کوئی کام والی کیوں نہیں رکھتے۔"

"آپ کو معلوم تو ہے۔ ولید کو کام والیوں کے ہاتھ کا کام پسند نہیں آتا۔ میں اپنی مدد کے لئے دریشہ، ہما وغیرہ کو بلا لیتی ہوں۔"

"اور مریم.....؟" شگفتہ نے نائلہ کی طرف دیکھا۔

"مریم زیادہ تر پڑھائی میں معروف رہتی ہے۔ اس کے علاوہ گھر کی بڑی بیٹی ہے۔ بھابھی مریم پہ زیادہ انحصار کرتی ہیں۔"

"مریم کی عادت بہت مختلف ہے۔ سب بچوں کی قسمت۔"

"جی۔ آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ وہ محتاط اور حساس لڑکی ہے۔ شاید اس کی جگہ میں یا آپ بھی ہوتے تو ایسے ہی ہو جاتے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ سچ پوچھو نائلہ! مجھے تو مریم بہت پیاری لگی ہے اور میں نے اپنے سمیع کے لئے بھابھی سے مریم کو مانگ بھی لیا ہے۔"

نائلہ کو ایک دم دھچکا لگا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"پھر بھابھی کیا کہتی ہیں؟"

"انکار کر رہی ہیں۔ بڑے ابا کے پاس جاؤں گی تو زور ڈلواؤں گی۔ میرے سمیع نے بھی مریم کے لئے رضامندی ظاہر کی ہے۔ بہت بچے گی دونوں کی جوڑی۔"

"واقعی کیوں نہیں۔" نائلہ بمشکل مسکرائی تھی۔

"عبداللہ کے لئے دریشہ پہ میرا دل آ رہا ہے، نٹ کھٹ سی شریر سی بہت پیاری ہے۔ ایسا ہی عبداللہ کا مزاج ہے شوخ سا لیکن میں ذرا تذبذب میں ہوں۔ یوں تو مشعال میں بھی کوئی کمی نہیں۔ سوچ رہی ہوں دریشہ پہ سوال ڈالوں یا مشعال پہ۔"

"آپ نے تو آپا دونوں لڑکیاں ہی گھر کی چن لیں۔"

"تو اور کیا کروں۔ اپنوں سے اچھا کوئی ہے اور سب سے اچھے تو بھائی ہوتے ہیں۔ رشتے بھی مضبوط ہوں گے اور رشتہ داریاں بھی اچھی ہوں گی۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔"

"ارے یہ ولید، سمیع اور عبداللہ کہاں گئے؟" اچانک شگفتہ کو خیال آیا تو کچن سے بولتے ہوئے باہر آ گئیں۔

"سمیع اور عبداللہ عاذان کے ساتھ سیر کے لئے گئے ہیں۔ میں ذرا آفس جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ شام کو ملاقات ہو گی۔"

"میں چائے بنا رہی تھی آپ کے لیے۔" نائلہ پیچھے سے بولی۔

"نہیں بس۔ فون آ گیا ہے۔ جلدی میں ہوں۔ اور ہاں آئس کریم اندر ٹیبل پہ رکھی ہے۔ ساری پگھل جائے گی۔ ڈیپ فریزر میں رکھ دیجئے گا۔ اچھا آپا خدا حافظ۔"

نائلہ چائے چھوڑ کر آئس کریم رکھنے چلی گئی۔ آئس کریم فریج میں رکھنے کے بعد اس نے ٹیبل صاف کی۔ کرسیاں ترتیب سے جمائیں۔ شگفتہ اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی۔

اس کے بعد اس نے چائے پیالیوں میں انڈیلی۔

"آپا چائے کدھر پئیں گی؟"

"جدھر پلاؤ گی۔" شگفتہ نے مسکرا کر کہا۔

"ادھر پھر کمرے میں آ جایئے۔" اس نے اپنے بیڈ روم میں آ کر اے سی آن کر دیا۔

شگفتہ نے چائے کی پیالی لبوں سے لگائی اور بیڈ روم کا جائزہ لینے لگیں۔ بیڈ کور، پردے، قالین، کشن، پینٹ، ڈیکوریشن ہر چیز رنگ سے لے کر صفائی تک۔ توازن اور نفاست کا نمونہ تھیں۔

"یہ سب ولید کی پسند ہے یا تمہاری؟" شگفتہ سے رہا نہ گیا۔

نائلہ آہستگی سے ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں تلخی کی آمیزش تھی۔

"جس کا یہ بیڈ روم ہے۔ اس کی یہ چوائس ہے۔"

"کیا یہ بیڈ روم تمہارا مشترکہ نہیں ہے۔"

"مشترکہ تو ہے لیکن چلتی ولید کی ہی ہے۔" نائلہ کا انداز سپاٹ تھا۔ شگفتہ چونک گئیں۔

"چوائس تو سراہے جانے کے قابل ہے۔ بشرطیکہ دونوں فریقین کی مرضی شامل ہو۔"

نائلہ خاموش ہو گئی اور چائے کے ہلکے ہلکے سپ لیتی رہی۔ شگفتہ بھی خاموشی سے چائے پینے لگیں۔

جب چائے ختم ہو چکی تو، نائلہ پیالی میز پر رکھتے ہوئے بشاش لہجے میں بولی۔ شاید اتنی دیر خاموش رہ کر اس نے لفظوں کو ترتیب دیا تھا۔

"آپا! آپ سے ایک بات پوچھوں۔"

"میں بھی تم سے کچھ پوچھنے والی تھی لیکن پہلے پوچھو۔"

"پہلے آپ پوچھ لیجئے۔"

"نہیں۔ ہو سکتا ہے۔ تمہاری بات میں ہی میرا جواب ہو۔"

"ولید کی عادتیں کس پہ ہیں؟"

شگفتہ نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر پیالی سائیڈ پہ رکھی اور پھر اطمینان سے بولیں۔

"بچوں کی عادتیں اپنے والدین پہ ہوتی ہیں۔ یا اپنے بہن بھائیوں سے ملتی جلتی۔"

"لیکن ولید کی عادت وطبیعت کسی پہ بھی نہیں ہے۔" نائلہ نے بات کاٹی۔

"ہاں۔ یہ تو ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے ولید گھر میں سب سے چھوٹا تھا سب ہی اس کا یال رکھتے تھے۔ پھر اماں کا انتقال جلد ہی ہو گیا جس کی وجہ سے وہ بے حد حساس ہو گیا تب ولید ات آٹھ برس کا ہو گا۔ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اسے گاؤں سے شہر آنا پڑتا تھا۔ ابا نے اسے ٹل میں داخلہ دلوا دیا۔ تم جانتی ہو ہاسٹل کی زندگی کیسی لگی بندھی اور ڈسپلن والی ہوتی ہے حالانکہ دو ائی شہر میں سیٹل ہو چکے تھے۔ لیکن ولید کی زندگی کا طویل عرصہ ہاسٹل میں گزرا۔ میرا خیال ہے جس ت اس نے یونیورسٹی جوائن کی ہے اس وقت تک ابا نے اس کا بھی پورشن تعمیر کرا دیا تھا۔ یہ بھائیوں ے ساتھ نہیں رہا۔ اپنی علیحدہ رہائش میں اس نے وقت گزارا۔ کھانا بھابھیاں وغیرہ بنا کر بھیج دیتی یں۔ صفائی کام والا ایک لڑکا رکھا ہوا تھا، وہ کر جاتا تھا۔ ولید کا گھر ہمہ وقت صاف ستھرا رہا کرتا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد سے لے کر اب تک اور پھر شادی تک لمبا عرصہ اس کا تنہا گزرا۔ ر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہو گا۔ ہر چیز کو سنبھال کے رکھنے کی عادت اس کی بچپن سے تھی۔ بچپن میں ی وہ دوسرے بچوں کی طرح اپنے کپڑے جوتے خراب نہیں کرتا تھا۔ صبح میں اس کے بال جما کر ئول بھیجتی پڑھ کر آتا۔ ویسے ہی بال جمے ہوتے۔

میری شادی بہت چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی۔ ولید مجھ سے بہت اٹیچ تھا۔ میرے بعد اس نے ی پہ انحصار نہیں کیا حالانکہ انحصار کرنے کا مقصد یہ تو نہیں کہ ہم کسی کے محتاج ہیں۔ اس سے تو ان کے تعلقات ظاہر ہوتے ہیں لیکن خودداری کی عادت نے اسے سب سے ہی الگ کر دیا۔ ایسے ا تم اس کی زندگی میں آ گئیں۔ تم ابا کا انتخاب تھیں۔ میں تمہاری شادی میں شریک نہیں ہو سکی تھی۔ ہیں معلوم ہی ہو گا میرے شوہر کا بائی پاس ہو رہا تھا۔ میں نے تمہاری شادی کی مووی دیکھی تھی۔ ریں بھی بھجوائی تھیں ان لوگوں نے۔ تم مجھے پہلی نظر میں ہی بہت خوبصورت لگی تھیں۔ سات برس بعد اب تمہیں دیکھا ہے۔ تم اب بھی بالکل ویسی ہی ہو۔ دو بچوں کی ماں ہرگز نہیں لگتیں۔"

"اتنی بھی غلط بیانی نہ کیجئے۔" نائلہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"اس میں غلط بیانی کی کیا بات ہے، ولید خوش نصیب ہے۔ اسے تمہارے جیسی بیوی ملی۔"

"پتا نہیں۔" نائلہ اداس سی ہو گئی۔

"سات سال میں تم کیا اس کا دل نہیں جیت پائیں۔ جبکہ سمیع نے پہلی نظر تم پہ پڑتے ہی تھا ای یہ لڑکی صحیح ہے۔ اور میں نے اس کے وہیں لگایا تھا۔ یہ تمہاری ماں ہیں۔"

نائلہ اور شگفتہ دونوں ہی دیر تک ہنستی رہیں۔

"خوش رہا کرو۔ اچھی لگتی ہو۔"

"خوش تو رہتی ہوں لیکن شاید ولید کو میرا زیادہ خوش رہنا اچھا نہیں لگتا۔ کوئی نہ کوئی ایسا نقص دریافت کر لیتے ہیں جو تنازعے کا سبب ہو۔"

پھر چیدہ چیدہ نائلہ نے انہیں اپنی زندگی کے بارے میں بتایا آخر میں وہ کہنے لگی۔

"یہ دیکھیے۔ مثال کے طور پر جیسے یہ پیالی ہے۔ اگر یہ پرچ کے بغیر رکھی ہے۔ ولید لیے الجھن کا سبب ہے اور پھر یہ الجھن جنون بن جاتی ہے۔ ہر چیز کو ترتیب اور سلیقے سے ہونا چاہیے جب تک میں اکیلی تھی۔ اپنی ذات سے ڈسپلن رکھتی تھی۔ اب بچے سب کچھ کرتے ہیں۔ اب آپ ہی مجھے بتایئے۔ بچے کھلونوں سے کھیلیں گے۔ تو انہیں بکھیر کر ہی کھیلیں گے۔ توڑیں گے بھی پھینکیں گے بھی۔ یہ بات ناراضگی کا سبب بن جاتی ہے۔ اب آپ ہی بتایئے میں کس طرح ان شکایت دور کروں۔ میں تو شکایتیں دور کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔"

شگفتہ ساری بات چپ چاپ سنتی رہیں اور پھر آخر میں بولیں۔

"عورت اپنی محبت کے بل پہ سب کچھ منوا سکتی ہے۔ تم نے یہی کیوں سوچا کہ تم ماننے کے لیے ہی یہاں آئی ہو۔ سمجھدار ہو، پڑھی لکھی ہو۔ منوایا کیوں نہیں؟"

"اس کمزوری کا احساس مجھے اب ہو رہا ہے۔" نائلہ نے اعتراف کیا۔

شگفتہ نے اس کی طرف دیکھا اور رسان سے بولیں۔

"اگر کمزوری کا احساس ہو گیا ہے تو اسے دور کرنے کی کوشش بھی کرو۔"

"مگر کس طرح؟" نائلہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اس سے دور رہ کر۔" شگفتہ نے بہت آسانی سے تجویز دی۔

"شادی کے بعد تم اس سے کتنا عرصہ دور رہی ہو"

"شادی کے اوائل دنوں میں ایک آدھ بار میکے گئی ہوں۔ وہ بھی چند دنوں کے لئے۔ لمبا عرصہ ہو گیا۔ ملتان سے باہر ہی نہیں گئی۔ پہلے ولید کا دل نہیں لگتا تھا میرے بغیر۔ اب بچوں تعلیمی مصروفیات اجازت نہیں دیتیں۔"

"روٹی توے پہ ایک طرف سے ہی پڑی رہے تو وہ بھی جل جاتی ہے، ہم تو پھر انسان ہیں سال چھ ماہ میں پنڈی کا چکر لگا لیا کرو۔ اپنے والدین کی طرف۔ پھر تمہارے بھائی بھی تو ہیں۔"

"دو بھائی پنڈی میں ہی رہتے تھے لیکن اب بڑے بھیا کی تقرری سوات میں ہو گئی ہے ایک بھائی لاہور میں رہتا ہے۔" نائلہ نے تفصیل بتائی۔ "اکثر یہ لوگ خود ہی آ جاتے ہیں۔ میرا نہیں ہو پاتا۔"

"تمہارے آنے جانے سے ولید کی توطیت کم ہو گی۔ تم سراسر ولید کی شخصیت میں ڈھل

گئی ہو، ویسے تو یہ بہت اچھی بات ہے یہ لیکن اس کے باوجود بھی وہ مطمئن نہیں رہتا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ تم ہمیشہ اس کی بات پہ بس کہتی ہو جس سے اس کی عادت مزید پختہ ہوتی جا رہی ہے۔ اور تمہاری قدر ختم ہو رہی ہے۔ ذرا سوچو ابھی تو تم جوان ہو۔ ہمہ وقت الرٹ رہتی ہو۔ وقت کے ساتھ ساتھ تم تھکتی جاؤ گی اور عمر کے آخری حصے میں اس کا یہ وہم تمہیں کیسے لگے گا نجانے اولادیں اس وقت کہاں کہاں ہوں۔ اس لیے اسے کبھی کبھی تنہا چھوڑا کرو اور پھر دیکھو۔ وہ خود کو تنہا پا کر اس توازن کی بیماری میں تمہیں کتنا مس کرتا ہے۔ اسے تمہاری زیادہ ضرورت ہے یا اس بیلنس کی۔ گھر اگر بچے اجاڑ دیتے ہیں تو بچوں سے ہی کہا کرو۔ وہ درست کریں۔ ہو سکے تو کوئی کام والی اپنی مدد کے لئے رکھ لو۔"

"کام والی کچھ الٹا سیدھا کرے گی۔" نائلہ جھٹ بولی۔

"نہیں وہ تم پر ہو گا، تم نظر انداز کرنا۔ رفتہ رفتہ وہ اس ماحول کا عادی ہو جائے گا۔ خود کو آہستہ آہستہ اس نظام سے باہر نکالو ورنہ ولید ہی نفسیاتی کیس بن جائے گا۔ اس سے قبل وہ تمہارے لیے تکلیف کا سبب بنے۔ اسے اس مرض سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کرو مگر آہستہ آہستہ۔"

نائلہ سر جھکائے شگفتہ کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہی تھی۔

☆☆☆

شگفتہ اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ باپ سے ملنے گاؤں چلی گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے مسلسل دو دن خاموشی تھی حالانکہ سب ہی اپنے اپنے گھروں میں موجود تھے، لیکن شگفتہ کے آنے کی وجہ سے سابقہ چار دن تک اتنا ہنگامہ رہا تھا کہ ان کے جانے کے بعد سارے ہی گھر خالی خالی سے ہو گئے تھے لیکن عاذان کا تو دل بھی خالی ہو گیا تھا جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ پھوپھو اپنے بڑے فرزند کے لیے مریم کو نہ صرف منتخب کر چکی ہیں بلکہ رشتہ بھی ڈال گئی ہیں لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا ہے۔

وہ ماں باپ سے بضد تھا کہ مریم کو تائی امی سے اس کے لیے مانگیں۔ والدین اپنے بیٹے کے لیے اس سے عمر میں بڑی بہو لانے کے لیے رضامند نہیں تھے جبکہ عاذان کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ شادی کرے گا تو مریم سے ورنہ کسی سے بھی نہیں۔

چار و ناچار سائرہ اور فواد عاذان کی خواہش پوری کرنے کی غرض سے طاہرہ کے پاس چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ طاہرہ خود ہی اس رشتے سے انکار کر دے گی۔ سمیع کی حیثیت کے سامنے عاذان کا مستقبل کچھ اتنا خاص نہیں تھا۔ لیکن ان کی سوچ کے برعکس ہوا۔

طاہرہ کے لیے اپنی بیٹی کے لیے عاذان کے رشتے سے اچھا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس چیز کا اظہار طاہرہ نے خود اپنے منہ سے کیا۔ وہ اپنی بیٹی کو دیار غیر بھیجنے پہ ذرا بھی رضامند نہیں تھیں اور

چاہتی تھیں، تینوں بیٹیاں آس پاس رہیں۔ سو، طاہرہ نے ہامی تو نہیں بھری تھی البتہ انکار بھی نہیں کیا تھا۔

عاذان کو قوی امید تھی کہ ایک دو بار کے بعد اقرار ہو جائے گا۔

مریم ماں کے اس فیصلے پر رضا مند نہیں تھی۔ وہ سخت متذبذب تھی کہ کیا کرے۔ وہ اپنی بات کسی طرح ماں تک پہنچانا چاہتی تھی۔ ایسے انداز میں کہ ماں کی دل آزاری بھی نہ ہو اور وہ اس کا موقف بھی سمجھ جائیں۔ سو اس نے اسی مقصد کے لیے نائلہ کا انتخاب کیا تھا۔

☆☆☆

شام کے ملگجے سائے پھیل رہے تھے برسات کی وجہ سے ہوا میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ گو گرمی بھی رخصت نہیں ہوئی تھی لیکن موسم کی تبدیلی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ نائلہ اپنے لان میں پانی ڈال رہی تھی، مریم کو آتا دیکھ کر مسکرائی۔

''آج ہماری بقراط صاحبہ کو ہمارے پاس آنے کا کیسے وقت مل گیا۔'' مریم شگفتگی سے مسکرادی۔

حالانکہ اس کے اندر غلط فیصلہ ہو جانے کا انجانا سا خوف تھا۔ لیکن چہرے پہ وہی بشاشت اور سکون کی کیفیت تھی جو اس کی شخصیت کا خاصا بن چکی تھی۔ نائلہ نے پانی ڈالنے کے بعد نل بند کر دیا۔

مریم وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''بس ذرا جی نہیں لگ رہا تھا اس لیے ادھر چلی آئی۔''

''خیریت ہے۔ جی کہیں پھینک تو نہیں دیا؟''

مریم ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ نائلہ بھی اس کی ہنسی میں شامل تھی۔

''یہیں بیٹھو گی یا اندر چلو گی؟'' نائلہ فارغ ہو کر اس کے سامنے کرسی کھینچتے ہوئے بولی۔

''مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ اندر چلیں تو زیادہ مناسب ہو گا۔''

نائلہ چوکنا ہو گئی اور اسے اپنی ہمراہی میں اندر لے آئی۔

''اب بتاؤ کیا بات ہے؟''

مریم تھوڑی دیر خاموش رہی پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولی۔

''آپ کو تو معلوم ہی ہے پھوپھو اپنے بیٹے کے لیے مجھے مانگ رہی ہیں۔''

''ہاں۔ ہاں۔ پھر......؟''

''مگر امی نہیں چاہتیں۔ امی کہتی ہیں، میں اپنی کسی بھی بیٹی کو خود سے اتنا دور نہیں بھیجوں گی۔''

نائلہ نے دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا۔ مریم کی بات ابھی جاری تھی۔

''امی بھی صحیح کہتی ہیں۔ آخر ہمارے سوا ان کا ہے ہی کون۔ لیکن......''

''لیکن...... کیا؟'' نائلہ کے متوجہ ہونے پہ مریم چپ ہو گئی۔

''ایک دوسرا پرپوزل بھی آ رہا ہے۔ سائرہ آنٹی اور فواد انکل عاذان کا رشتہ لے کر آئے ں۔ امی چاہتی ہیں کہ انہیں ہاں کر دیں۔''

نائلہ کے چہرے پر خوشی عود آئی۔

''لیکن آپی! ایسا میں نہیں چاہتی۔''

''کیوں؟'' نائلہ کے چہرے سے خوشی یکدم بھاگ گئی۔ ''کیا برائی ہے عاذان میں؟''

''عاذان میں کوئی برائی نہیں، خوش شکل ہے۔ خوش اخلاق ہے اور خوشحال زندگی گزار رہا ہ لیکن آپی! وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے۔''

''پگلی! آئیڈیل کبھی کسی کو ملا ہے۔ وہ گھر کا لڑکا ہے بچپن سے تم ایک دوسرے کو جانتے ۔ فٹافٹ ہاں کہہ دو۔''

مریم چپ چاپ نائلہ کا منہ دیکھتی رہی پھر سنجیدگی سے بولی۔

''کیا ایک دوسرے کو جان لینا ہماری خوشحال زندگی کی ضمانت ہوتا ہے۔ کیا آپ چاچو کو ں جانتیں یا چاچو آپ کو نہیں جانتے۔ جاننے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی عادتوں کو ا لیں۔ آپ نے چاچو کی کتنی عادتیں اپنائی ہیں۔ اور چاچو نے آپ کی کتنی......؟''

''یہ تو مرد مرد کی بات ہوتی ہے۔'' نائلہ تھوڑے توقف سے بولی۔

''آپی! یہ عادت نہیں ہوتی۔ مزاج ہوتا ہے۔''

''مزاج بھی تو عادتوں سے ہی بنتا ہے۔'' نائلہ فوراً بولی۔

''اور عادتیں کیسے بنتی ہیں؟' مریم نے سوال کیا۔

''ماحول سے۔ کچھ فطری ہوتی ہیں اور کچھ موروثی۔''

''اور موروثی عادتیں نسل در نسل چلتی ہیں۔ خواہ یہ اچھی ہیں یا بری۔'' مریم نے نائلہ کی ت آگے بڑھائی۔

''چاچو میرے چاچو ہیں اور عاذان میرا کزن۔ ان کے خون میں منوانے کی عادت زیادہ ،اور ماننے کی کم۔ پھر میری اور عاذان کی عمر میں پورے چار سال کا فرق ہے، یہ فرق ہمارے مابین ہمیشہ ایک خلیج رہے گا اور شاید اس کمی کی وجہ سے برتری کی شدت اور زیادہ ہو جائے۔ عاذان ،اور قلندر را سا ہے۔ میں نے کبھی اس کے بارے میں ایسا نہیں سوچا۔ ہاں شاید اگر ہما کے لیے ، رشتہ قبول کر لیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ آپی! میں کسی ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہتی ہوں جس کے ل کے بارے میں نظریات میری طرح ہوں۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز کو میری طرح ہی دیکھتا ، پتا ہو۔ آپ کی اور چاچو کی زندگی میرے سامنے ہے۔ آپ لوگوں کی عمروں میں دس سال کا

فرق ہے۔ آپ لوگوں کے درمیان محبت بھی زیادہ ہے لیکن زندگی آئی لو یو کہتے تو نہیں گزرتی دن رات کے لمحوں میں ایسے مرحلے آتے ہیں جو ہمیں ایک دوسرے کے لیے قربان کرنا پڑتے ہیں اور قربانی جب دونوں طرف سے ہو۔ تب ہی خوش حال زندگی گزر سکتی ہے وگرنہ ایک مانتا اور ایک منواتا ہی رہتا ہے، اس کے باوجود دونوں ہی مطمئن نہیں رہتے۔ آنی! زندگی محبت کے سہارے گزر جاتی ہے لیکن دکھ دے دے کر گزرتی ہے۔

میرے نزدیک دونوں فریقین کا ہم مزاج ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اور اگر قسمت ہم ساتھ دے رہی ہو تو ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بندہ ہم مزاج نہ سہی، مزاج کے آس پاس ہو۔'' نائلہ یک ٹک حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہم مزاج بیوی مرد کے لیے تحفہ ہوتی ہے جبکہ مزاج نہ ملیں تو ساری عمر بیوی شوہر کا طعنہ سہتے سہتے ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ جوڑ ملانا نہیں جانتی، وہ سکھ نہیں پا سکتی۔ لیکن اس خاندان کا المیہ ہے کہ یہاں عورت ڈھلنے کے باوجود بھی مرد کے چڑچڑے پن کو دور نہیں کر سکتی۔ جو سانچے میں جاتے ہیں ان کا ٹوٹ کر دوبارہ بننا صرف ایک خواب ہے۔ عمر کا تناسب کوئی اہمیت نہیں رکھتا بشرطیکہ انسان ہم مزاج ہوں۔

آنی! میں اپنی زندگی کو کسی تجربے کی نظر نہیں کرنا چاہتی اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ اماں کو کوئی دکھ دوں لیکن مجھے اس چیز کا یقین ہے میری خوشی میں ہی میں ماں کا سکھ ہوگا۔ سمیع میں وہ کچھ ہے جسے میں نے انجانے میں سوچا اور چاہا ہے۔ لیکن امی کہتی ہیں میں دور ہو جاؤں گی فاصلے تو فاصلے ہی ہوتے ہیں۔ چاہے قریب کے ہوں یا دور کے۔ اگر انہیں میرے دل کا خیال میں ان کے دل سے کبھی دور نہیں ہو سکتی۔''

مریم خاموش ہو گئی۔ نائلہ کے اندر جیسے کچھ ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا مریم اپنی دکھ نہیں اس کی ذات کی تشریح کر رہی ہے، کتنے پیارے اور اچھے انداز میں۔ عورت کچھ بھی ہے حوا کی بیٹی۔ ایک جیسی، بالکل ایک جیسی۔ حساس اور دور اندیش۔

''مجھے امید ہے آپ اس معاملے میں میری احسن طریقے سے مدد کریں گی۔''

نائلہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پُر یقین انداز میں اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔ مریم کو بے حد تقویت ملی۔

''کون کہتا ہے لڑکیوں کو پڑھانا نہیں چاہیے۔'' نائلہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

مریم ہنس پڑی۔ ''اور کون کہتا ہے پڑھی لکھی عورت اچھی گرہستن نہیں ہوتی۔'' مریم توصیفی انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

اس بار دونوں ایک ساتھ ہی ہنسی تھیں۔

☆☆☆

تین دن پہلے مریم اس کے پاس آئی تھی، آج چوتھا دن تھا لیکن اس کے باتوں کا اثر نائلہ پہ ابھی تک غالب تھا۔ طاہرہ کو اس نے بہت اچھی طرح اپنی طرف سے قائل کیا تھا لیکن ابھی تک ان کے فیصلے کے بارے میں کچھ علم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ رات کھانے کے برتن دھوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''یوں تو طاہرہ بھابھی بہت سمجھدار ہیں اور تھوڑا بہت پڑھی لکھی بھی ہیں۔ اور پھر اولادیں جب پڑھ لکھ جائیں تو والدین کے نظریات خاصی حد تک بدل جاتے ہیں، انہیں کسی جابر حکمران کی طرح اپنے فیصلے کو مریم پہ مسلط تو نہیں کرنا چاہیے۔ آخر وہ سوچیں گی تو سہی۔ میں نے خوامخواہ تو ان کی بیٹی کی وکالت نہیں کی ہے۔ کچھ تو ہے جو میں ان کے ذاتی معاملے میں دخل دینے پہنچ گئی ہوں۔ لاکھ قریبی رشتہ ہے لیکن کوئی خوامخواہ تو مداخلت نہیں کرتا اور وہ میری عادت سے واقف بھی ہیں۔ خیر جو کچھ بھی ہوگا۔ اللہ بہتری کرے گا۔ باقی مریم کا نصیب۔''

وہ سوچتے ہوئے کچن کی لائٹ آف کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ ولید اپنے بستر پہ نہیں تھے۔ کمرے سے ملحقہ اسٹڈی روم کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ ادھر ہی آ گئی۔

''آپ ابھی سوئے نہیں؟''

''نہیں بس نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے اسٹڈی میں چلا آیا لیکن یہاں تو ساری کتابیں ہی الٹی پڑی ہیں کون آیا تھا یہاں.....؟''

''شاید سمیع یا عبداللہ آئے ہوں۔ آپ کو معلوم ہے مجھے اتنی فرصت نہیں ہوتی۔'' وہ اپنے بال ہیئر بینڈ سے آزاد کرتے ہوئے بولی۔

''میری دو کتابیں غائب ہیں۔ ''شہاب نامہ'' اور ''کیسے مانوں میرا ہے۔''

نائلہ سونے کے لیے بستر پہ جا رہی تھی لیکن ولید کی تشویش پر اندر آ گئی۔

''یہیں ہوں گی اور کہاں جا سکتی ہیں۔''

اس نے تھوڑی سی تلاش کے بعد دوسرے ریک میں سے دونوں کتابیں ولید کے سامنے رکھ دیں۔

ولید تھوڑا سا کھسیا گئے۔ ''شکریہ۔ جس چیز کو جہاں رکھ دیتا ہوں۔ وہیں ڈھونڈتا ہوں۔ یہ بھی شروع سے عادت ہے۔''

''انسان بھول بھی تو سکتا ہے۔'' نائلہ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری یادداشت شروع سے بہت اچھی ہے۔ میں کم ہی بھولتا ہوں۔''

(شاید مجھے بھی آپ نے کہیں سنبھال کر رکھ دیا ہے۔ اس ترتیب زدہ زندگی میں، کسی کتاب کی طرح اور روز دیکھ لیتے ہیں اس ترتیب میں شامل ہوں اور بس۔ کاش بھولنے کی عادت ہوتی تو کم روز مجھے بھی ڈھونڈنے کا خیال ہی آجاتا۔)

"کہاں کھو گئیں؟" ولید نے نائلہ کی طرف دیکھا۔

"یہ کتاب بہت زبردست ہے۔" کیسے مانوں میرا ہے۔" کتاب اٹھاتے ہوئے نانا نے کہا۔ "میں اسے کئی بار پڑھ چکی ہوں۔ ہر بار بہت اچھی لگتی ہے۔ پروین شاکر کے بعد اس شاعرہ نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔"

ولید ہلکا سا مسکرا دیے۔

"تمام عورتیں ایک جیسے خیالات کی مالک ہوتی ہیں جو لفظوں کے ہنر سے واقف ہو جاتی ہیں وہ شاعرہ بن جاتی ہیں۔"

"اور تمام مرد؟" نائلہ بحث کے ارادے سے بال سمیٹتے ہوئے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"یہ تو عورتیں ہی تجزیہ کر سکتی ہیں۔" ولید نے جان چھڑائی۔

"بڑے ہی رنگ برنگے ہوتے ہیں۔ زندگی کے آخر تک سمجھ ہی نہیں آتے۔ محبت کر۔ ہیں تو ان سے پیار کوئی نہیں ہوتا۔ نفرت کرتے ہیں تو ان سا سنگ دل کوئی نہیں ہوتا۔" نائلہ کہے نہ رہ سکی۔

ولید ہنس پڑے۔ پھر کتاب رکھ کر مکمل توجہ اس کی طرف کر لی۔

"بہت شکایات ہیں تمہیں مجھ سے۔"

"صرف ایک شکایت دور کر دیجیے۔ ساری شکایتیں دور ہو جائیں گی۔" نائلہ ان کا خوشگوار موڈ دیکھتے ہوئے پھیل گئی۔

"کیا؟" انہوں نے ایسے پوچھا جیسے مان جائیں گے۔

"وہم کرنا چھوڑ دیجیے۔"

ولید خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے۔

"میری بھی ایک شکایت دور کرنا ہوگی۔"

"کیا؟" نائلہ جلدی سے رضامند ہو گئی۔

"لاپروائی کرنا چھوڑ دیجیے۔"

نائلہ نے سر پکڑ لیا۔ "غابت ہو گیا دنیا گول ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"کیا کہا؟" ولید ذرا سا جھکے۔

"تعریف کر رہی ہوں آپ کی۔" وہ ذرا جل کر بولی تو ولید ہنس پڑے۔"

"شکریہ۔ ذرہ نوازی۔" نائلہ جل کر اٹھ گئی۔

"یہ اپنے عاذان کے بارے میں کچھ پتا چلا تمہیں۔"

"کیا گم ہو گیا؟" نائلہ نے پلٹ کر پوچھا۔

"ارے نہیں بھئی۔ سنا ہے اس کا پروزل مریم کے لیے جا رہا تھا۔ شگفتہ آپا نے بھی سمیع کے لیے مریم کو مانگا تھا۔"

"پھر.....؟"

"طاہرہ بھابھی نے انہیں انکار کر دیا اور شگفتہ آپا کو ہاں کر دی۔"

نائلہ نے سکون کا سانس خارج کیا۔

"شگفتہ آپا تو بڑے ابا کی طرف گئی ہوئی ہیں۔" نائلہ انجان بنی۔

"ارے بھئی ٹیلی فون ہے نا وہاں، آپا تو بہت خوش ہیں۔ کہہ رہی ہیں ابا کو لے کر آئیں گی اور جلد ہی انگوٹھی پہنانے کی رسم کریں گی۔ جبکہ..... عاذان سخت جذباتی منتشر اور بدظن ہو رہا ہے۔ فواد بھائی آئے تھے میرے پاس۔ بہت پریشان ہو رہے تھے عاذان کی طرف سے کہہ رہے تھے، بغاوت پہ اتر رہا ہے۔ جوان خون ہے کہیں کچھ نقصان نہ کر بیٹھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔"

"ہم کیا بتا سکتے ہیں؟"

نائلہ کہتے ہوئے اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی۔ ولید بھی کتاب رکھ کر سونے کے ارادے سے اٹھ چکے تھے۔

☆☆☆

"ہیلو۔ ینگ مین! کیا کر رہے ہو؟"

"جاؤ سہیلی! میں آپ سے بات نہیں کرتا۔ دوست وہ ہوتے ہیں جو برے وقت میں کام آتے ہیں۔ آپ نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ وقت کیسا گزر رہا ہے۔"

"فی الحال تو مجنوں کے جانشین نے والدین کو مشکل میں ڈال رکھا ہے۔"

"یہ بات والدین کو خود سوچنی چاہیے تھی اور کیا وہ اتنی بچی ہے۔ اسے میرے جذبات کا علم نہیں ہو سکا۔"

"تو اس سارے ڈرامے میں لڑکی کا کیا قصور ہے۔ جب تم مرد ہو کر اپنی بات نہیں منوا سکے، وہ تو پھر عورت ہے۔"

"ٹھیک ہے آجائیں بڑے ابا۔ سب فیصلے ہو جائیں گے۔ وہ پوتے پہ لوا سے کو کیسے ترجیح

دیتے ہیں۔"

"کیوں بے وقوف بن رہے ہو۔ مریم کے سوا اور بھی بہت سی لڑکیاں ہیں۔"

"مگر مریم ہی کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ وہ تم سے چار برس بڑی ہے۔"

"تو کیا میں اسے تحفظ نہیں دے سکتا۔" عاذان ٹوٹ رہا تھا۔

"سب کچھ دے سکتے ہو۔ لیکن وہ نہیں جو مریم چاہتی ہے۔"

"وہ کیا چاہتی ہے؟"

"وہ تمہیں ہما کے لیے پسند کرتی ہے۔"

"واٹ ڈو یو مین۔" عاذان اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شکل ایسی ہو گئی تھی جیسے کوئی کڑوی زہریلی چیز منہ میں آ گئی ہو۔

نائلہ چپ چاپ اس کی شکل دیکھتی رہی پھر توقف سے بولی۔

"جس چیز کا لوگوں کو علم نہیں، اسے سب پہ کیوں ظاہر کرتے ہو۔ کیوں والدین کو تنگ کر رکھا ہے۔ کبھی ایک ہاتھ سے تالی بجی ہے؟ نہ تو تمہارے دل ملتے ہیں اور نہ مزاج پھر کس بنیاد پر زندگی گزارو گے۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ وہ مجھے ہما کے لیے پسند کرتی ہے۔" عاذان سے ابھی تک یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"اس نے خود...... اس لیے کہ اس کی نظر میں ہما سے تمہارا مزاج بہت ملتا ہے۔" نائلہ دانستہ ایسی بات کر رہی تھی تاکہ عاذان کے دل میں مریم کی طرف سے نفرت آ جائے۔

"اور اس کا مزاج سمیع سے ملتا ہے اور......"

"اور میرا تو مزاج شہر میں اور بھی بہت سی لڑکیوں سے ملتا ہے۔ تو کیا میں سب کو اپناؤں۔ وہ لوگ اجنبی ہوتے ہیں۔ نہ انہیں عادتوں کا پتا ہوتا نہ مزاجوں کا حتیٰ کہ صرف ناموں سے واقف ہوتے ہیں۔ شکلیں بھی دیکھی نہیں ہوتیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے ہو سکتے ہیں۔ ہم تو پھر کزن ہیں اور دور جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ کی اور چاچو کی ہی مثال لے لیجیے۔ کیا برائی ہے آپ کی زندگی میں جبکہ شادی سے پہلے آپ لوگ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔"

نائلہ کے ہونٹوں پہ تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"صرف...... یہی فرق ہے تم میں اور مریم میں۔ وہ جو کچھ دیکھتی ہے وہ تم نہیں دیکھ سکتے نہ محسوس کر سکتے اور نہ سمجھ سکتے۔ وہ حساس ہے اور تم جذباتی۔"

"یہ کہیے۔ وہ پڑھی لکھی ہے اور میں ان پڑھ۔"

"آج یہ بات تم مجھ سے کہہ رہے ہو۔ بالفرض کل وہ تمہاری ہو گئی۔ لمحہ لمحہ تمہیں اس چیز کا احساس ہو گا یا نہیں۔ وہ تم پہ رعب نہیں بھی جما رہی ہو گی۔ تب بھی تمہیں ایسا ہی لگے گا کہ وہ تم پہ تعلیم کا رعب ڈال رہی ہے۔ تب تمہیں کیسا لگے گا۔ اس کی خوبی کو سراہو گے یا اپنی کمزوری کو روؤ گے۔"

"عاذان! یہ بات مرد کی فطرت میں شامل ہوتی ہے۔ وہ صرف حسن میں تو خود سے زیادہ عورت کو قبول کر سکتا ہے باقی ہر برتری...... اس کے لیے احساس کمتری بن جاتی ہے۔ خواہ وہ کچھ بھی ہو۔ تمہارا اور مریم کا کوئی میل نہیں۔ تم اس خواہش کا بار بار اظہار کر کے اپنا وقار گرا رہے ہو۔ ہو سکتا ہے مریم نے خود ہی اس رشتے سے انکار کیا ہو۔"

عاذان نے ٹوٹے بکھرے انداز میں نائلہ کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ کسی معصوم بچے کی طرح لگ رہا تھا۔ جو اپنا من پسند کھلونا لینے سے محروم رہ گیا ہو۔

(مجھ سے پوچھو تو میں اس دوراہے پہ کھڑی ہوں۔ مجھ سے عمر میں دس سال بڑے ولید میری شوخیوں کو بے وقوفی کہتے ہیں۔ شادی کے بعد جانتے ہو ہمارے درمیان سب سے پہلا جھگڑا کس بات پہ ہوا تھا۔

شادی کی پہلی رات...... میں جیولری اتار کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر سو گئی تھی اور صبح یہی بات ہمارے درمیان ناراضی کا سبب بنی تھی۔ ولید کا موقف تھا کہ مجھے ساری جیولری باکس میں رکھ کر سونا چاہیے تھا جبکہ مجھے تھکن اور نیند کی وجہ سے اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ جس شخص نے پہلی رات کی ان کی غلطی ہی معاف نہیں کی تھی، وہ شخص باقی زندگی میں کیا گنجائش دے سکتا ہے۔ آج تک ولید وہیں کھڑے ہیں جبکہ میں کہاں سے کہاں آ گئی ہوں۔)

بہت دیر تک دونوں طرف خاموشی رہی۔ نائلہ اپنے خیالوں میں گم تھی اور عاذان اپنی ...وں میں مبتلا۔ کچھ دیر کے بعد عاذان نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"ٹھیک ہے۔ میں یہاں سے کچھ عرصہ کے لیے چلا جاؤں گا۔" اس کا لہجہ بے حد شکستہ اور بوجھل ہو رہے تھے۔

"تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔ تمہیں نہ تو مریم سے کچھ دلچسپی تھی اور نہ اس کے جانے سے تمہیں کچھ فرق پڑنا چاہیے۔"

"آئی ایم سوری۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔" عاذان گھٹنوں پہ زور دے کر کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح بڑے ابا کے ہمراہ شگفتہ اپنے دونوں بیٹوں سمیت موجود تھیں۔ طاہرہ ہاں شام کو چھوٹی سی تقریب منعقد تھی۔ ٹیلی فون پہ اقرار تو ہو گیا تھا لیکن انگوٹھی پہنانے کی رسم ا باقی تھی۔ شگفتہ نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے تو انتخاب خود کر لیا تھا لیکن چھوٹے کے لیے متذبذ تھیں' کبھی ان کا دل مشعال پہ آ رہا تھا اور کبھی وریشہ پہ.....

یہ ساری کارروائی فواد حسن کے ہاں طے ہو رہی تھی۔

بظاہر عاذان اس کارروائی میں شامل نہیں تھا لیکن گھر میں ہونے والی گفتگو سے عاجز نہیں تھا۔

نجانے کیا وجہ تھی وریشہ کا نام سن کر عاذان کے اندر دبی چنگاری ابھر رہی تھی۔ مریم کو دینے کے بعد وہ وریشہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن شاید یہ بھی اس کا جذباتی فیصلہ ہو۔

وہ خاموشی سے پڑا رہا اور سب کچھ سنتا رہا۔

دل تو چاہتا تھا۔ باہر جائے اور دادا حضور سے عرض کرے کیا سارا مال باہر ہی ایکسپور کریں گے۔ کیا آپ کی قریب کی نظر کمزور ہے۔ کیا آپ کو جوان اور خوبرو پوتا نظر نہیں آتا لیکن نروٹھے سے انداز میں پڑا رہا۔ ''میری بلا سے باہر کریں یا اندر۔ بہت ہیرے جڑے ہوئے ہیں نا نواسوں میں۔ ایک ایک نواسے کو دو دو پوتیاں دے دیں۔ مجھے کیا۔ لیکن مشعال کا رشتہ ہرگز وہاں نہیں ہوگا۔''

''ارے بھئی یہ اپنا عاذان کہاں ہے' نظر نہیں آ رہا۔ کہیں گیا ہوا ہے کیا؟''

''طبیعت صحیح نہیں ہے اس کی صبح سے گھر میں ہی پڑا ہوا ہے۔''

سائرہ نے بجھے بجھے سے انداز میں بتایا جبکہ فواد نے باپ کو تھوڑا بہت بتا دیا تھا۔ اس کے بارے میں۔

''ایسی بھی کیا طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ جو گھر میں پڑا ہے اور ہم سے ملتا بھی نہیں۔ ہ طبیعت کی خرابی میں سفر طے کر آئے۔''

وہ بولتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھا اس کے کمرے میں پہنچ گئے۔

''کیوں میاں! کمرے کو حجام کی دوکان بنا رکھا ہے؟'' وہ دیواروں پر چسپاں انگریز ماڈلز کی اوٹ پٹانگ سی تصاویر دیکھتے ہوئے بولے۔ عاذان انہیں اچانک کمرے میں پا کر حواس باختہ ہو گیا۔

''آیئے بڑے ابا! بیٹھیے۔''

''ذرا پہلے تمہارے انتخاب کو اچھی طرح سے تولوں۔'' وہ عینک لگا کر تصویروں کا معائنہ

کرنے لگے۔

''پلیز بڑے ابا!'' وہ ایک منہ اسکرٹ میں ملبوس ماڈل کی تصویر کے سامنے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ''آپ یہاں کیوں آ گئے۔ آپ کا وضو ٹوٹ جائے گا۔''

''برخوردار تم سے کس نے کہا ہم وضو کیے ہوئے ہیں۔''

''اچھا!'' اس نے مسکین سی صورت بنائی۔ ''حالانکہ آپ کی عمر تو یہی کہتی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا کہا؟ اور یہ تم نے اپنا کیا حال بنایا ہوا ہے' ایسا لگتا ہے ''شاہ رکن عالم'' پہ مستقل ڈیرا ڈالنے والے ہو۔''

''ایسے ہی بڑے ابا! بس طبیعت صحیح نہیں تھی۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''جی بالکل۔'' مؤدب لہجے میں بولا۔

''اچھا بھئی تم سے کچھ بات کرنا تھی۔' وہ بیٹھنے لگے۔

''باہر ہی آ جایئے۔ وہیں کر لیں گے۔'' وہ تصویر کے سامنے سے ہٹتے ہوئے بوکھلا رہا تھا۔

''کیوں کیا یہ سب سن لیں گی۔'' بڑے ابا تصاویر کی طرف دیکھ کر ہنسے۔ ''بے فکر رہو۔ پھر بھی نہیں بھاگتیں۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ وہ بات یہ ہے..... شگفتہ عبداللہ کے لیے مشعال کو مانگ رہی ہے۔''

''ہماری ایک ہی بہن ہے اور ہم اپنی بہن کو پردیس نہیں بھیجنا چاہتے۔'' اس نے انتقاماً انکار کر دیا۔

''برخوردار! تم سے صلاح کون مانگ رہا ہے۔ ہم تو محض بتا رہے ہیں تمہیں۔ ہم نے شگفتہ کو ہاں کر دی ہے۔ بڑے سے مریم اور چھوٹے سے مشعال..... چونکہ تم مشعال سے بڑے ہو اور ہمارے سب سے بڑے پوتے بھی ہو۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ مریم اور مشعال سے پہلے تمہیں اس بندھن میں باندھا جائے گا؟''

''مگر کس کے ساتھ؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ شام کو پتا لگ جائے گا۔ بس ذرا یہ ڈاکوؤں والے حلیے کو درست کر لینا۔ کہیں لڑکی نہ ڈر جائے۔''

''مگر بڑے ابا یہ زیادتی ہے میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں جس پہ آپ یوں فیصلہ مسلط کر دیں گے۔'' وہ بگڑا۔

''چونکہ تم ہمارے بچے ہو اور دودھ بھی پیتے ہو اس لیے دودھ پیتے بچے ہی ہوئے۔''

''میں بغاوت کر دوں گا۔ یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔''

''تو پھر اب تک کیوں نہیں بھاگے۔ اس لیے کہ کچھ تو ہے جس نے تمہارے پاؤں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو تم نے اب تک ایسا نہیں کیا۔ ذرا سوچو کہ وہ کیا ہے؟''

فاروق حسن کمرے سے نکل گئے تھے اور عاذان ان کے جملے کی بازگشت میں کھو چکا تھا۔

☆☆☆

شام کو لان میں سب ہی جمع تھے۔ ہر ایک کی تیاری اور سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی گو کہ گرمی کا موسم ابھی جاری تھا لیکن جاتی گرمی اپنا جوبن تیز ہواؤں کے سپرد کر رہی تھی۔

خواتین کی اکثریت نے کاٹن چکن کے ہلکے ہلکے رنگوں کے کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے۔ تقریباً مردوں نے بھی لٹھے کے کرتے شلوار پہن رکھے تھے۔ کسی کے گلے پہ ملتانی کڑھائی تھی اور کسی کے صرف تارکشی تھی۔ ہر ایک اپنی جگہ جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا لیکن نائلہ کی سج دھج سب سے مختلف اور نفیس تھی۔ اس نے گرے کلر کی شیفون کی ساڑھی اور نیٹ کی آستینوں والا بلاؤز زیب تن رکھا تھا۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا اور نفیس سی ہیرے کی جیولری کے ہمراہ ہلکا پھلکا سا میک اپ۔ وہ بلاشبہ محفل کی جان لگ رہی تھی۔

شگفتہ نے آج صبح ہی اپنے ہونے والی بہوؤں کے لیے منگنی کے لباس خریدے تھے۔ کاٹن نیٹ کے ہلکی ایمبرائیڈری کے سوٹ۔ مریم کے لیے فیروزہ اور مشعال کے لیے گلابی وہ دونوں ہی سوٹ دونوں پہ بہت جچ رہے تھے۔ کلائیوں میں موتیا کے پھولوں کے گجرے۔ ان کی تیاری میں ہما اور دریشہ پیش پیش تھیں۔ حالانکہ یا ہر سے کوئی بھی مہمان مدعو نہیں تھا۔ مکمل طور پر فاروق حسن کی فیملی تھی۔ اور اس سے گہما گہمی ہو رہی تھی۔

شگفتہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔ ''اگر سمیع کے پپا ہوتے تو ہماری خوشی دوآتشہ ہو جاتی۔''

فاروق حسن نے ایک سرد آہ بھری۔ ''الحمدللہ وہ حیات ہیں اب نہیں تو شادی میں شرکت کر لیں گے۔''

شگفتہ باپ کا اشارہ سمجھ گئی۔ خود بھی افسردہ اور آبدیدہ ہو گئیں۔

''ہاں۔ اگر آج جواد حسن ہوتے تو ہر خوشی مکمل نظر آتی۔''

ماحول یکسر بوجھل اور افسردہ ہو گیا تھا۔

بہت دیر تک دونوں باپ بیٹی پرانی یادوں کو دہراتے رہے، طاہرہ الگ مغموم بیٹھی تھی ان کا چہرہ مطمئن اور آنکھیں اشک بار تھیں۔

اچانک ہی دریشہ کہیں سے آن ٹپکی ہمیشہ کی طرح ہنستی مسکراتی مگر چہرے پر عارضی خفگی لیے۔

''بڑے ابا! دیکھیے ناں۔ یہ عاذان مجھے چکوترا کہہ رہا ہے۔''

لیمن کلر کے کاٹن کے سوٹ میں بال کھولے واقعی وہ سرسوں کا پھول لگ رہی تھی۔

''دماغ خراب ہے اس کا تو اتنی پیاری لگ رہی ہو۔ میرا تیسرا بیٹا ہوتا تو تمہیں بھی بہو بنا لیتی۔''

شگفتہ نے اسے پیار کیا تو وہ پھولی نہیں سمائی۔ ان کی آغوش میں جا کر عاذان کو منہ ادیا۔ بڑے ابا ہنسنے لگے۔

''عاذان بھی تو تمہارا ہی بیٹا ہے۔ بہو تو اب بھی بنا سکتی ہو۔''

دریشہ کے چہرے پہ حیا کے رنگ بکھر گئے۔ اسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آیا۔

''یوں نہیں۔ آپ کے ہی فیصلے کا انتظار ہے۔''

''بھئی ہم نے تو فواد سے اور وحید سے بات کر لی تھی۔ دونوں کو ہی ہمارا فیصلہ مقدم ہے۔''

''اور عاذان.....؟'' نائلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''عاذان بھی ہماری اولاد ہے۔'' بڑے ابا کہتے ہوئے عاذان کی طرف بڑھ گئے جو ڈیک کیسٹوں میں مصروف ہو چکا تھا۔

''لو بھئی صاحبزادے! اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اعلان کریں۔ ہم تمہیں اور دریشہ کو منگنی بندھن میں باندھ رہے ہیں۔ تین ماہ کے بعد شگفتہ بارات لے کر آئے گی۔ تین ماہ کے بعد ہم ہی تمہیں دولہا بنا دیں گے۔''

یہ کہتے ہوئے بڑے ابا نے جیب سے انگوٹھی نکالی اور عاذان کی انگلی میں پہنا دی۔

''مگر بڑے ابا!'' وہ ایک دم بوکھلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ احتجاج کرے تو کس بنیاد پہ انکار کرے تو کیا وجہ بیان کرے.....اور خوش ہو تو کیسے۔

''بولو۔ اگر خوش نہیں ہو تو ہم یہ انگوٹھی واپس لے لیتے ہیں۔'' اس نے بے ساختہ دریشہ کی طرف دیکھا جو شگفتہ کے پہلو سے لگی ان کے سینے میں سر چھپائے ہوئے تھی۔ پھر اس کی نگاہیں مریم کی طرف اٹھیں اتفاق سے مریم بھی ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔

عاذان کے چہرے پہ ایسا اعتماد تھا جسے اس نے کھو کر بحال کیا تھا۔ آنکھوں میں چبھن نہیں تھی سکون تھا۔ مریم نے سکون سے نگاہیں نیچی کر لیں۔ اس کے دل پہ اب کوئی بوجھ نہیں تھا۔

''ویسے تو ٹھیک ہے۔ بس ذرا موٹی ہے۔''

وہ کہے بنا نہ رہ سکا۔ سب ہنسنے لگے۔ بڑے ابا نے اس کا کان پکڑ لیا۔

''موٹے انسان میں قوت برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تمہاری دادی بھی موٹی تھیں۔ ہمرے جیسے غصیلے آدمی کے ساتھ تب ہی نباہ ہو سکا تھا۔''

دریشہ خفیف سی ہو گئی۔ اب کی بار سب ہنسے تھے۔

پھر شگفتہ نے مریم اور مشعال کو انگوٹھیاں پہنا دیں۔ اسی طرح طاہرہ اور سائرہ نے سمیع اور عبداللہ کو انگوٹھیاں پہنائیں۔

عاذان کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر...... نائلہ اس کے پاس آ گئی۔

"کہو کیسا لگ رہا ہے۔" وہ اسے چھیڑنے لگی۔

"سہیلی اچھی لگ رہی ہے اور کوئی اچھا نہیں لگ رہا۔"

وہ بات کو ہنسی میں اڑا گیا۔ نائلہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کے دل نے اس وقت صدقِ دل سے دعا کی تھی۔

"یا اللہ ان تینوں فیصلوں کو قائم اور آباد رکھنا اور جو ہو چکے ہیں۔" اس نے ولید کی طرف دیکھا جو اپنی عمر سے مزید دوگنا بڑے بن کر معزز ہوئے بیٹھے تھے۔ "یا اللہ...... انہیں بھی راحت اور تقویت دے اور وہم سے آزاد کر دے۔"

وہ کسی نئے عزم کے تحت مسکراتی ولید کے پہلو میں آ بیٹھی۔

اچانک ہی سیفی بوکھلایا ہوا سب کے درمیان نازل ہوا اور وریشہ کو ڈھونڈتے ہوئے اس کے پاس جا کر بولا۔

"آپی! جلدی چلیے۔ بلو آپ کو سونا یوریا فیکٹری میں پکار رہا ہے اور بہت پریشان ہے۔" وریشہ یک لخت کھڑی ہو گئی۔

"سونا یوریا فیکٹری...... اتنا سا بچہ اکیلا فیکٹری میں۔"

سمیع اور عبداللہ ایک ساتھ بولے۔ چہرے پہ بے حد تعجب تھا۔ ان کی بات پہ سب ہنس پڑے۔ عاذان کا قہقہہ سب سے زیادہ بلند تھا۔

"ان کے ٹوائلٹ کا یہ نام میں نے ہی منتخب کر کے دروازے پہ درج کیا تھا۔"

اب کی بار سمیع اور عبداللہ کا قہقہہ بھی عاذان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ "کیونکہ سب سے زیادہ کھاد ان ہی کی فیکٹری میں بنتی ہے۔"

"یو آر ویری فنی۔" عبداللہ اور شگفتہ بے حد محظوظ ہو رہے تھے۔

جبکہ وریشہ عاذان کو گھورتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

سب ہی کے چہروں پہ خوشی اور تبسم رقصاں تھا۔

...... ✿ ......

پہلا قطرہ

"آج صنم آئی تھی۔ اسے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ کہہ رہی تھی مکرم کا کام پھر بیٹھ گیا ہے۔ جب تک کاروبار میں اور پیسے نہیں ڈالے لوگوں سے رقمیں وصول نہیں ہو سکتیں۔ رہی سہی رقم ڈوب جائے گی۔ مکرم بہت پریشان ہے۔ اس گھر کے علاوہ انہیں بھی کوئی دوسرا آسرا دکھائی نہیں دیتا۔ کہہ رہی تھی دو لاکھ روپے تھوڑے عرصے کے لیے دے دیں جیسے ہی سیزن اٹھے گا وہ لوٹا دے گی۔ اب میرے پاس تو اتنی رقم نہیں ہوتی۔ میں نے اسے تو یہی کہا کہ تمہارے چچا شام میں آئیں گے تو ان سے بات کروں گی۔"

"کمال کرتی ہیں بھابی آپ...... آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ ہم اس وقت خود کتنی پریشانی میں گرفتار ہیں۔ کاروبار نام کو نہیں ہے اور مہنگائی ہے کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ اخراجات تو اپنی جگہ بات۔ بیماری بھی علیحدہ ویک لگا رہی ہے۔ دن رات کسی ذہنی اذیت میں گرفتار ہوں میں...... لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس پہ آئے دن کے یہ مطالبے...... تنگ آ چکا ہوں میں۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔" میر علی کی جھنجھلاہٹ پہ صفیہ کی آنکھیں جھک گئیں۔

"میں سب کچھ جانتی ہوں میر علی مگر میں خود مجبور ہوں۔" ان کی آواز دھیمی اور گلوگیر تھی۔

ان کو قدرے احساس ہوا تو لہجہ بدل کر بولے۔

"اس سے پہلے کون سی رقم ہے جو مکرم میاں نے عارضی طور پر کہہ کر لی ہو اور پھر لوٹا دی ہو۔ ہمیشہ سیزن شروع ہونے پر ہم ہی اسے سپورٹ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حد ہوتی ہے تعاون کی بھی۔ پچاس ہزار، ایک لاکھ، ڈیڑھ لاکھ اور پھر سیزن کے آخر میں اسے نقصان ہو جاتا ہے۔" صفیہ خاموش رہیں کیونکہ میر علی صحیح کہہ رہے تھے۔

"دراصل بات یہ ہے بھابی مکرم کی نیت خود اچھی نہیں ہے یا پھر اسے کمانے کا سلیقہ نہیں

ہے۔ کاروبار ہم بھی کر رہے ہیں مگر نہ جانے وہ بے وقوف کیسے کاروبار کرتا ہے۔ سب کچھ چٹ کرا دیتا ہے۔ خود تو کما نہیں سکتا اور بیوی کو ہتھیار بنا کر یہاں بھیج دیتا ہے۔'' عدینہ کمرے میں چائے لے آئی تھی۔ چچا میاں کی نوکیلی بات اس کے دل کے آر پار ہو گئی۔ افسوس تھا تو اسے اپنی ماں پر جو اسے مجرم بنی بیٹھی تھیں۔

''یہ نہ کہو میر علی کہ اسے کاروبار نہیں آتا۔ اصل میں اخراجات ہی اتنے ہیں جو کچھ کماتا ہے اسی میں خرچ ہو جاتا ہے پھر ماشاء اللہ چھ بچے اور پھر مہنگائی.....''

''صرف چھ بچے ہی نہیں اس کے ماں، باپ بھی کہیے۔ ہم نے بیٹی دی تھی، مکرم کو سہ کی چڑیا ہاتھ لگ گئی۔ کب تک وہ اس سے سونے کے انڈے نکلواتا رہے گا..... عمر بھر کا ٹھیکا ہم بھی نہیں اٹھایا ہے کہ اس کے ماں باپ کا بوجھ بھی برداشت کریں۔ صنم جوں کی توں مفلسی میں ہے نہ ناک میں کچھ چھوڑا نہ کانوں میں اور نہ ہاتھوں میں.....''

''یہ سب ٹھیک کہہ رہے ہو میر علی..... لیکن..... صنم کے بارے میں ہمیں ہی سوچنا ہے۔''

''آخر کس، کس کے بارے میں سوچیں گی آپ۔ جس طرف دیکھو پیسے کی کل کل ہے۔ صباحت کے ہی حالات لے لیں۔ صنم سے زیادہ خستہ حال زندگی گزار رہی ہے لیکن آفرین ہے کبھی زبان پر کوئی مطالبہ لے کر یہاں آئی ہو۔ جیسے تیسے زندگی بسر کر رہی ہے۔ اسے کہتے ہیں عزتِ نفس اور خودداری۔ مکرم کے ساتھ رہ کر صنم کی خودداری بھی جیسے مر گئی ہے۔'' عدینہ چائے کی ٹرے رکھ کر کمرے سے نکل رہی تھی۔ چچا میاں کے الفاظ اس کی آنکھوں کے گوشے گیلے کر گئے۔ خودغرضی کی انتہا نہیں تو کیا تھی۔ میر علی سخت جھنجلاہٹ میں کہہ رہے تھے۔

''مجھے تو آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ بھائی میاں نے کیسی رشتہ داریاں کی ہیں۔ کبھی رشتہ جوڑ کا کیا ہوتا تو.....!'' یہ کہتے ہوئے وہ چائے پینے لگے۔

صفیہ کب سے بیٹھی تھیں۔ بے بس اور صابر..... ہمیشہ کی طرح مجسم شکر، صبر کا مفاہمت کی دیوی۔ مرد کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے والی خالص مشرقی عورت۔

''کیا مل رہا ہے ماں تجھے یہ سب کچھ سہہ کر۔'' وہ گیلی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ ''صباحت کو بچپن سے اپنی ذات پر جبر کرنے کی عادت ہے اور وہ آج تک اپنی ذات کو تختۂ مشق بنا رہی ہے ورنہ اس سے بہتر اس کے گھریلو اور معاشی حالات کون جان سکتا ہے۔''

عدینہ کچن میں آٹا گوندھنے میں معروف ہو چکی تھی لیکن اس کا دل اب بھی چچا میاں کی باتوں پر کڑھ رہا تھا۔ دل کرتا تھا چچا میاں کو جواب ضرور دے مگر کس، کس بات کا..... ''وہ تو سراسر چچا میاں کو کہتے ہیں کہ چن چن کر رشتے داریاں کیں انہوں نے۔ کیا وہ خود شامل نہیں تھے.....

شادر توں میں۔ چچا میاں کے بغیر تو اس گھر میں پرندہ بھی پر نہیں مارتا۔ کجا کے رشتے ہو جانا۔ دراصل ان لوگوں نے جان بوجھ کر مگر کیا فائدہ ہے ان باتوں سے..... شریف داماد ڈھونڈنا آج کے دور میں آسان تو نہیں۔ کتنے شریف داماد ہیں اس گھر کے۔ کبھی اونچی آواز میں نہیں بولتے۔ ان کے سامنے کتنے مؤدب رہتے ہیں۔ پیچھے چاہے کچھ بھی کریں۔ بہرحال کسی میں کوئی عیب نہیں، کوئی جواری نہیں، شرابی نہیں، کبھی کے سب خاندانی ہے۔ بس ذرا سا عیب ہے ان کی طرح بہت کاروباری نہیں۔ پیسے کی ریل پیل نہیں مگر یہ انہی کا تو..... انتخاب تھا..... کیوں زور آور گھر نہیں ڈھونڈے۔ کیوں مفلس لوگ ہی ان کی پسند کا حصہ رہے ہیں، آخر کیوں؟ اس لیے کہ بیٹیاں سر نہ اٹھا سکیں۔ اپنا حق نہ مانگ سکیں۔ صنم، صباحت، مدیحہ کیا انہوں نے بھاگ کر شادیاں کی تھیں اور ارم..... ارم تو بہت چھوٹی تھی۔ اس کا بھی کسی نے بھلا نہ سوچا۔ نوید بھائی نہایت شریف النفس انسان تھے..... اور ہیں..... مگر ..... ارم اکثر یہاں اپنے میکے میں کیوں نہیں آتی..... آہ، کیا..... فائدہ ہے ان باتوں سے..... چلو اپنے گھروں میں تو بیٹھی ہیں۔ یہی سب سے بڑی اور کامیاب خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے اور عدینہ، تمہارا..... تمہارا کیا ہو گا۔ ایسا ہی کوئی گھر تمہارے لیے منتخب کیا جانے والا ہے یا شاید کیا بھی جا چکا ہو اور کچھ ہی عرصے میں عدینہ بی بی تم بھی انہی کی لسٹ میں آ جاؤ۔ اب تم کیا کرو گی۔ ایسا ہی تفکر اور حقارت تمہارے حصے میں بھی آنے والی ہے..... تمہیں اس چیز کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔''

''اب بس بھی کرو۔ آخر کتنا آٹا گوندھو گی۔ ربڑ کی طرح ہو جائے گا۔'' بیلا نے اچانک کہا تو وہ چونک گئی۔ بیلا سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''تم کب آئیں؟''

''جب سے تم آٹا گوندھ رہی ہو اور اپنے آنسوؤں کا نمک اس میں ملا رہی ہو۔'' اسے بالکل اچھا نہیں لگا کہ بیلا نے اس کی کمزوری دیکھی۔

''کیا بات ہے، کس بات پہ آنسو بہائے جا رہے ہیں۔ ضرور کسی پیاری بہنا کے دکھ پہ یہ آنکھیں گیلی کی جا رہی ہوں گی۔'' بیلا نے گہری سرد آہ بھر کر کہا پھر خود ہی بے پروائی سے بولی۔

''دیکھو عدینہ، کسی کے دکھ پر آنسو بہانے سے اس کا دکھ کم نہیں ہوتا اور تمہاری تو معاف کرنا..... چاروں بہنوں کا ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ مشترکہ مسئلہ ہے پیسہ..... جبکہ ابو اپنی بھتیجیوں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔'' بیلا کی بے پروائی اور احسان جتلانے پر عدینہ کے اندر چنگاریاں بھر گئیں۔

''تمہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں اپنی بہنوں کے معاشی مسائل پر رو رہی ہوں..... مجھے ابو یاد آ رہے ہیں اور بس۔'' عدینہ نے دوٹوک کہا۔ بیلا کو چپ ہونا پڑا۔ جانتی تھی عدینہ اتنی ہی خوددار اور کسی حد تک خودسر ہے۔

"اچھا آج تم کالج کیوں نہیں آئی؟"

"بس ایسے ہی طبیعت ہی ٹھیک نہیں تھی......اور ویسے بھی۔"

"کیا......؟" بیلا ہمہ تن گوش ہوئی تو عدینہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"امی کی اکلوتی بہو......پہلی بار خیریت سے ماں بننے جا رہی ہے ای کا بس نہیں چلتا کہ اسے تو القہ بھی اپنے ہاتھوں سے کھلائیں۔"

"تو تمہیں کیا ٹینشن ہے۔" بیلا ہنس پڑی۔

"تمہارے گھر میں ملازموں کی کمی تو نہیں۔ دو چار اس کے لیے بھی فکس کر دو۔ آخر وہ پرلس چارمنگ کی مسز ہے۔ بائے گاڈ......تم لوگوں نے بھی زیادتی کرنے میں حد ہی کر دی۔ میرے جیسی خوبصورت اور آئیڈیل ہائیٹ والی لڑکی کے ہوتے ہوئے عدیل کو اس چھوٹی موٹی چڑیا کے ساتھ ڈبو دیا۔۔۔ مانو بیل کے گلے میں بلی ہی باندھ دی ہو جیسے۔" عدینہ نے اتراتی ہوئی بیلا کی طرف گھور کر دیکھا۔

"تمہاری یہ اوٹ پٹانگ باتیں اب ختم ہو جانی چاہئیں۔"

"کیوں......؟" بیلا نے استفسار کیا۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے عدیل کے لیے لڑکی بھی چچا میاں نے ہی ڈھونڈی تھی اور انہوں نے گھر کی رشتے داری کو محض یہ کہہ کر ریجیکٹ کیا تھا کہ ہمارے ہاں کزن میرج کی وجہ سے بہت مسائل پیدا ہو چکے ہیں اور خاص طور پر لڑکیوں کی شرح پیدائش بہت زیادہ ہے۔ بہ نسبت لڑکوں کے۔ اس لیے انہوں نے عدیل کو اعلیٰ اور علیحدہ خاندان میں بیاہا تھا تاکہ......کثرت سے بیٹے ہوں......"

"لیکن۔۔۔ صد افسوس......چار سال شادی کو ہو چکنے کے باوجود مہرین نہ بیٹا پیدا کر سکی اور نہ بیٹی۔۔۔" بیلا اپنے مخصوص انداز میں کھلکھلائی تو عدینہ اسے دیکھ کر چپ ہو گئی۔

"تم بھی اسی خاندان کی بیٹی ہو بیلا اور اپنے بڑوں کو کہتے سنا ہے کہ اس خاندان کی بیٹیوں نے شادی کے بعد سکھ نہیں پائے۔ تینوں پھوپیاں تنگ دستی میں زندگی گزارتی چل بسیں۔ تاؤ کی دو بیٹیاں ہیں وہ بھی تنگ دستی کا شکار ہیں چلو مانا تاؤ نے خود کما کر بھی نہیں کھایا تھا پھر رشتے داریاں بھی انہوں نے ایسی ہی کیں......پھر ہماری مثال لے لو۔"

"ماشاءاللہ محترمہ......عدینہ معراج۔ میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔"

"بڑا فخر ہے تمہیں اپنے اکلوتے ہونے اور چار بھائیوں پہ......"

"کیوں نہ ہو یہ تو روایت سے ہٹ کر علیحدہ مثال ہے۔ جو روایت چلتی آ رہی ہے میں تو کسی بھی طرح اس پر فٹ نہیں ہوتی اور تمہیں بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا بھی معاملہ

روایت سے ہٹ کر ہی ہوگا۔" بیلا کا انداز ذومعنی تھا۔ جسے عدینہ نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا مگر وہ بیلا کے غرور اور خود غرضی کو نظر انداز نہ کر سکی۔

☆☆☆

"سالہا سال یہ کپڑے ایسے ہی پڑے رہیں گے کون پہنے گا انہیں۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ یہ ملبہ اکٹھا کرنے کے بجائے کسی غریب کی مدد کر دیں پھر آپ کی بیٹیوں سے زیادہ غریب اور خستہ حال کون ہوگا۔ سب سے زیادہ انہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" عدینہ کی طنزیہ گفتگو صفیہ کے دل میں آرے چلا گئی......ان کا دل پاش پاش ہو گیا۔ آنکھوں کے گوشے گیلے ہو چکے تھے۔ شکوہ کناں نگاہوں سے بیٹی کی طرف دیکھا جو بے زاری اور غصے سے اپنے جہیز کے جمع شدہ قیمتی ملبوس......اِدھر اُدھر ڈال رہی تھی۔

"عدینہ بات کو منہ سے سوچ سمجھ کر نکالا کرو۔ کیا حق پہنچتا ہے تمہیں اپنی بہنوں کے حالات کو طنز کا نشانہ بنانے کا۔ تمہیں اپنی قسمت سے ڈر نہیں لگتا۔"

"طنز......عدینہ تڑپ اٹھی۔ اس کے معصوم چہرے پہ صفیہ سے زیادہ کرب چھلک رہا تھا۔ کیا آپ مجھے اتنا بے حس سمجھتی ہیں کہ میں اپنی بہنوں کے حالات کا مذاق اڑاؤں گی۔ دراصل امی بے حس میں نہیں آپ ہیں۔ سب کچھ آپ کے پاس موجود ہے پھر بھی آپ اپنے بچوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ کیا ابو، چچا میاں کو ساری جائیداد، سارے کاروبار کا مالک بنا گئے تھے۔ کیوں آپ چچا میاں سے اپنی بیٹیوں کے لیے مدد نہیں مانگ سکتیں؟" عدینہ بری طرح بھڑک گئی تھی۔ صفیہ کے کمزور اعصاب نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"بس کرو، عدینہ تم کچھ نہیں جانتیں۔ ماں باپ کے دینے سے بیٹیوں کا پورا نہیں ہوتا۔ وہ ا بھی ہوتا ہے اسی سے ہوتا ہے جس کے پلے بیٹیاں بندھتی ہیں مگر شاید میری بیٹیوں کے نصیب خراب ہیں۔ چاروں ایک سے بڑھ کر ایک مصیبت میں مبتلا ہیں۔ کس وقت میں نے ان کی مدد سے نظریں چرائی ہیں......بتاؤ تم۔ میں نے کب ان کی مدد نہیں کی،۔ دس سال ہو گئے ہیں تمہارے ابو فوت ہوئے۔ دس سال سے میں کمزور عورت اس غم کو اتنا سہار رہی ہوں۔ تم کیا جانو عدینہ بیٹی جب میں تمہارے چچا سے اپنی بچیوں کے لیے کچھ مانگتی ہوں......تو کتنا حقیر لگتا ہے مجھے اپنا آپ۔ کئی دن میں خود سے آنکھیں نہیں ملا پاتی۔ کتنے دن لگتے ہیں مجھے خود کو سمیٹنے میں۔ تم میرا یہ کرب نہیں جان سکتیں۔ میں ایک غریب باپ کی بیٹی تھی۔ امیر گھرانے میں آ گئی مگر تمہارے باپ نے مجھے عزت اور اہمیت نہیں دی جو عورت کا حق ہوتا ہے۔ میر علی کی مہربانی ہے جو دیور ہوتے ہوئے بھی میری عزت کرتے ہیں اور مجھ سے صلح مشورے کرنے آ جاتے ہیں۔ میری مشکلات میں مدد کر دیتے

ہیں۔ روز بروز میں میر علی کے احسانوں تلے دبتی جا رہی ہوں۔"

"کیسا احسان امی، کون سا احسان۔ آخر آپ کی ایسی سوچ کیوں ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ یہ جو کچھ بھی ہے اس میں ابو بھی چچا کے حصے دار ہیں اور کیا کچھ نہیں ہے ان کے پاس...... اگر اس میں سے تھوڑا سا اپنی بھتیجیوں کو بھی دے دیں گے تو کون سا فرق پڑ جائے گا ان کی بے بہا دولت میں۔" صفیہ نے اپنی گیلی آنکھیں پونچھ لیں پھر ذرا لہجہ سخت کرتے ہوئے بولیں۔

"اگر تم غور کرو تو یہ تمہارے چچا میاں ہی ہیں جو ان کی ائی جھلی سہہ رہے ہیں ورنہ میرا بیٹا تو اس قابل بھی نہیں کہ وہ بہنوں کی مدد تو درکنار اس کے حالات سے بھی واقف ہو سکے۔ وہ اپنی جوانی اور دولت کے نشے میں اس قدر چور اور مگن ہے۔ سوچتی ہوں میری زندگی میں ابھی اسے عقل نہ آئی تو تم لوگوں کا کیا ہوگا؟"

"کیا اس کو عقل آنے سے آپ کی بیٹیوں کے حالات درست ہو جائیں گے۔" عدینہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا اور صندوق بند کر دیا۔

"بھائی بہنوں کا بہت بڑا مان ہوتے ہیں۔ ماں باپ کے بعد میکے کا دروازہ بھائیوں کی محبت سے کھلا رہتا ہے۔ بھائیوں کی چاہت سے وہ سسرالیوں میں سر اٹھا کر جیتی ہیں مگر مجھے یہ غم اندر ہی اندر مارے ڈالتا ہے کہ میرا بیٹا...... اس قابل نہیں ہو سکا کہ وہ اپنی بہنوں کا مان قائم رکھ سکے۔ وہ شادی شدہ ہو گیا ہے مگر ابھی اس میں وہ بات نہیں آئی...... جو میں چاہتی ہوں۔" صفیہ پھر آبدیدہ ہونے لگی تھیں۔ عدینہ دل گرفتہ سی ہو کر ماں کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

"آخر دنیا کا نظام الٹا کیوں ہے امی ایک ہی ماں، باپ کی اولاد ایک چھت کے نیچے والی...... ایک سا نوالہ کھانے والی پھر دو حصوں میں تقسیم کیوں ہو جاتی ہے۔ عدیل روزانہ اپنی عیش میں ہزاروں روپیہ اڑا دیتا ہے اور اسے کچھ فرق بھی نہیں پڑتا...... جب کہ اسی ماں، باپ کی بیٹیاں کسمپرسی کے حالات سے دوچار ہیں۔ خدا نے رزق کی تقسیم میں کیوں ان لوگوں کو آزمائش میں ڈال رکھا ہے جو پہلے ہی بہت کمزور ہیں۔" عدینہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ صفیہ نے اس پوروں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"ایسا نہیں کہتے۔ یہ ایمان کمزور ہونے کی علامت ہے...... کہ ہم نعوذ باللہ...... اللہ پہ شک کرنے لگیں۔ اللہ رب العزت جو کرتے ہیں بہتر کرتے ہیں پھر اپنا بہتر بنانے میں انسان کا اپنا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ ایک طرح سے سوچو تو میر علی صحیح کہتے ہیں۔ آخر مکرم کون سا کاروبار کر رہا ہے! ہر چھ ماہ بعد ٹھپ ہو جاتا ہے اور اسے مزید پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں جانتی ہوں مکرم مزاج کا اچھا نہیں ہے، کاروبار میں بھی اس کے اندر لچک نام کی کوئی چیز نہیں۔ خود کو عقلِ کُل سمجھنے والے

اکثر ناکام رہتے ہیں اور مکرم بھی انہی میں سے ایک ہے۔ کس نے کہا تھا اسے تولیا بنانے کا کارخانہ لگائے۔ وہ جانتا تھا اس کی یہ تھوڑی پونجی ہے تو کوئی یوٹیلٹی اسٹور بھی تو کھول سکتا تھا۔ اس بات کا مشورہ اسے میر علی نے بھی دیا تھا اور میں نے بھی۔ نہ جانے کیسے کیسے پارٹنر مل جاتے ہیں اسے جو اس کا نقصان کرا کے غائب ہو جاتے ہیں پھر بھی اسے عقل نہیں آتی۔ یہاں تو دانت پہ دانت جمائے ستا رہا گھر جا کر صنم کے ساتھ نہ کرنا تھا وہ کیا۔ اس کی لمبی ناک اور اونچی پگڑی گر رہی تھی اگر وہ ہمارے کہے پر عمل کر لیتا اب اس کی جھوٹی شان کو ہم بھگت رہے ہیں۔ اکثر صنم کو گھر میں تکلیف وہ حالات میں رکھتا ہے۔ میں میر علی کو بتائے بغیر اس کا کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔ جب حالات کنٹرول سے باہر ہو جاتے ہیں پھر میر علی تک بات لے جانا پڑتی ہے۔ آخر بیٹیاں ہیں میری ان کے بچوں کو بھوکا مرتا بھی نہیں دیکھ سکتی۔" صفیہ پھر آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ عدینہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

"میں سوچ رہی تھی بہت دن ہو گئے ارم ادھر نہیں آئی۔ اس کے ہاں چکر لگا لیتے ہیں۔ کل اتوار ہے میری کالج سے چھٹی ہو گی کیوں نہ میں کل اس کی طرف چلی جاؤں؟" عدینہ نے ماں سے اجازت مانگی تو صفیہ گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔

"نوید کی بیماری میں چھوٹی سی عمر میں ہی اتنا گھر گئی ہے کہ یہاں آنے کا بھی اس کے پاس وقت نہیں رہا۔ تم یہ اسٹور بند کر کے باہر آؤ پھر مجھے...... ارم کے ہاں فون ملا کر دینا۔ میں اس سے کہوں گی کل اتوار ہے ادھر ضرور آئے۔ آخر صنم، صباحت اور مدیحہ بھی تو ہر اتوار کو آتی ہیں نہ جانے اس لڑکی نے خود کو ابھی سے اتنا اکیلا کیوں کر لیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے صفیہ باہر آ گئیں۔ عدینہ بھی سامان بند کر کے ان کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی۔

☆☆☆

آج صفیہ، سویرے سے ہی بے چین پھر رہی تھیں۔ وگرنہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کر کے ذرا دیر کو لیٹ جایا کرتیں لیکن چونکہ آج اتوار تھا۔ اس لیے آج کی صبح خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ ہمیشہ کی طرح صبح ہی انہوں نے ملازم لڑکے سے کھانا پکانے کا سامان منگوا لیا تھا۔ گوشت، فروٹ، سبزی غرض بچوں کے کھانے پینے کے بسکٹ، پاپڑ اور ٹافیاں تک بھی منگوا کر محفوظ کر لی تھیں۔ اتوار کے دن کا آغاز تو خوشی خوشی ہوتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے رات کو وہ چاروں رخصت ہوتیں...... صفیہ کے دل پر بوجھ سا گرتا جاتا اور ان کے جانے کے بعد ان کی بے چینیاں پھر سے توانا ہو کر صفیہ کی نیندیں اڑا دیتیں اور تب وہ جانماز پر بیٹھ کر نمازِ عشا کے بعد تادیر روتی رہتیں اور اپنی بیٹیوں کی خوشحالی کی دعائیں مانگتی رہتیں۔ عدینہ ماں کی اس منافقت پر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ اسے ماں سے ہر وقت ایک ہی شکایت تھی۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ اتنی کمزور کیوں

ہیں؟ وہ اپنی بیٹیوں کے لیے سب کچھ کرسکتی ہیں لیکن نہیں کر پاتیں۔ آخر کیوں؟ عدینہ اس کیوں ۔ جاب کی تلاش میں نکلتی تو اتنا دور نکل جاتی کہ اسے خود بھی پھر کوئی راستہ نہ مل پاتا۔

عدینہ ابھی تک سو رہی تھی اور صفیہ نے تمام اشیاء خورد و نوش اکٹھا کر لی تھیں اور دل ہی دل میں کھانے کا مینو بھی تیار کرلیا تھا۔ "بکرے کا کڑھائی گوشت، مرغ بریانی، کباب، نان، رائتہ، سلاد، چٹنیاں اور ہاں میٹھے میں بچے کسٹرڈ ہی پسند کرتے ہیں۔ فروٹ ڈال کر کسٹرڈ بنوالوں گی مگر...... اکیلی عدینہ سب کچھ کر تو لے مگر بری طرح تھک جاتی ہے۔" صفیہ کو سوئی ہوئی عدینہ پہ پیار سا آ گیا۔ اسے سوتا چھوڑ کر وہ خود ہی کچن میں آ گئیں۔ شامی کباب کا قیمہ چولہے پر رکھا مرغ دھو کر ٹوکری میں رکھی پھر چاول چننے لگیں۔ کسٹرڈ چونکہ بنانا نہیں آتا تھا اس لیے اس جھنجھٹ کو عدینہ کے لیے چھوڑ دیا۔ ویسے بھی ان کے زمانے میں وہ کھیر ہی بنایا کرتی تھیں۔ کسٹرڈ کا رواج تو اب نکلا تھا پھر ان کے دل کو خیال آیا کیا ضروری ہے کسٹرڈ بھی بنانے کی بجائے آئس کریم بھی شوق سے پسند کرتے ہیں اور عدینہ کا کام بھی مختصر ہو جائے گا۔ "یہ ٹھیک ہے آئس کریم اور قلفہ منگوا دوں گی۔" اتنے میں کام والی ماسی اور اس کی بیٹی آ گئی۔

"سکینہ بی بی...... سب سے پہلے آپ بڑے کمرے کی صفائی کر دیں اور وہاں سے میز اور کرسیاں نکال کر چارپائیاں ڈال دیں۔ سبھی کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں چارپائیوں کے بنا گزارا نہیں ہوتا اور ہاں بڑا پانی کا کولر بھی بنا کر وہیں رکھ دینا۔ بچوں کو اپنے، اپنے گھروں میں ہر چیز کی سہولت میسر ہوتی ہے ناں اس لیے یہاں آ کر ذرا سی بے ترتیبی برداشت نہیں کرتے اور ماؤں کو تنگ کرتے ہیں۔" سکینہ نے مسکرا کر صفیہ کی طرف دیکھا۔

"ساکوں پتا ہے بیگم صاحب آج اتوار ہے۔ تواڈیاں دھیاں دے آنے دا دیہاڑ۔ (ہمیں پتا ہے بیگم صاحبہ آج اتوار ہے آپ کی بیٹیوں کے آنے کا دن) صفیہ ملازمہ کی طرف دیکھ کر نرمی و مسرت سے مسکرائیں اور چاول چننے لگیں۔ سکینہ کام میں مشغول ہو گئی۔ وہ پودوں کو پانی ڈالتے ہوئے بولی۔

"ماواں تے ٹھنڈیاں چھاواں اللہ آپ کو لمبی حیاتی دے صفیہ بی بی۔ جس ویلے تک تساں ہو۔ اس ویلے تک اے میلہ ہے۔ ماواں نہ ہوون تے دھیاں میکا ہی بھل جاندیاں نیں۔" سکینہ کی بات پر صفیہ کا دل بھر سا آیا۔ سکینہ ٹھیک کہہ رہی تھی آخر وہ اس گھر کی پرانی ملازمہ تھی۔ سب حالات سے واقف تھی۔ صفیہ کے بعد اس گھر میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کی بیٹیوں کی آؤ بھگت کرتا۔ اپنی زندگی میں وہ عدینہ کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جانا چاہتی تھی لیکن رشتے اللہ کے حکم سے بنتے ہیں عدینہ کے بارے میں ان کا دل کہیں نہیں ٹھہر رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ چاروں بڑی بیٹیوں کے حالات تھے جنہوں نے ان کو فیصلے کی صلیب پر لٹکا رکھا تھا لیکن وقت تھا کہ اس سوچ بچار میں نکلا جا رہا تھا

عدینہ کی عمر میں تو ساری ہی بیاہی گئی تھیں۔ ان کے دل سے سرد آہ نکلی اور اپنے والد صاحب کی بات یاد آ گئی وہ کہا کرتے تھے کنواری کھائے دو روٹیاں اور بیاہی کھائے بوٹیاں۔

کیا جانے عدینہ کے نصیب میں بھی کیا ہے۔ دو وقت کا ٹکڑا کھا رہی ہے مجھ سے کیا لے رہی ہے جنہیں بیاہ کر فکروں سے آزاد ہونا چاہیے تھا...... آج تک انہی کی فکروں میں جلا ہوں۔ اتنے میں عدینہ آنکھیں ملتے ہوئے کمرے سے نکلی تو ماں کو کام میں مشغول پا کر غصے میں آ گئی پھر اس نے وقت دیکھا۔

"ابھی صرف نو ہی بجے ہیں اور آپ ابھی سے دوپہر کی تیاری میں لگ گئیں۔" وہ ماں سے شکوہ کرتے ہوئے صحن کے واش بیسن میں منہ دھونے لگی۔ صفیہ نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا اور کہنے لگیں۔

"نو بج گئے اور ابھی تک کوئی بھی نہیں آیا۔ ذرا منہ دھو کر مجھے فون ملا کر دینا پوچھتی ہوں اب تک کیوں نہیں پہنچیں۔"

"چھٹی کا دن ہے امی۔ اس لیے سب کے بچے دیر سے سو کر اٹھتے ہیں۔ ہر اتوار کو آپ اپنی بیٹیوں سے یہی شکوہ کرتی ہیں اور ہر اتوار ان کا یہی جواب ہوتا ہے۔" عدینہ نے منہ دھوتے ہوئے کہا تھا لیکن صفیہ کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ فون اپنے قریب رکھ کر بیٹھ گئیں اور عدینہ کی فراغت کا انتظار کرنے لگیں۔

☆☆☆

آج سویرے ہی گھر میں ہنگامہ بپا تھا کیونکہ بچوں کو نانو کے گھر جانے کی خوشی ہی اتنی تھی کہ وہ سب معمول سے پہلے ہی جاگ گئے تھے لیکن مکرم نے کہا تھا۔ آج کوئی کہیں نہیں جائے گا۔ رات تک تو صنم اس بات کو ٹالتی رہی تھی کہ شاید صبح تک مکرم کا موڈ تبدیل ہو جائے لیکن مکرم اپنی بات پر قائم تھا نہ صرف قائم تھا بلکہ اس نے صنم کو دھمکی بھی دی تھی کہ اگر وہ بچوں کو لے کر گئی تو نتائج کی خود ذمے دار ہو گی۔

چودہ سال سے صنم، مکرم کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ اچھی طرح واقف تھی کہ وہ انتہائی ہٹ دھرم اور ڈھیٹ انسان ہے جو کچھ منہ سے نکال دیتا ہے منوا کر ہی دم لیتا ہے۔ "آخر کب تک وہ اس طرح منواتا رہے گا اور میری کیا مجبوری ہے جو مانتی چلی آ رہی ہوں۔ یہ بچے......" ناشتا کرتے ہوئے اس نے اپنے چھ بچوں کی طرف دیکھا جو دہی اور چنوں سے رات کی روٹی بے دلی سے کھا رہے تھے اور دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ اگر ہم نانو کے گھر صبح، صبح چلے جاتے تو کم از کم آج تو روکھا پھیکا ناشتا نہ کرنا پڑتا۔ نانو حلوا پوڑی کا ناشتا کراتیں۔ تب کتنا مزہ آتا۔ وہ بچوں کے احساسات سے اچھی طرح واقف تھی۔ نظریں چراتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی اور واپس مکرم کے

پاس آ گئی اور اسے کسی نہ کسی طرح قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"صبح سے امی کے دو فون آ چکے ہیں۔ ہمسائے بھی کیا کہیں گے۔ بار بار پیغام دینا پڑ رہا ہے۔ بچے علیحدہ پریشان کر رہے ہیں۔ آخر آپ کو ضد کیا ہے؟" وہ زچ ہو چکی تھی۔

"ضد مجھے نہیں تمہیں ہے۔ تمہیں جب کہہ دیا کہ تم نہیں جاؤ گی تو مجھ سے بار بار کیوں پوچھ رہی ہو۔ کیا تم بچوں کو سمجھا نہیں سکتیں......؟"

"بچے ہیں مکرم۔ ایک دن یہ تو ہوتا ہے چھٹی کا پھر ہم تو بچوں کو اور کہیں گھمانے پھرانے بھی نہیں لے کر جاتے۔ ایک امی کا گھر ہی ہے جو بچے تفریح کر لیتے ہیں۔" وہ مکرم کو رسان سے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی تو مکرم بھڑک گیا۔

"میں یہاں اپنے مسائل کے انبار میں دب کر رہ گیا ہوں اور تمہیں اب بھی تفریح اور چونچلوں کی سوجھ رہی ہے۔"

"یہ مسائل میرے پیدا کردہ نہیں ہیں، اپنے مسائل کے تم خود ذمے دار ہو آخر ایسا کام کرتے ہی کیوں ہو جس کا تمہیں تجربہ نہیں ہوتا۔" صنم کی بات مکرم کے تلوؤں سے لگی اور سر پر بجھی وہ لیٹا ہوا تھا بیٹھ گیا۔

"جب انسان کی قسمت اچھی ہوں ناں تو سب تدبیریں کام آ جاتی ہیں۔" وہ صنم سے جھلائے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اور جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو میری قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔ سونے کو ہاتھ لگاتا ہوں مٹی ہو جاتا ہے۔ شادی کے بعد کہتے ہیں عورت کے نصیب سے رزق آتا ہے مگر مجھے کیا پتا تھا بظاہر ایک بڑے اور مالدار گھر کی بیٹی کی قسمت اور اتنی ناکارہ ہو گی کہ میرے گھر میں فاقے ہونے لگیں گے۔"

مکرم کی بات پر صنم کی روح تک لہولہان ہو گئی۔

"اپنی نااہلی کو عورت کے ذمے ڈالتے ہوئے شرم آنی چاہیے تمہیں۔ شادی سے پہلے کون سا نے سونے کی کان کھول رکھی تھی جو اب سب کچھ مٹی ہو گیا۔ یہی کرتوت تھے جبھی تو باپ بھائیوں نے ہی کاروبار سے علیحدہ کر دیا اور علیحدہ ہوتے ہی تمہارے گن سامنے آ گئے جسے تم میری بدنصیبی کہہ رہے ہو"

"مجھ سے زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا جو دل چاہے گا وہ کروں گا میں نے کہہ دیا ہے کہ آج نہیں جاؤ گی۔"

"کیوں نہیں جاؤں گی میں؟" صنم پھٹ پڑی۔ "کون ہوتے ہو تم مجھے روکنے والے تم مطالبہ پورا نہیں کیا اس لیے تم کیا سمجھ رہے ہو اس طرح کرنے سے تم اپنے مطالبات منوا لو گے تو یہ تمہا بھول ہے۔ تمہیں اچھی طرح پتا ہے مکرم یہ صنم تھی جو چودہ سال سے تمہارا بوجھ برابر اٹھا رہی ہے۔

"تو احسان نہیں کر رہی ہو تم مجھ پر اور نہ ہی وہ احسان کر رہے ہیں خدا نے بے بہا دے رکھا ہے انہیں۔ قبروں میں نہیں لے کر جائیں گے اپنی...... سمندر سے دو گھونٹ دے بھی دیتے تو کیا فرق پڑتا ہے۔" مکرم ہٹ دھرمی سے بولا تھا تو صنم سلگ رہی تھی۔

"آخر کب تک چلے گا یہ سلسلہ؟"

"تو ختم کر دیں اس سلسلے کو ایک بار ہی تمہارا حصہ تمہیں دے دیں بات ختم ہو جائے گی۔"

مکرم نے اتنی بڑی بات کتنے اطمینان سے کہی تھی۔ صنم دنگ رہ گئی۔ آج مکرم نے پہلی بار حصے کی بات کی تھی۔ اس کی بے غیرتی پر صنم کو بری طرح طیش آ رہا تھا۔

"کس حصے کی بات کر رہے ہو تم۔ ذرا حساب تو لگاؤ آج تک جتنا تم لے چکے ہو وہ تمہارے حصے سے بھی زیادہ بنتا ہے۔" مکرم اس کی بات پہ بے ہنگم سا قہقہہ لگا کر بولا۔

"یہ پٹیاں کسی اور کو پڑھانا۔ کیا ملے گا تمہیں ان کا فائدہ سوچ کر۔ حصے سے زیادہ بن جائے گا اونہہ...... اندازہ ہے تمہیں اپنے ماں باپ کی دولت کا۔" وہ صنم کو اکسا رہا تھا۔

"خوب اچھی طرح اندازہ ہے اپنے ماں باپ کی دولت کا ہی نہیں تمہاری لالچ کا بھی۔" یہ کہتے ہوئے صنم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "صرف ایک ہی اولاد نہیں ہوں ان کی۔ باقی اور بھی بیٹیاں ہیں میں اپنی فکر میں انہیں کب تک نڈھال رکھوں۔ یہ تم کیوں نہیں سوچتے۔"

"باقی کون سے سو رہا ہیں...... سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ بس تمہاری طرح تمہاری بہنیں بے وقوف نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کی کمزوریوں کی کسی کو بھی بھنک نہیں لگتی۔ اس لیے کہ ان کی بیویاں تمہاری طرح ہنگامے نہیں کرتیں۔ احسان کر کے نہیں جتلاتیں۔ چپ چاپ شوہروں کا ساتھ دیتی ہیں لیکن تم اتنی بے وقوف اور جاہل ہو کہ تم اپنے شوہر کی عزت کی ساتھی ہی نہیں ہو۔"

"میں...... میں تمہاری عزت کی ساتھی نہیں ہوں۔ مکرم...... جس کے ناک، کان، کلائیاں، سب کچھ خالی ہو چکا ہے۔ چار بچیوں کا ڈھیر لگا ہے۔ اس بات کی بھی پروا نہیں کی میں نے اور ہر دم یہی سوچ کر ساتھ دیتی رہی چلو کچھ آسرا بندھ جائے مگر تم نے مجھے ہمیشہ میکے میں سرکا کر بھیجا۔ کب ساتھ نہیں دیا میں نے تمہارا اگر تم اب بھی یہی کہتے ہو کہ میں تمہاری ساتھی نہیں ہوں تو ٹھیک ہے۔ نہیں جاؤں گی تو قیامت تو نہیں آ جائے گی۔ ہفتے کے سات دن یہیں پڑی رہی ہوں۔ آٹھویں دن کی بھی عادت ڈال لوں گی۔ رہنا تو تمہارے ساتھ ہی ہے ناں۔ تمہیں بھی اپنے ذمے داریوں کا احساس ہو گا۔"

وہ ناک منہ پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ جہاں چھوٹے بڑے بچوں نے ہنگامہ کر رکھا تھا۔

"امی...... نانو کا فون پھر آیا تھا۔ آنٹی کے گھر جا کر میں خود بات کر کے آئی ہوں۔ نانو کہہ رہی تھیں میں گاڑی بھیج رہی ہوں "فوراً آ جاؤ۔" سحر نے خوش ہوتے ہوئے بتایا تو صنم کو سخت غصہ

آ گیا۔ سحر تیرہ سال کی ہو رہی تھی مگر ابھی تک اس میں وہی بچپنا تھا۔

"رات سے دیکھ نہیں رہی ہو کہ تمہارے باپ نے کیا ہنگامہ کر رکھا ہے۔ بتا دیتیں کہ ہم نہیں آ رہے۔" صنم بیٹی پر برسی تو سحر سہم کر رہ گئی۔ "اتنی بڑی ہو گئی ہو اور ابھی تک عقل نہیں آئی میں...... یہ سارے برتن سمیٹو اور دھو کر رکھو۔ آج کے بعد تم میں سے کوئی نانو کے گھر جانے کی ضد نہیں کرے گا کیونکہ اب میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔" یہ کہہ کر صنم دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دم کے لیے بچے روہانسے ہوئے پھر جلد ہی اپنی اپنی سرگرمیوں میں مگن ہو گئے۔ کسے نے ٹی وی چلا لیا کوئی دادا، دادی کے پاس چلا گیا۔ فرحان ڈور پتنگ لے کر چھت پر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی اکرم کو احساس ہوا کہ اگر وہ صنم کے راستے بند کر دے گا تو اس کے اپنے راستے بند ہو جائیں گے۔ اپنی جھوٹی انا کو لالچ کی کنڈی میں بند کر کے وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

"اپنی امی سے کہنا تینوں سوٹوں کی سلائی ابھی بھجوا دیں۔" صباحت نے جلدی جلدی کپڑے شاپر میں رکھتے ہوئے کہا تو عمر نے صاف انکار کر دیا۔

"آنٹی، مما تو کل سے ماموں کی طرف گئی ہوئی ہیں۔ ہم لوگ بابا کے ساتھ جا رہے تھے اس لیے مما نے کپڑے منگا لیے۔ پتا نہیں مما تو کب آئیں گی۔" کپڑے رکھتے صباحت کے ہاتھ رک گئے۔ وہ عمر کو دیکھنے لگی کہ کیا کہے۔ عمر شاید جلدی میں تھا ہاتھ بڑھا کر کپڑے کا شاپر پکڑ لیا۔

"ماموں کے ہاں بیٹا ہوا ہے اس لیے چند دن مما ادھر ہی رہیں گی۔ جب آئیں گی تو آپ کے پیسے دے دیں گی۔" عمر کی وضاحت پر صباحت کو غصہ تو بہت آیا مگر اب وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گئی۔

ساری رات بیٹھ کر اس نے یہ تینوں سوٹ سیے تھے۔ اس لیے تا کہ صبح اسے تین سو روپے مل جائیں اور وہ اپنی بچی کی دوا لے سکے۔ ساری رات ثمن کو الٹیاں اور سخت بخار رہا تھا اور اب اسے ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے لے کر جانا تھا۔ ادھر صبح سے امی کے فون پر فون آ رہے تھے اور تب اسے بتانا پڑا تھا کہ اس کی بچی کی طبیعت سخت خراب ہے۔ طارق اور وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہے ہیں اور یہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ طارق تو صبح سے گھر پر تھا ہی نہیں۔ وہ تو نماز فجر کے بعد سے اپنے مالک کے ہاں گیا ہوا تھا۔ طارق رائس فیکٹری میں سپروائزر کا کام کرتا تھا۔ مال دوسرے شہروں میں جاتا تو طارق کو اتنی ہی صبح جانا پڑتا تھا۔

وہ گھر سے سوچ کر نکلا تھا کام سے فراغت کے بعد مالک نصیر خان سے کچھ رقم ایڈوانس مانگ لے گا رات کو ثمن کی حالت اس سے بھی دیکھی نہیں گئی تھی۔ پھر بھی صباحت کی ہمت تھی۔ بچی

سنبھال رہی تھی اور کپڑے بھی سیتی رہی تھی۔ اب تک تو ان کپڑوں کے پیسے بھی آ چکے ہوں گے اور صباحت، ثمن کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے جا چکی ہو گی۔

طارق نے دن چڑھے تک نصیر خان کا انتظار کرتے ہوئے سوچا تھا لیکن اسے کیا پتا تھا کہ ان کپڑوں کے پیسے نہیں آئیں گے اور ثمن کی حالت اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔ ثمن نڈھال سی پڑی تھی اور صباحت اس کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ ادھر اس کی نگاہیں طارق کے انتظار میں لگی تھیں مگر اس کے دونوں بڑے بچے نانو کے ہاں جانے کے لیے اتاؤلے ہو رہے تھے۔ ایمن اور ایمان کو...... ثمن پر سخت غصہ آ رہا تھا کیونکہ اسی کی وجہ سے ان کی مما نانو کے گھر نہیں جا رہی تھی۔

"اسے بھی سنڈے کے روز ہی بیمار ہونا ہوتا ہے۔" ایمان نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا تو صباحت نے خفگی سے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر رسان سے بولی۔

"بہن کی طبیعت صحیح نہیں ہے اور تمہیں نانو کے گھر جانے کی پڑی ہوئی ہے اگر ایک سنڈے مس بھی کر دو گے کیا ہو جائے گا۔"

"واہ...... واہ...... ہفتے میں ایک بار تو جاتے ہیں...... نانو نے اتنے مزے مزے کی چیزیں بنا کر رکھی ہوں گی ہم سب کے لیے اور پھر ساری خالاؤں کے بچے صرف سنڈے کو ہی تو ملتے ہیں، ہم آپس میں۔" ایمان نے چہک کر کہا تو ایمن معصومیت سے بولی۔

"اور مما نانو نے اتنا سارا فروٹ بھی تو منگوایا ہو گا ہمارے لیے۔ بابا تو اتنا سارا فروٹ بھی نہیں لاتے۔ بس کبھی کبھی تھوڑی سی چیز لے آتے ہیں۔" ایمن نے اپنی توتلی زبان میں کہا تو صباحت کے دل پر بوجھ سا آ گرا اور آنکھیں جھک گئیں۔

"اتنی تگ و دو کے باوجود بھی ہم اپنے بچوں کے کھل کر ارمان پورے نہیں کر سکتے۔ ...... یہ مہنگائی اور اس پر یہ کسمپرسی۔" اس نے دل ہی دل میں خدا سے شکوہ کیا۔

"بری بات ہے بیٹا، ایسی باتیں نہیں کرتے۔ سب کچھ تو لا کر دیتے ہیں بابا آپ کو۔" وہ اپنے بچوں کو خود سے قریب کر کے بہلانے لگی تھی مگر بچے اتنے نا سمجھ نہیں تھے کہ اچھے اور برے کا فرق محسوس نہ کر سکیں۔

"کوئی نہیں جی۔ نانو کے گھر تو اے سی بھی لگا ہوا ہے۔ بابا لگوا کر دیں ناں۔ ہمیں یہاں گرمی لگتی ہے۔" ایمن فرمائش کر رہی تھی پھر ایمان چہک کر بولا۔

"مما' ماموں کی اتنی بڑی گاڑی ہے اور اتنی خوشبو آتی ہے ماموں کی گاڑی میں سے۔ میں سکول میں سب بچوں کو بتاتا ہوں۔ ہمارے ماموں کی پوری کلاس روم جتنی بڑی گاڑی ہے۔" بیٹے کی شوخی پر صباحت پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی۔ اب وہ ان بچوں کو کیا سمجھاتی، ثمن اٹھ گئی تھی صباحت اس

میں مصروف ہو گئی۔ ایمان ماں کا ٹالنے والا انداز نہ سمجھا اور سنجیدہ سا منہ بنا کر بولا۔

''مما ہمارے پاس وہ سب کچھ کیوں نہیں ہے؟'' بیٹے کے سوال پر صباحت دم بخود رہ گئی۔ وہ بچوں کو کیسے مطمئن کرتی۔ اتنے میں ایمان خود ہی بول پڑا۔

''نانو نے ایسا سب کچھ آپ کو بھی جہیز میں دیا تھا مگر بس گاڑی نہیں تھی۔ بابا بتاتے ہیں انہوں نے سب کچھ فروخت کر دیا اور یہ چھوٹا سا گھر خرید لیا۔ مما اگر ہمارے پاس یہ گھر نہ ہوتا تو ہم اتنا ڈھیر سارا سامان کہاں رکھتے مگر ایک بات ہے اگر نانو آپ کو گھر بھی دے دیتیں تو تب کتنا مزہ آتا ہے نا مما تب ہمارے گھر بھی ہوتا اور سامان بھی۔'' صباحت نے معصوم سے ایمان کی طرف دیکھا۔

''ایسی باتیں کیوں کرتے ہو تم لوگ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ وہ تمہارے بابا کو اتنا رزق دے کہ تمہارے سب ارمان پورے ہو جائیں۔''

''کیا اللہ تعالیٰ بابا کو رزق نہیں دیتے۔ صرف نانو کے گھر میں دیتے ہیں۔'' ایمن نے تتلا کر معصومیت سے سوال کیا تو صباحت نے بیٹی کو خود سے قریب کر لیا۔

''اللہ تعالیٰ سب کو رزق دیتے ہیں۔ یہ گھر، یہ کپڑے، یہ کھانا پینا سب کچھ اللہ نے ہی تو دیا ہے ہمیں۔ بس ہم شکر ادا نہیں کرتے اگر ہم شکر ادا کریں تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بھی زیادہ دے۔'' صباحت کی بات پر دونوں ہی بچے خوش ہو گئے۔

''تو پھر ہمیں بتائیں نا اللہ تعالیٰ کا شکر کیسے ادا کرتے ہیں؟''

''جو کچھ ہمارے پاس ہے اس پر صبر کر کے۔ کسی کی طرف ندیدے پن سے دیکھنا اور یہ سوچنا ہمارے پاس یہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے اچھا نہیں ہوتا حالانکہ ہمارے پاس تو سبھی کچھ ہے۔'' ننھے تو بچے تھے بہل گئے اور دوسرے ہی پل کھیل میں مصروف ہو گئے۔ صباحت اپنے معصوم بچوں کو کھیل میں مگن دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

''اگر تمہارے دادا، دادی زندہ ہوتے تو شاید ہمیں اتنی تکلیفیں نہ اٹھانا پڑتیں۔ سوتیلے رشتے کب کسی کے ہوئے ہیں۔ طارق اکلوتے تھے اور وہ تین بہن بھائی۔ طارق کو جائیداد اور کاروبار سے کچھ بھی نہیں ملا...... اور نہ ہی طارق نے اپنا حق لینے کے لیے مقدمے بازی یا بدمعاشی کو مناسب سمجھا۔ اس خون خرابے اور ذلت سے بہتر انہوں نے اپنے بازوؤں پر بھروسا کیا اور بے سروسامان ہمیں لے کر نکل گئے۔ آج تک ہم اسی خودداری کا بیاج ادا کر رہے ہیں۔ کیا طارق ان سب سے چھوٹے تھے اس لیے اپنا حق وصول نہیں کر سکے یا سوتیلا پن...... نہیں طارق کی شرافت۔'' صباحت کے اندر سے جواب آیا۔

''ایسی بھی کیا شرافت انسان اپنا جائز حق بھی نہ مانگے۔'' اس کے اندر کی فطری عورت

نے آواز اٹھائی...... اسی لمحے گلی کا دروازہ بجنے لگا۔ ایمان نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ صباحت سوچوں سے نکل آئی۔ طارق اڑی اڑی رنگت کے ہمراہ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔

''تم ابھی تک بچی کو لے کر یہیں بیٹھی ہو ڈاکٹر کے پاس نہیں گئیں؟'' وہ بے چینی سے ثمن کی طرف بڑھا۔ ''اسے تو بہت تیز بخار ہے اور پانی کی کمی بھی بہت ہو گئی ہے لگتا ہے دو تین ڈرپس لگیں گی۔'' وہ ثمن کے سر اور چہرے کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے فکرمندی سے بول رہا تھا۔

''مالک نے پیسے نہیں دیے......'' صباحت نے آہستگی سے پوچھا تو طارق کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی۔

''وہ وقت گیا جب مزدور کو مزدوری اس کا پسینہ سوکھنے سے قبل دے دی جاتی تھی۔'' صباحت اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے تائیداً سر ہلا کر رہ گئی۔

''تمہیں بھی سلائی کے پیسے نہیں پہنچے۔'' طارق نے فکرمندی سے پوچھا۔

''اگر میرے پاس ہوتے تو میں بچی کو یہاں لے کر نہ بیٹھی ہوتی۔ اب میں اسے امی کی طرف لے کر جا رہی ہوں وہیں ڈاکٹر کو دکھا دوں گی۔''

''تو کیا وہاں کے ڈاکٹر پیسے نہیں لیتے۔'' طارق کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ صباحت چور سی بن گئی۔

''امی سے مانگ لوں گی۔ یہ کہہ کر کہ میں اپنا پرس گھر بھول آئی ہوں۔'' صباحت کی آواز بھی اور رنجیدہ تھی۔ اپنے حالات پر طارق کو ہنسی آ گئی۔ وہ ثمن کو اپنے کاندھے سے لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ بہانہ تم بہت بار کر چکی ہو۔ اب کوئی نیا بہانہ ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ جس سے میری اور تمہاری جھوٹی عزت بچی رہے۔'' صباحت کا سر مزید جھک گیا۔ طارق، ثمن کو گھر سے باہر لے کر چلنے لگا تو چادر اوڑھ کر صباحت بھی اس کے ہمراہ ہو لی۔

☆☆☆

''آج کیا عید کا دن ہے جو بچوں کو نئے کپڑے اور جوتے پہنا کر لے جا رہی ہو۔'' شہزاد نے اپنے چاروں بچوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا تھا۔

''گرمیوں کے کپڑے بچوں کے ایک ہی سیزن میں پھٹ جاتے ہیں اور ویسے بھی پرانے کپڑے بچوں کو وہاں کے ماحول میں سوٹ نہیں کرتے اور یہ کپڑے کون سا بالکل نئے ہیں پچھلے سال نے ہی دیے تھے اب سلوائے ہیں۔''

''مدیحہ بیگم! دوسروں کا منہ لال دیکھ کر اپنا منہ لال نہیں کیا کرتے اگر تمہیں وہاں جاتے ہوئے اتنی ہی سبکی محسوس ہوتی ہے تو جاتی ہی کیوں ہو۔ اب یہی کپڑے فاطمہ کی شادی پر بھی کام آ جاتے تھے مگر نہیں...... تمہیں تو سب بہنوں پر اپنی شوشا مارنا ہوتی ہے کہ تم سب سے امیر ہو مگر تمہیں

آج تک یہ اندازہ نہیں ہوا کہ مجھ پر کتنے بڑے کنبے کا بوجھ ہے۔ تین بہنیں کنواری بیٹھی ہیں۔ دو شادی شدہ ہیں تو ان کے مسائل اتنے ہیں کہ آئے دن مطالبہ لے کر یہاں آئی بیٹھی ہوتی ہیں۔ دو بھائی ہیں جنہیں کاروبار بھی کرا رہا ہوں اور شادیاں بھی کرنی ہیں ان کی۔ بیمار اور بوڑھے ماں باپ ہیں جنہیں آئے دن ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری ہوتا ہے مگر تمہیں کیا پروا ہے ان باتوں کی۔ تمہارے ان گلچھروں سے میرے بجٹ پر کتنا بوجھ پڑتا ہے ذرا فکر نہیں ہے تمہیں۔'' شہزاد کی بے وجہ تنقید و تنک پر مدیحہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''دس سال ہو گئے تمہاری شادی کو مگر بڑے گھر کی بیٹی ہونے کا زعم نہیں گیا۔ حالانکہ پوچھتا تک نہیں کوئی تمہیں۔ ایک بھائی ہے۔ نظر سے نظر مل جائے سلام تک نہیں کرتا۔''

''تو آپ بھی تو نہ کیا کریں اسے سلام۔ پاؤں پکڑتی ہوں میں آپ کے کہ آپ اسے سلام کریں۔'' مدیحہ نے آنسو پونچھ ڈالے۔

''ایک منٹ میں بھائی کی حمایت کے لیے کھڑی ہو جاتی ہو۔ ذرا بھی برداشت نہیں ہوتا۔ کیا بھائی کو ہے تم سے محبت.....؟'' شہزاد نے اکسایا۔

''یہ ہم بہن بھائیوں کا باہمی تعلق ہے چاہے کیسا بھی ہو آپ کو اس سے کیا اور ویسے بھی میں وہاں اپنے بھائی کے لیے نہیں اپنی ماں کے لیے جاتی ہوں۔'' مدینہ نے بھی سینہ ٹھونک لیا تھا۔ چاروں بچے سراسیمہ سے کھڑے ماں باپ کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

''زبان درازی میں تو تمہیں کمال حاصل ہے۔ صحیح کہتے ہیں میرے گھر والے سر پر چڑھا رکھا ہے میں نے تمہیں۔''

''ہر اتوار کو یہی تماشا ہوتا ہے۔ آج کوئی نئی بات نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مدیحہ بالوں کی پٹیا کھولنے لگی۔ تبھی شہزاد نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''بچوں کے یہ جوتے اور کپڑے اتار کر دوسرے پہناؤ۔ اگلے جمعے کو فاطمہ کی شادی کی تاریخ دینی ہے اس میں کام آ جائیں گے۔'' مدیحہ نے شہزاد کی طرف دیکھا اور صبر کے گھونٹ پی کر بولی۔

''اگلے جمعے کو بچے یہی کپڑے اور جوتے پہن لیں گے اور تم سے ہرگز نہیں مانگیں گے لیکن آج بچے یہی کپڑے پہن کر جائیں گے کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری کنجوسی اور تنگی میرے بچوں پر نظر آئے۔'' چٹیا میں بل ڈالنے کے بعد مدیحہ نے جہیز کی دو سونے کی چوڑیاں نکال کر ایک ہاتھ میں ڈال لیں۔ شہزاد نے طنزیہ مسکرا کر مدیحہ کی طرف دیکھا۔

''ان چیزوں کی نمائش سے تم اپنے سکون اور عیش کوشی کا اعلان کرنا چاہتی ہو یا باقی غریب بہنوں پر اپنی امارت کا رعب جما رہی ہو۔ چلو تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہیں صاحب حیثیت شوہر ملا

ہے۔ باقیوں کی طرح فقیر، کنگال نہیں جو انہی کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں پھر بھی تمہیں میری قدر نہیں ہے۔'' مدیحہ کے لیے یہ سب باتیں معمول کا حصہ تھیں۔ اب تک تو اسے اتنا عادی ہو جانا چاہیے تھا کہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دے لیکن ایسا وہ چاہ کر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے افسوس سے شوہر کو دیکھا۔

''جو کچھ تم نے بری میں چڑھایا تھا واپس لے لیا۔ جہیز کا تھوڑا بہت چھوڑا ہوا ہے۔ یہ تمہارا احسان ہے اگر میں اسے پہنتی ہوں تو اس سے میری ہی نہیں تمہاری عزت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور دوسری بات یہ کہ میری بہنوں کے جو بھی حالات ہیں تمہیں ان کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے، ان کے شوہر ان کی فکریں ختم کرنے کے لیے کافی ہیں۔'' اس بات پر شہزاد نے بے ہنگم سا قہقہہ لگایا۔

''وہ بے چارے کیا فکریں ختم کریں گے۔ سسرال میں دو کوڑی کی عزت تک نہیں ہے ان کی۔ تمہارے کزن کی شادی میں طارق اور مکرم سے سارے ہی 'ہم' کروائے ہیں تمہارے چچا میاں نے اور وہ بے وقوفوں کی طرح کرتے رہے۔ ذرا مجھ سے کروا کر تو دیکھتے..... الٹا جواب ملتا۔'' مدیحہ افسوس سے شوہر کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

''محبت اور اپنائیت کس چیز کو کہتے ہیں یہ تمہیں سمجھ نہیں آ سکتی۔'' اب وہ بچوں کے کپڑے ٹائپ میں ڈالنے لگی تھی۔

''یہ لاکٹ تو پہن لو۔ جب سونا دکھانے ہی لگی ہو تو پورا دکھاؤ۔'' مدیحہ نے چونک کر دیکھا پھر شہزاد کے ہاتھ سے لاکٹ جھپٹ لیا اور دراز میں ڈالتے ہوئے بولی۔

''میں نے کہا ناں..... میں وہاں اپنی امارت دکھانے نہیں جاتی میری ماں کو ہمیں اچھا پہنا اوڑھا دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی ہے۔ میں اس خوشی کو قائم رکھنا چاہتی ہوں اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کہ میرے گھر میں کیسے حالات ہیں۔ بچے ناشتا وہیں جا کر کر لیں گے نہ آج ناشتا آیا ہے نہ دودھ اور نہ ہی دونوں وقت کا کھانا بنے گا اور ظاہر ہے رات کو آپ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھانا کھا لیں گے اس لیے میں نے نکل ربڑ کی یہ جو تیاں خریدی تھیں آج کے تین سو روپے ان جوتیوں پر خرچ ہوئے ہیں جو بچوں نے پہن رکھی ہیں۔ میں نے آپ کے بجٹ پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا اور رہ گئی بات اس سائیکل کی جس پر کل گھر میں ایک ہنگامہ ہو رہا تھا تو وہ میں خرید کر نہیں لائی تھی۔ آپ کا بیٹا فیضان فرسٹ آیا ہے اسکول میں اسے انعام ملا تھا۔''

''اوئے فیضان کے بچے..... تو نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تو فرسٹ آیا ہے۔'' شہزاد کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ مدیحہ چادر اوڑھنے لگی پھر شہزاد نے دیکھا تینوں بچوں کے ہاتھ میں ان کے رزلٹ کارڈ تھے۔

"یہ تم کہاں جا رہے ہو۔"

"ابو ہم یہ نانو کو دکھائیں گے۔ وہ ہمیں بہت سا پیار بھی کریں گے اور بڑے بڑے پریزنٹ بھی دیں گی..... یہاں تو ہمیں کوئی بھی کچھ نہیں دیتا کل ہم نے دادو اور پھوپیوں کو بھی دکھائے تھے اپنے رزلٹ مگر انہوں نے ہمیں کچھ بھی نہیں دیا۔" فیضان کی بات پر شہزاد کا سر جھک گیا اور ذرا دیر کے لیے شرمندگی نے اس کا احاطہ کیا۔ اتنے میں مدیحہ چھوٹے بیٹے کو کاندھے سے لگا چکی تھی۔

"فیضان نانو..... کی گاڑی کا ہارن بج رہا ہے جلدی کرو۔" مدیحہ دونوں بچیوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے لگی تو شہزاد نے مدیحہ کو روک لیا۔

"یہ تم بچوں کی تربیت کس طرح کر رہی ہو اس طرح تو بچے مانگنے کے عادی ہو جائیں گے۔ ہمارے گھر کا ماحول جیسا بھی ہے بچوں کو اسی کا عادی ہونا چاہیے۔" شاید وہ اپنی خجالت مٹا رہا تھا۔

"مجھے ان سب باتوں کا علم ہے۔" مدیحہ قدرے دھیمے اور جتانے والے لہجے میں بولی تھی۔ "میں خود اپنے بچوں کی ہر خواہش اس لیے پوری کرتی ہوں کہ وہ اِدھر اُدھر کی راہ نہ دیکھیں لیکن بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں معمولی خوشیوں اور چھوٹے چھوٹے تحفوں پر خوش ہو کر بہل جانے والے اگر آپ اس بات کو سمجھ لیں تو ہمارے درمیان کبھی جھگڑا نہ ہو۔" وہ نرمی سے کہہ کر نیچے اترنے لگی تو شہزاد نے دو سو روپے نکال کر مدیحہ کی طرف بڑھائے۔

"گاڑی منگوانے کی کیا ضرورت تھی۔ رکشے میں بھی جایا جا سکتا تھا۔ شام کو اپنے بچوں کے ساتھ رکشے میں آ جانا اور بچے کچھ کھانے کو مانگیں تو منگوا کر دے دینا۔" شہزاد کی بات پر مدیحہ کا دل بری طرح دکھا تھا۔ وہ اک نگاہ غلط شہزاد پر ڈال کر رہ گئی پھر فیضان سے مخاطب ہو کر بولی۔

"اپنے ابو سے یہ پیسے لے کر دراز میں رکھ دو۔ کل کام آ جائیں گے آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ امی کی گاڑی ہر اتوار ہی کو آتی ہے۔ آج پہلی بار تو نہیں آئی۔" اس کا انداز جتانے والا تھا۔ یہ کہہ کر وہ سج سج سیڑھیاں اترنے لگی۔ بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے خوشی و اطمینان سے اترتے چلے آ رہے تھے۔

☆☆☆

ارم نے ٹشو پیپر سے نوید کے ہونٹوں پہ آیا لعاب صاف کیا۔ پھر دوسرا ٹشو اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نوید اپنا سر سیدھا کرنا چاہتا تھا مگر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تو ارم نے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر سیدھا کیا پھر ایپرن لگا کر اسے ناشتا کرانے لگی۔ وہ اتنی محبت سے ایک، ایک لقمہ نوید کو کھلا رہی تھی کہ والہانہ تکتے تکتے نوید کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

نوید نے لقمہ نگل کر احسان مندی سے ارم کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ بولنے لگا۔

"پانچ سال سے تم میری خدمت کر رہی ہو اب تک تو تمہیں تھک جانا چاہیے تھا۔ تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ ارم..... مجھ سے تمہاری یہ معصومیت اور فرمانبرداری دیکھی نہیں جاتی۔" وہ بچوں کی طرح رونے لگا تھا ارم کی آنکھیں اس کی بے بسی پہ بھر آئیں۔

"کہاں جاؤں تم کو چھوڑ کر..... اور کیوں جاؤں.....؟" وہ چیخ گئی۔ "تین سال تم نے مجھے ماں کی طرح رکھا۔ اب تمہیں میری ضرورت ہے تو میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں۔" ارم اپنے جذبات پہ قابو نہ رکھ سکی تھی۔ رو پڑی..... مگر نوید شاید اس کی محبت کو آزما رہا تھا۔ سنگدلی سے کہنے لگا۔

"اب بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑا ارم۔ تم جوان ہو..... خوبصورت ہو۔ پانچ سال سے میرا سے اچھا علاج ہو رہا ہے۔ دو آپریشن بھی ہو چکے ہیں..... ریڑھ کی ہڈی کے آپریشن کے بعد ڑی نہیں۔ میں بھی مطمئن تھا..... مگر رزلٹ صفر ہی رہا ہے پھر میرا دوسرا آپریشن ہوا..... اور یہ میرا ی علاج تھا۔ میں ساری عمر ایسا ہی رہوں گا۔ تم اپنی زندگی۔ کب تک میری بیماری میں ضائع کرو گی۔" ارم نے آنکھیں پونچھتے ہوئے سر اٹھایا تو وہ خود بھی رو رہا تھا۔

"تمہاری ان باتوں سے مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہے۔" یہ ہوئے ارم نے اس کے گھٹنوں پہ سر رکھ دیا۔ وہ بری طرح سسک رہی تھی۔

"میں نہیں چاہتی نوید کہ تم کسی اور کے محتاج ہو جاؤ۔ تم ارم کو دوسرا وجود کیوں سمجھتے ہو۔ تمہارے وجود کا ہی دوسرا حصہ ہے جو غیر فعال حصے کی چپ چاپ ساری عمر خدمت کرتا رہے گا۔" ے کے آنسو نوید کے گھٹنوں پہ گر رہے تھے۔ جسے نوید اپنی ایک ٹانگ پہ تو محسوس کر سکتا تھا۔ دوسری پہ ں۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھ کو اس نے ارم کے سر پر رکھ دیا۔ اور اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں نے لگا۔

"اگر مجھے شوگر کا مرض نہ ہوتا۔ تو شاید..... فالج کا حملہ مجھے..... اتنا اپاہج نہ کرتا..... ہے ارم۔" وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے خود کو بہلا رہا تھا۔ ارم نے تڑپ کر اس کے ہاتھ کو ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تم اب بھی اپاہج نہیں ہو۔ اور..... کس نے کہا ہے کہ تمہیں فالج کا مرض ہے۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو نوید..... تم کسی کے محتاج نہیں ہو۔" وہ نوید کو دلاسے دے رہی تھی۔ اسے محتاج نہ ہونے کا دلا رہی تھی لیکن نوید کو پتا تھا کہ وہ محتاج ہے۔ کب اور کس، کس لمحے وہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔

"میں کیسے یقین کر لوں کہ میں محتاج نہیں ہوں۔ میں تمہارے بنا ایک پل بھی نہیں جی ۔" نوید کی بات پہ ارم ذرا سا مسکرائی۔ ارم کی مسکراہٹ نوید کو ایسی لگی جیسے بارش کے درمیان نکل آئی ہو۔ ارم نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور کہنے لگی۔

"یہ محتاجی نہیں، تمہاری مجھ سے محبت ہے کہ تم زندگی کا ایک پل بھی میرے بغیر نہیں گز سکتے۔ میں تمہاری زندگی ہوں نوید۔ تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔" نوید کو ہمیشہ کی طرح ارم یوں محبت بھرا احساس دلانا بہت اچھا لگا تھا۔ وہ خود کو پہلے سے زیادہ توانا اور بشاش محسوس کر۔ ہوئے مسکرایا تو ارم کو اس کی مسکراہٹ سے تقویت حاصل ہوئی۔ وہ پھر سے نوید کو ناشتا کرانے لگی۔

"میں اگر کوشش کروں تو اس ہاتھ سے کھا سکتا ہوں۔ مگر مجھے تمہارے ہاتھ سے کھانا ا لگتا ہے۔ تم میرے قریب ہوتی ہو۔ ارم۔ تو میں خود کو بہت توانا محسوس کرتا ہوں۔ لیکن......" یہ کہ نوید چپ سا ہو گیا۔ ارم نے سوالیہ نگاہ ڈالی۔

"تمہارا کبھی دل کرتا ہو گا کہیں آنے جانے کو۔ میری وجہ سے تم قید سی ہو کر رہ گئی ہو۔"

"سب یہاں ملنے تو آ جاتے ہیں مجھ سے۔" ارم کا انداز کچھ مصنوعی سا تھا۔ حالانکہ اس دل تو کرتا تھا آنے جانے کو...... مگر...... نوید کی ذمے داری چوبیس گھنٹے کی تھی۔ اور وہ اس سے غفلت نہیں برت سکتی تھی۔ اتنے میں زمان آنکھیں مسلتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔ ارم کوشش کرتی تھی زما کے سامنے کام کم سے کم کرے۔ خصوصاً نوید کو کھلانا پلانا...... اس کا منہ دھلوانا...... وغیرہ وغیرہ۔ زما معصوم تھا۔ وہ ان باتوں کو محسوس کرتا تو بہت سے سوالات اس کے ذہن میں آتے اور پھر وہ زمان کس، کس بات کا جواب دیتی۔ زمان ان باتوں کو محسوس کرتے کرتے تنہا ہو جاتا۔ وہ نہیں چاہتی تھ کہ زمان اپنے باپ کی بیماری کو بچپن سے ہی اپنے دل و دماغ میں بٹھا کر حساس ہو اور اپنے ہم ع بچوں سے پیچھے رہ جائے۔ اس لیے اس نے زمان کی روٹین ایسی بنا رکھی تھی کہ وہ گھر میں کم رہتا اس کی تعلیمی اور دوسری ایکٹی ویٹی باہر کی زیادہ تھیں۔ ان سرگرمیوں نے زمان کو جوشیلا اور خوش رُ ہوا تھا۔ گھر کے بوجھل اور افسردہ ماحول سے وہ دور ہی تھا لیکن یہ ارم اور نوید کی بھول تھی۔

"مما...... رات کو نانو کا فون آیا تھا۔ آپ نانو کے گھر نہیں جا رہیں؟" ارم نے انکار دیا...... جس پہ زمان بگڑ گیا۔

"سب بچے ہر ویک اینڈ پہ کہیں نہ کہیں جاتے ہیں۔ ایک آپ ہی مجھے کہیں لے کر نہ جاتیں۔ اگر میرے پاپا ٹھیک ہوتے تو میں روزانہ سیر کے لیے جاتا۔ پاپا آخر کب ٹھیک ہوں گے آپ تو مجھے کہیں بھی لے کر نہیں جاتیں...... حتیٰ کہ نانو کے گھر بھی نہیں۔" ارم نے بے ساختہ نوید ا طرف دیکھا اور نگاہیں چرا لیں۔ زمان سب کچھ محسوس کر رہا تھا۔ یہ ان کی بھول تھی کہ زمان اپ باپ کی بیماری سے غافل ہے۔

"نانو، خالائیں، ماموں سب یہاں ملنے کے لیے آتے تو رہتے ہیں۔" ارم نے اپ طرف سے تسلی کرانے کی کوشش کی لیکن زمان کو تسلی نہ ہوئی۔

"چھٹی کے روز میں اپنے دوستوں سے ملنے جاتا ہوں تو کوئی بھی اپنے گھر نہیں ملتا۔ ب کہیں نہ کہیں گئے ہوتے ہیں۔ کیا ان کے نانو، خالائیں، ماموں، ان سے ملنے نہیں آتے۔" ارم جواب ہو گئی جبکہ نوید کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہونہہ، یہ ہوئی ناں بات...... میرا بیٹا۔ میری طرح ذہین ہے۔ آپ کی مما نانو کے گھر ہ جانا نہیں چاہتیں۔ میرے بیٹے کو بھی جانے نہیں دیتیں۔ آج پاپا زمان کو خود لے کر جائیں گے۔"

"یاہو...... ہرے......" زمان چلاتا ہوا باپ سے چمٹ گیا۔ ارم نے شکوہ کناں نگاہوں ے نوید کی طرف دیکھا۔

"بچے کی خوشی کی خاطر ہر ویک اینڈ پر تم چلی بھی جاؤ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات میں ہیں ہر ہفتے کہتا ہوں۔"

"مگر میرا دل نہیں کرتا۔ تمہیں اکیلا چھوڑنے کو۔" ارم برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

"وسیم ہے ناں یہاں۔" اس نے ملازم لڑکے کا نام لیا۔ ارم کی تسلی نہیں ہوئی۔

"اچھا...... میں فرحت کو بھی بلا لوں گا۔ آج دفتر سے چھٹی تو ہے ہی۔ بھابی ابھی اپنے گئی ہوں گی ہمارا وقت باہم اچھا گزر جائے گا۔ ویسے بھی کافی دن ہو گئے ہیں، شطرنج کی کوئی یں ہوئی اور ہاں وسیم کو بھی بلا لیں گے۔ پھر تو سمجھو کھانے پینے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" ابھی یہ بحث ہو ہی رہی تھی کہ باہر گاڑی کا ہارن بجنے لگا۔ زمان بھاگ کر باہر نکلا...... اور دوسرے ہی پُرجوش سا اندر آیا۔

"مما، عدیل ماموں آئے ہیں۔ ہمیں لینے کے لیے۔" صفیہ کو پتا تھا۔ ارم ہرگز نہیں آئے رہمیشہ کی طرح یہ اتوار بھی مس کر دے گی۔ اس لیے انہوں نے گاڑی ڈرائیور کے ہمراہ نہیں لو دے کر بھیجی تھی۔ عدیل اندر داخل ہوا تو نوید کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ارم بے بس اب وہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

جامن اور لیموں کے درختوں نے دھوپ کی تمازت کو روک رکھا تھا۔ چنبیلی کے پودوں میں ل جوبن پر تھے۔ رات کی رانی سورج کی تندہی سے اونگھ رہی تھی۔ گل دوپہر کے قرمزی پھولوں کی ے کشادہ صحن کی خوبصورتی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مروہ کی مہک آب دھوا میں رچی بسی تھی۔ سرخ ب اپنی کشائش دکھا رہا تھا۔ آسٹریلین طوطوں کی چہکار ہمیشہ کی طرح ماحول کو رونق بخش رہی تھی۔ ایلا، سدابہار برآمدے کی سیڑھیوں پر بالترتیب رکھے ہوئے آنکھوں کو بھلے معلوم ہوتے تھے۔ برآمدے میں پڑا آبنوسی تخت اور بائیں جانب پڑا آبنوسی جھولا جو کبھی دلی سے آیا تھا اور

اس میں ان سبھی کا بچپن جھولتے ہوئے گزرا تھا، اب ان کے بچے ایک دوسرے کو اس میں جھولا دے رہے تھے۔ آج بھی گھڑونچی پر بالترتیب چار گھڑے رکھے تھے جن کی سرخی اور ٹھنڈک پیاس کی تمازت کو آنکھوں سے ہی سیراب کر دیتی تھی۔ گھڑونچی کے قریب ہی فل سائز فریج سرو قامت کھڑا تھا جو انواع و اقسام کے فروٹ و سبزیوں سے بھرا رہتا تھا۔ آج بھی اس گھر کی رونق وہی تھی جو ان سب کے ادوار میں ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک، ایک کر کے اس آنگن سے چڑیوں کی طرح اڑتی جا رہی تھیں مگر یہاں کی رونق اور آسودگی اب بھی اسی طرح زندہ تھی جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس آسودگی اور رونق کا نام ماں تھا۔ وہ بہت دنوں کے بعد آئی تھی۔ ماں کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔ زمانہ بچوں میں ایسے گھل مل گیا جیسے بہت دیر سے یہیں کھیل رہا تھا۔

ارم کی حالت پر صنم، صباحت اور مدیحہ دلگرفتہ ہو کر کچھ دیر کو اپنا، اپنا غم بھول گئی تھیں۔ چاروں کے دلوں پر اپنے، اپنے حالات کا بوجھ تھا۔ وہ اس غم کو چھپانا بھی چاہتی تھیں اور بانٹنا بھی چاہتی تھیں۔ صفیہ کی جہاندیدہ نگاہیں اپنی کسی بھی بیٹی کے غم سے پوشیدہ نہیں تھیں مگر وہ صرف زبانی سے اپنی بیٹیوں کا بوجھ بانٹ سکتی تھیں۔ کاتب تقدیر کے قلم کو مٹا نہیں سکتی تھیں جو دکھ ان کے حصے میں آنا تھے، آ چکے تھے مگر صفیہ کا دل ان کی آزمائشیں موڑنے کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتا تھا۔

”بے شمار موضوع تھے اور بے شمار باتیں تھیں تبھی عدینہ نے اس ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنی شاپنگ دکھانا شروع کی جو اس نے تا حال کی تھی۔ اس شاپنگ میں ان سب کے گرمیوں کے لان کے شاندار سوٹ تھے جو عدیل اور عدینہ خود خرید کر لائے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سب بچوں کے کپڑے بھی تھے۔ صفیہ، عدینہ کو ڈانٹنے لگیں کہ وہ کھانے کے بعد خود دکھاتیں لیکن عدینہ نے انتظار کیے بغیر جلدی جلدی ہر چیز دکھا دی جس کو جو، جو پسند آیا سب نے اٹھا لیا پھر موضوع عدینہ کے رشتے پر آ گیا۔ صفیہ، عدینہ کے رشتے کے بارے میں بتانے لگیں۔ وہ اپنی چاروں بیٹیوں سے اچھی طرح صلاح کر لینا چاہتی تھیں۔ کافی دیر تک عدینہ کا رشتہ ہی زیر بحث رہا۔ عدینہ کچن میں مصروف رہی۔ عدینہ کو اکیلا کام کرتا دیکھ کر سب کو عدیل کی بیوی کا خیال آیا لیکن سب کو یہی معلوم تھا کہ مہرین کو ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ بتا رکھا ہے۔

”چلو کام کاج نہ سہی، کم از کم ہم سے ملنے تو آتی۔“ صنم نے شکایت کی تو صفیہ نے بتایا کہ وہ اپنی امی کی طرف گئی ہے جس پر ان میں سے کسی کو بھی اعتراض نہ ہوا۔ ان کا یوں ”میاں مٹھو“ بننا عدینہ کو سخت برا لگتا تھا۔ عدینہ اپنا اظہار برملا کرتی تھی اور چاہتی تھی اس کی بہنیں بھی اچھے برے احساس کا برملا اظہار کیا کریں مگر وہ اپنے مسائل میں اتنی دب چکی تھیں کہ میکے کی کسی اعتراض والی بات پر بھی اعتراض نہیں کرتی تھی۔ وہ پلاؤ کو دم لگا کر باہر آ چکی تھیں۔

”سنڈے کو آپ لوگ آتی ہیں، بھابی کا حق نہیں بنتا کہ وہ سنڈے کو ہی اپنے میکے جائیں۔ آگے پیچھے بھی تو جا سکتی ہیں مگر نہیں جی۔ عدیل میاں کو یہ خوف لاحق ہے کہ کہیں سنڈے کو ان کی کسی کام کی زیادتی کا نشانہ نہ بن جائے اس لیے وہ صبح، صبح اسے خود چھوڑنے چل پڑتے ہیں۔“

”عدینہ، اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔ سب بیٹیاں چھٹی کے روز میکے جاتی ہیں ہم بھلا کیوں اعتراض کریں گے۔“ صفیہ نے عدینہ کو ڈانٹا۔

”تو اِن کے کون سے بچے ہیں جو وہ سنڈے کو منہ اٹھا کر چل پڑتی ہیں۔“ عدینہ کی بات بھی جائز تھی۔

”اس کے بچے نہیں ہیں مگر اس کی بہنوں کے تو بچے ہیں وہ اتوار کو آتی ہوں گی تو وہ بھی چلی جاتی ہے۔“ صفیہ کی حمایت پر عدینہ بھڑک اٹھی۔

”امی آپ ضرورت سے زیادہ بہو کی حمایت کرتی ہیں اسے اپنی ذمے داریوں کا آج احساس نہیں تو کل کیسے ہوگا۔“ اس کا خیال تھا اگلی بات پر اس کی باقی بہنیں تائید کریں گی مگر حسب توقع کسی نے بھی تائید نہیں کی۔ کیونکہ انہوں نے سامنے سے عدیل کو آتے دیکھ لیا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھیں۔ بھاوج کی برائی کر کے اکلوتے بھائی کے دل سے اتریں۔ ماں کے ضعیف وجود کے بعد بھائی تو تھا جس نے ان کی دادرسی کرنا تھی۔

”اچھا تو تم لوگ عدیل کے ڈر کی وجہ سے نہیں بول رہی ہو مگر میں تو کسی سے نہیں ڈرتی۔ ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہی ہوں امی کی بہو کا رویہ صحیح نہیں ہے۔ وہ دوسری بہنوں کو نظر انداز کرتی ہے اور عدیل اس کا ساتھ دیتا ہے۔“ عدیل، عدینہ کی اطلاع پر ہنس پڑا پھر اپنی بہنوں کے بیچ میں بیٹھتا ہوا بولا۔

”مانا کہ یہ درست ہی کہہ رہی ہے مگر آپ سب لوگ یہ بتائیں کہ وہ کام کاج کے لائق نہیں ناں پھر وہ خوانخواہ آپ لوگوں کے درمیان بیٹھ کر حالات کا جائزہ لے اور آپ لوگوں کی زندگی سے واقف ہو...... مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میری بہنوں کے ان مسائل سے واقف ہو جنہیں میں اس سے ڈسکس بھی نہیں کرنا چاہتا۔“ عدیل کی احتیاط اور محبت پہ چاروں ہی فریفتہ ہو گئیں جب کہ صفیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اپنے بیٹے کو بہنوں کی طرف سے بے پروا سمجھتی تھیں لیکن بے پروائی کے باوجود وہ بہنوں کے دکھ سے غافل نہیں تھا۔ صفیہ نے چپکے سے آنسو پونچھ لیے۔ عدینہ اس منظر سے دانستہ غائب ہو گئی کیونکہ اسے ایسے مناظر جذباتی بلیک میلنگ کے سوا کچھ نہیں لگتے تھے۔

”عدیل یہ تمہارے ہاتھ پر کیا ہوا ہے۔“ مدیحہ کی نگاہ پڑی تو سبھی متوجہ ہو گئیں۔

”کچھ نہیں۔“ عدیل نے مسکرا کر آستین کا بٹن بند کر دیا۔ کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

صفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیسے لگی یہ چوٹ تمہیں؟" صفیہ تڑپ اٹھی تھیں۔

"کل رات ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔"

"ایکسیڈنٹ......!" چاروں کی دبی دبی چیخیں نکلیں۔

"توبہ ہے، آپ لوگ تو ایسے ہو گئیں جیسے عہ جانے کیا ہو گیا ہو۔" عدیل ہنس رہا تھا۔ "ا
ایکسیڈنٹ تو نہ جانے کتنے ہوتے رہتے ہیں بس ذرا گاڑی کا ستیاناس ہو گیا۔" اسے تھوڑا سا افسو
تھا۔ "خیر...... میں نے تو ویسے بھی ماڈل بدلنا ہی تھا۔ اسی بہانے سہی۔" وہ جیسے خود کو بہلا رہا تھا۔

"تو صبح ڈرائیور کو تم نے میر علی کی گاڑی لانے کے لیے اس لیے کہا تھا کہ تمہاری گاڑی
صفیہ نے شکوہ کناں نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا تو عدیل کھسیانا سا ہنس پڑا۔

"میری گاڑی رات سے ہی ورکشاپ میں ہے۔ ایک ڈیڑھ لاکھ تو سمجھیں کہیں
گئے۔" وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے ایک دو ہزار کی بات کر رہا ہو۔

"مگر ایکسیڈنٹ ہوا کس طرح......؟" مدیحہ کو اب بھی بھائی سے ہمدردی ہو رہی تھی
کہ صباحت کی سوئی ایک ڈیڑھ لاکھ پر اٹک گئی تھی۔

"گاڑی ٹرالر سے ٹکرا گئی تھی۔ یہ تو شکر ہے ٹرالر کھڑا تھا اگر تصادم ڈرائیونگ کے دو
ہوتا تو گاڑی تو گاڑی میں بھی بچ نہ پاتا۔"

"اللہ نہ کرے۔" بہنوں نے دل تھام لیا۔

"اپنے ہاتھ سے صدقہ وغیرہ دے دینا۔ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور تم چھپائے پھر رہے
خدانخواستہ کچھ ہو جاتا۔ ڈرائیونگ سوچ سمجھ کر احتیاط سے کیا کرو۔" وہ اپنے تئیں ہمدردی کا اظہ
رہی تھیں جب کہ عدیل کو کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ بھانجا، بھانجی سے خوش گپیوں میں محو ہو چکا تھا۔

"میر علی نے ابھی تمہیں گاڑی دلائی تھی...... کوئی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں وہ کتنا نا
ہوں گے تم پر یہ اندازہ ہے تمہیں۔" صفیہ نے سرکش بیٹے کی لگام کھینچنا چاہیں تو عدیل اکھڑ گیا۔

"کس بات پر ناراض ہوں گے وہ مجھ پہ...... ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر تو نہیں کیا میں
حادثہ تھا، کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ گاڑی کی مرمت ہو جائے تو میں اسے سیل کر دوں گا۔
نے ہر حال میں نیا ماڈل لینا ہے۔ یہ آپ چچا میاں سے کہہ دیں۔"

"میں نہیں کہوں گی۔" صفیہ کو غصہ آ گیا۔ "پہلے کمانا سیکھو، خرچ بعد میں کرنا۔
دولت کو برباد کرتے کرتے یہ دن آ گئے ہیں۔ آخر میں کب تک دوسروں کے احسان اپنے سر
رہوں گی۔ خرچے ہیں تمہارے کہ کوئی حد ہی نہیں، شاہ خرچیوں کا اتنا ہی شوق ہے تو اس شوق کو م

طرح استعمال کرو۔ پہلے کماؤ، خرچ بعد میں کرنا۔" صفیہ، عدیل کی عادتوں سے زچ ہو چکی تھیں۔

"کسی کے باپ کا نہیں یہ سب کچھ...... اتنا چھوڑ کر گیا ہے میرا باپ...... ساری عمر بھی
کروں تب بھی ختم نہیں ہوگا۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے عدیل شاہ۔ بارش نہ ہو تو دریا بھی سوکھ جاتے ہیں۔ بجائے اس
کہ تم اپنے کنبے کا بوجھ اٹھاتے۔ الٹا مجھے ہی تم نے غیروں کے لیے بوجھ بنا رکھا ہے۔" صفیہ
یدہ ہوئیں تو عدیل بھڑک گیا۔

"اگر آپ کو اتنی ہی خودداری عزیز ہے تو چچا میاں سے حساب کرا لیں۔ آج ہی وہ ہماری
براد اور کاروبار علیحدہ کر دیں میں خود ہی سنبھال لوں گا، لنگڑا، لولا نہیں ہوں۔ نہیں ہے ہے مجھے بھی
کے احسان کی ضرورت۔"

"پہلے تم اس قابل تو ہو جاؤ۔" صفیہ نے بیٹے کی دھمکی میں آئے بغیر غصے سے کہا تو عدیل
میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"کیا نہیں کر سکتا میں...... سب کچھ کر سکتا ہوں۔ دراصل آپ ہی نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔"
ماں کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ آج اس کی بے جا ہٹ دھرمی اور الزام پوشی پر صفیہ بھڑک گئیں۔

"کر لیتے...... کیوں نہیں کر لیا آج تک کچھ۔ میر علی نے عمر بھر کا ٹھیکا نہیں اٹھایا تھا۔ اب
قابل ہو چکے ہو کہ اپنا اور اپنی بہنوں کا برا بھلا خود سوچو مگر تمہیں کیا ضرورت اس فکر کی۔ تمہاری
اور ہٹ دھرمیوں نے مجھے میرا...... جائز حق مانگنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔" صفیہ رو پڑی
۔ صنم اور صباحت ماں کے قریب ہو کر انہیں چپ کرانے لگیں۔

"بہنوں کا کیا سوال ہے۔ ہر ایک اپنے وقت میں اچھے سے اچھا جہیز لے کر جا چکی ہے۔
کے کاروبار اور جائیداد کا تنہا وارث میں ہوں۔ زندگی اجیرن تو میری ہو رہی ہے۔ ہر چیز کا مالک
ہوئے بھی بھکاریوں کی طرح زندگی گزار رہا ہوں اور وہ باپ، بیٹے عیاشی کر رہے ہیں۔ کیسی
کی زندگی گزار رہے ہیں وہ۔ ہر ایک کے پاس اپنی گاڑی ہے۔ مہنگے سے مہنگا موبائل اور دنیا
کی عیاشیاں...... میں گاڑی لے لوں گا تو قیامت ہی آ جائے گی۔"

"بات صرف ایک گاڑی کی نہیں ہے۔ ان عیاشیوں کی ہے جو تم نے پال رکھی ہیں اور جن
سے مجھے میر علی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ پینے پلانے کے شوق کو تم نے زندگی کا حصہ
ہے۔ پانچ بہنوں کے اکلوتے بھائی ہو۔ کبھی لاج نہیں آئی تمہیں اپنے اس فعل پہ۔ کم از کم ماں
فید بالوں کا ہی لحاظ کر لو۔" صفیہ نے دلبرداشتگی سے کہا تھا۔

"اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ یہ اس بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے جو اسے اکلوتے ہونے

کی وجہ سے ملا۔" عدینہ نے دور بیٹھے دل ہی دل میں سوچا تھا جب کہ عدیل تھوڑا سا کھسیایا تھا۔

"ایسے چھوٹے موٹے شوق آج کل ہر کوئی پالے پھر رہا ہے۔ ان باتوں پر اعتراض عجیب لگتا ہے۔ یہ زندگی میری ہے۔ میں اسے جیسے چاہے جیسے مرضی گزاروں۔" وہ بے پروائی سے ان سب کا بہت دل دکھا۔

"سن رہی ہو تم لوگ اس کے خیالات..... ان حالات میں یہ اپنا حصہ مانگ رہا ہے۔" صفیہ غصے کے گھونٹ پی رہی تھیں۔

"آج نہیں تو کل یہ تو ہونا ہی ہے۔" عدیل نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

"میرے مال کا کوئی اور مالک بنے میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ عدینہ کی شادی ہو جائے اپنا حصہ علیحدہ لے لوں گا پھر سب کے مفادات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ سے نکل گیا۔

عدیل کے رویے نے صفیہ کو ہی نہیں ان سب کو دلبرداشتہ کیا تھا مگر عدینہ کے لیے عد رویہ کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ اس کے ایسے ڈرامے دن رات دیکھتی تھی اور انہی ڈراموں کو دیکھتے ہو اکیلے میں ماں سے کہتی تھی۔

"عدیل میں ذرا بھی دید لحاظ نہیں ہے ابو کو تو زندگی نے مہلت نہیں دی مگر آپ اپنی کا بھلا سوچ سکتی ہیں۔"

"جو کچھ مجھ سے ہو رہا ہے، میں کر رہی ہوں اور جب تک زندہ ہوں، کرتی رہوں گی صفیہ آبدیدہ ہو کر کہتیں تو عدینہ ماں کی مجبوری کو ٹٹولنے بیٹھ جاتی۔

"آپ اپنی زندگی میں اپنی بیٹیوں کے نام حصے لکھ دیں۔ کم از کم روز روز مانگنے کی ا سے تو محفوظ ہو جائیں گی۔" صفیہ نے چونک کر عدینہ کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"اگر میں ایسا کر سکتی تو کب کا کر چکی ہوتی۔ یہ سب کچھ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ چیز کے مالک و مختار میر علی ہیں۔ تمہارے ابو مرنے سے مترہ سال پہلے گردوں کے مرض کی وجہ کاروبار سے دستبردار ہو چکے تھے۔ میر علی نے کاروبار کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جائیدادیں خرید تمہارے ابو یونہی نہیں اپنے چھوٹے بھائی پر اعتماد کرتے تھے۔ وہ زندگی میں ہی سب کچھ میری ا سونپ گئے تھے اور میر علی نے واقعی اس اختیار کا حق ادا کیا ہے۔ آج تک مجھے کسی چیز کی تنگی نہیں، کبھی کسی بات کا طعنہ نہیں دیا۔ سب سے بڑھ کر میرے اوباش بیٹے کا بوجھ برداشت کر رہے ہ میری بیٹیوں کے دکھ سکھ سہہ رہے ہیں اور مجھے امید ہے میرے بعد بھی وہ اپنی بھتیجیوں سے غافل ہوں گے پھر میں کیسے جائیداد کے حصوں کی علیحدگی کا مطالبہ کروں اور کیا گارنٹی ہے اس بات کی

میں اپنی بچیوں کو حصے دے دوں۔ کیا ان کے کمائو شوہر اسے سنبھال لیں گے۔ جیسے حالات مکرم ہیں..... آئے دن مطالبہ لیے کھڑا ہوتا ہے پھر ضم کہاں جائے گی؟ تمہیں نہیں پتا عدینہ تم بہت انی ہوا کر میں ایسا کر گئی تو اس گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری بچیوں کے لیے بند ہو یں گے پھر وہ کہاں جائیں گی۔ تمہیں ابھی اندازہ نہیں ہے۔ میکے کا دروازہ بیٹیوں کے لیے کتنی ڈھال ہوتا ہے۔ مجھے خود کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتی۔" صفیہ کے عذر ہ کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ سو وہ خاموشی اختیار کر لیتی تھی۔

کئی بار اس کا جی کرتا ماں سے کہے۔ "امی اتنی بڑی جائیداد میں آپ کا اپنا حصہ بھی تو ہو وہی اپنی بچیوں کے نام کر دیں....." مگر پھر لبوں میں ہی فیصلہ دم توڑ دیتا۔ امی بے چاری ان سادہ سی عورت کیا جانیں گی کہ کس چیز میں کون حصے دار ہے۔ صفیہ نے بیٹیوں کے اترے چہرے لیے تو خود کو سنبھال لیا۔ وہ تو خود غموں سے نڈھال ہی یہاں آئی تھیں بجائے خوشیاں دینے کے یل ماحول کو پژمردہ کر گیا تھا۔

"تم میں سے کوئی بھی عدیل کی کسی بات کو اپنے دل پر نہیں لے گا۔" صفیہ بیٹیوں کی غم اری کرنے لگی تھیں۔

"ہاتھ دھوؤ اور سب لوگ کھانا کھاؤ، اس کے نماز ظہر ادا کرنا۔" پھر انہوں نے عدینہ سے ا کہ دسترخوان..... چن دے۔

ماں کے کہنے پر سب باری باری دسترخوان پر آ گئیں بچے پہلے ہی کھانے سے انصاف کرنے گے تھے۔ بظاہر سب ہی کھانا کھا رہی تھیں مگر اندرونی طور پر الگ، الگ کیفیات سے دوچار تھیں۔

"مکرم نے پیسوں کا دباؤ ڈال رکھا ہے اگر اس نے فون کر دیا تو میں امی سے کس منہ سے مانگوں گی۔ امی تو خود بیٹے کی طرف سے دلگرفتہ اور پریشان ہیں۔ میرے حالات فاقوں پر پہنچ ے ہیں۔ جب میں آ کر ماں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہوں اگر یہ چھ بچے نہ ہوتے تو کبھی بھی مکرم حوصلہ افزائی نہ کرتی مگر میں کیا کروں میں بھی تو مجبور ہوں، میں لاکھ مکرم سے لڑ جھگڑ لوں مگر رے مسائل کا حل تو نہیں نکلتا۔ وہ جتنے دن گھر میں پڑا رہے گا فاقوں تو ہوں گے..... گھر میں فساد ی پھیلے گا۔ جوان بچوں کے سامنے مکرم مارنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ آخر میں کب تک یہ ذلت داشت کروں گی۔ مجھے بھی تو اس گھر کے علاوہ دوسرا گھر نظر نہیں آتا۔"

ادھر صباحت کی سوچیں عدیل کی ناجائز خواہشات کی تکمیل پر اٹک گئی تھیں۔ "واہ ری لت کسی کو ناجائز خرچ کرنے کو لاکھوں نواز دیتا ہے اور کوئی صرف جائز ضرورتوں کے لیے چند پوں کو ترستا رہ جاتا ہے۔ کیسا نظام ہے یہ تیرا۔ آج ثمن کی طبیعت خراب تھی۔ میں نے رات بھر

محنت بھی کی مگر مجھے وقت پر مزدوری بھی نہ مل سکی ادھر طارق نے بیٹی کی خاطر اپنا خون تک فروخت دیا۔ ایسا پہلی بار نہیں پہلے بھی دو بار کر چکا ہے جب کوئی امتحان آن پڑتا ہے وہ اپنا لہو بیچنے نکل ہے۔ ہم دونوں نے ہی اپنی جھوٹی انا اور کھوکھلی شان و شوکت کی خاطر اپنے حالات کو زمانے سے م رکھا ہے مگر پھر بھی ہمارے حالات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ میرا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کو نہیں کرتا۔ چچا میاں اور چچی جان، صنم کو کتنا حقیر اور کمتر سمجھتے ہیں یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے میں اس حقارت سے بچنے کے لیے محنت کرتی ہوں طارق کا برابر بوجھ بٹا رہی ہوں پھر بھی ہم کو مسائل سے نہیں نکال پا رہے۔ شاید اس لیے کہ طارق خالی ہاتھ نکالے گئے تھے۔ بنیادی پونجی ہونے کی وجہ سے جو کماتے ہیں روزمرہ میں خرچ ہو جاتا ہے۔ آج طارق نے کیا کھایا ہوگا۔ میں یہاں انواع و اقسام کے کھانے کھا رہی ہوں۔ آج طارق کو اچھی غذا کی ضرورت تھی مگر آج ہی آ نے ہوٹل سے چنے اور روٹی کھائی ہوگی نہ جانے کھائی بھی ہوگی یا نہیں۔'' یکدم صباحت کا کھا سے دل اچاٹ ہو گیا۔ سب لوگ کھانا کھانے میں مگن تھے وہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ جب وہ کمر میں داخل ہوئی تو صفیہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے صبا، تم اچانک یوں کھانا چھوڑ کر کیوں اٹھ گئیں؟''

''میں نے کھانا کھا لیا ہے امی۔ ثمن کو سوئے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے اسے فیڈ بھی کرا ہے اور دوا بھی دینی ہے۔ کہیں پھر سے اس کا بخار تیز نہ ہو جائے۔'' یہ کہتے ہوئے صباحت نے ثمن گود میں لٹا لیا۔ صفیہ، صباحت کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

''بچوں کی پریشانی ایسی ہی ہوتی ہے۔ نہ نیند کا خیال رہتا ہے اور نہ کھانے پینے کا۔'' مدیحہ نے ماں کی توجہ بٹانے کی کوشش کی تو صفیہ دلگرفتی سے مسکرا دیں۔

''میں بھی تو تمہاری ماں ہوں۔ تم لوگوں کو اس بات کا خیال کیوں نہیں آتا۔ صبا کا منہ سوکھ کر کبا ڑا ہو گیا ہے۔ کیا اس طرح پلتے ہیں بچے۔ کم از کم پیٹ بھر کر کھانا تو کھا لینا چاہیے۔ ارم کو دیکھتی ہوں دل کٹتا ہے۔ اتنی سی عمر میں آنکھوں کے گرد ایسے سیاہ حلقے......'' یہ کہتے ہوئے صفیہ آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ صباحت کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔

''ایک دن پیٹ بھر لینے سے ماں جسم کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔'' صباحت نے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو بڑی احتیاط سے چھپا لیا تھا۔ البتہ ارم کھوکھلی مسکراہٹ سے بولی۔

''میرے تو چہرے کی ساخت ہی ایسی ہے آپ کو تو بس وہم رہتا ہے۔'' صنم اور مدیحہ نے رنجیدگی سے چھوٹی بہن کی طرف دیکھا۔

''نوید کے لیے ساری ساری رات جاگنا پڑتا ہوگا...... ہے نا ارم۔'' صفیہ کے جذبات

رہے تھے۔ ارم نے نظریں چرا لیں پھر آخری لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

''امی...... ہم آپ سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔'' ارم کی آواز میں لرزش تھی۔ صفیہ کے آنسو

''میرے اختیار میں ہوتا تو میں تم سب کو اپنے کلیجے میں چھپا لیتی اور دنیا کا کوئی غم ے قریب نہ آنے دیتی مگر میں کیا کروں۔ میں بے بس تھی۔ میں تمہیں اچھے سے اچھا جہیز تو کتی تھی مگر نصیب نہ دے سکی۔'' یہ کہتے ہوئے صفیہ نے اپنے آنسو صاف کیے اور پانی کا گلاس ں سے لگا لیا۔ ارم کھانا چھوڑ کر ماں کے قریب آ گئی اور ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔

''آپ نے جب میری شادی کی تھی نوید ایسے نہیں تھے۔ شادی کے بعد لوگ ہنی مون پر تے ہیں لیکن نوید نے مجھے حج کی سعادت سے سرفراز کرایا تھا۔ کیا ہم اچھے دن بھول جائیں گے۔'' ہہ کر ارم رو پڑی۔ صفیہ نے اس کے چہرے کو چمکارا تھا۔ ارم نے ان کے شانے پہ چپ چاپ سر الی اور سسکتے ہوئے بولی۔

''امی...... یہ اچھے دن تھوڑے کیوں تھے؟'' صفیہ نے تڑپ کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں ں لے لیا۔

''ناشکری کی باتیں نہیں کرتے ارم...... تم میری سب سے بہادر بیٹی ہو۔'' پھر اچانک ان ل نگاہ صباحت پر پڑی تو کہنے لگیں۔

''میری صبا بھی بہت بہادر ہے۔'' صباحت کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آ کر معدوم وگئی پھر انہوں نے باری باری صنم اور مدیحہ کو دیکھا۔ صنم کے حالات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ ملدستی میں تو تھی ہی دوسرا یہ کہ مکرم کی عادتیں بھی ناقابلِ برداشت تھیں۔ مدیحہ بظاہر تو ٹھیک ٹھاک مرانے میں آباد تھی لیکن جوائنٹ فیملی سسٹم کی وجہ سے اور فقط شہزاد کے سر پر ساری ذمے داریاں ونے کی بدولت اس کی زندگی بھی گھٹن کا شکار تھی۔ شہزاد پر پورے کنبے کا بوجھ تھا۔ وہ اپنے گھر والوں تو خرچ کر لیتا تھا لیکن اپنی قناعت اور بچت بیوی، بچوں پر پوری کرتا جس کی وجہ سے مدیحہ محسوس کرتی تھی۔ بچے بدنیتی کا شکار ہو رہے تھے اور ابھی بھی اس بدنیتی کا نظارہ اس نے اس دسترخوان پر یکھا تھا جہاں وافر کھانا ہونے کے باوجود بچے چیزوں پر جھپٹ رہے تھے۔

''میری ساری ہی بچیاں بہادر ہیں۔'' صفیہ نے سب کی تعریف کی تو عدینہ درمیان میں ول پڑی۔

''نہ جانے امی کس چیز کو بہادری کا نام دے رہی ہیں۔ چپ چاپ حالات کی چکی میں پسنے کو بہادری کہتے ہیں تو یہاں کی ہر عورت بہادر ہے۔'' صفیہ نے شکوہ کناں نگاہوں سے عدینہ کی

طرف دیکھا۔ وہ برتن لے کر باہر چلی گئی تو اپنی بڑی بیٹیوں سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"کبھی کبھی مجھے عدینہ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ نہ جانے اس لڑکی کی سوچ ایسی کیوں ہے۔"

"اس عمر میں سب کی ایسی ہی سوچیں ہوتی ہیں۔ میں بھی کبھی صنم آپا کے حالات پر کڑ کرتی تھی مگر مجھے کیا پتا تھا، میں بھی گردش حالات میں آجاؤں گی۔ نوید کی بیماری نے مجھے اپنی عمر بیس سال آگے کر دیا ہے۔ یکدم ہی لڑکپن ختم ہو گیا ہے۔" ارم نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ ماں سے کہا۔

"عدینہ کے لیے دعا کیا کریں اس کا نصیب ہم میں سے کسی کے جیسا نہ ہو۔" وہ رنجیدہ سے کہتے ہوئے ماں سے الگ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

رات کو سب کے جانے کا وقت ہو چلا تھا مگر بچے ابھی تک تھکے نہیں تھے۔ کھیلنے میں مگ تھے۔ لگتا تھا کہ ان کا جانے کا من ہی نہیں ہے۔ ادھر صنم دل گرفتہ سی بیٹھی تھی اور انتظار کر رہی تھی کہ اس کی بہنیں جائیں تو وہ اپنی ماں سے بات کرے۔ صفیہ، صنم کی پریشانی کو سرِ شام سے ہی محسوس کر رہی تھیں۔

"مدیحہ اور ارم کے جانے کے بعد صنم ماں کے پاس آ گئی اس کے چہرے کا رنگ پھیکا رہا تھا اور الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ یہ صنم کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ کس خفت اور شرمندگی۔ ماں سے بات کر رہی تھی۔

"امی...... میں نے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ لفظوں کو ترتیب دینے لگی صباحت دانستہ وہاں سے اٹھ گئی۔ صنم کی آنکھوں میں پانی آ گیا اور اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"امی مکرم کا فون آیا تھا۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "اس نے کہا ہے اگر میں پ لے کر نہیں آتی تو اس کے گھر میں قدم نہیں رکھوں۔ بچوں سمیت یہیں رہوں۔" یہ کہہ کر صنم رو پڑی صفیہ کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

"امی میں ان چھ بچوں کو آپ کے اوپر بوجھ بنانا نہیں چاہتی مگر میں کیا کروں، مجھے کوا راستہ بتائیں......؟" وہ ہچکیوں کے درمیان بول رہی تھی۔

"میں ہر طرح سے کوشش کرتی ہوں...... مکرم کو ٹالنے کی مگر مجھے بھی اس در کے سوا کوا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔" صفیہ نے صنم کے سر پر ہاتھ رکھا آبدیدہ لہجے میں بولیں۔

"سب سے بڑا در اس کا ہے جو خالق و مالک ہے وہی رازق بھی ہے۔" یہ کہہ کر صفیہ اپنے اور صنم کے آنسو پونچھنے لگیں۔

"آپ نے مجھے زیادہ تعلیم دلوائی ہوتی تو میں کہیں نوکری کر لیتی۔ کوئی ہنر میرے ہاتھ ہوتا تو مزدوری بھی کر لیتی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میری قسمت اتنی خراب ہو گی۔" صفیہ نے خاموشی اس کا کاندھا تھپتھپایا تھا۔

بہن کے حالات پر صباحت کا دل دکھ سے بھر گیا مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ تو خود اس گرداب گھری تھی وہ چپکے سے عدینہ کے پاس کچن میں آ گئی۔ جہاں عدینہ کھانے پینے کے سامان کو فریزر رکھ رہی تھی۔

"امی نے کہا تھا کہ مدیحہ اور ارم آپی کو کھانا باندھ کر دے دوں کیونکہ بچوں نے صحیح طرح نا نہیں کھایا تھا۔ اس کے باوجود بھی اتنا سارا کھانا بچ گیا ہے۔ صبح ماسی سکینہ آئے گی امی انہیں ے دیں گی۔"

"اتنا سارا کھانا......!" صباحت کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ (ایسا کھانا تو بچوں کو کبھی نہیں ہوتا تھا اور یہاں کام والیاں......)

"صنم آپا کے لیے ٹفن علیحدہ بنا دیا ہے۔ بچے تو ابھی یہیں ہیں ناں۔ وہ یہ کھا لیں گے اور با آپی آپ...... میں تو کہہ رہی ہوں دو چار دن کے لیے ادھر ہی رک جائیں۔ بہت دیک ہو رہی یں آپ۔"

"تو کیا ادھر رکنے سے پھونک بھر جائے گی مجھ میں۔" صباحت کھوکھلی مسکراہٹ سے مسکرائی تو عدینہ چڑ گئی۔

"دراصل آپ لوگوں کو بھی ناں تختۂ مشق بننے کی عادت ہے۔ بس میں نے کہہ دیا ناں آپ ادھر ہی رک رہی ہیں اور ایک ہفتے کے بعد جائیں گی۔"

"کوئی زبردستی ہے کیا؟" صباحت ہنس پڑی۔

"ہاں...... زبردستی ہی ہے کیونکہ آپ سے میں نے اپنے لان کے سوٹ سلوانے ہیں۔ ں نے سوچا فی سوٹ ڈیڑھ سو روپے درزی کو بھی تو دوں گی کیوں نہ یہ کام آپ کے سپرد کر دیا ائے۔" شرمندگی کی وجہ سے صباحت کا سر جھک گیا اور تذلیل کے احساس سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عدینہ نے اس کی خفت کو محسوس کر لیا تھا۔

"آپ کو میری بات بری لگی ہے تو میں معافی مانگتی ہوں مگر صبا آپی...... محنت میں کیسی شرم۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے مزدوری...... صنم آپا سے بہتر نہیں ہیں آپ کے حالات لیکن طارق بھائی خوددار انسان ہیں۔" صباحت کے چہرے پر تلخی پھیل گئی۔

"چھوڑو عدینہ اس موضوع کو۔ آج کے دور میں خوددار انسان کو لوگ بزدل اور کمزور سمجھتے ہیں۔"

"تو پھر اس بزدلی کو اتار پھینکو...... مانگ لو اپنا حق۔" اتنی بڑی بات عدینہ نے کتنے سکو سے کہہ دی تھی۔ صباحت چونک کر رہ گئی۔ عدینہ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو عدینہ؟" صباحت چھوٹی بہن کو جیسے ہوش دلا رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے جو بیٹیاں اپنا حق مانگ لیتی ہیں۔ زمانہ انہیں اچھا نہیں سمجھتا۔ برادری؛ انہیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ میکے کے دروازے ان کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ بھائیوں. دل میں عزت نہیں رہتی۔"

"کیوں......؟" عدینہ ڈٹ کر بولی۔ "جب بھائی، بہنوں، بیٹیوں کے حق پر عیاشیا کرتے ہیں تب زمانہ کہاں چلا جاتا ہے۔"

"عدینہ خدا کے واسطے اپنی آواز کو دھیما کر لو کوئی سن لے گا تو یہی سمجھ لے گا کہ ہم لوگ ا چاہتے ہیں۔ اس لیے تم سے کہلوا رہے ہیں۔" صباحت رو دینے کو تھی۔

"کب تک ڈر ڈر کر جئیں گے آپ لوگ۔ عدیل کے خیالات سنے نہیں، کیسے ہیں۔ امی۔ بعد پھر کیا بچ جاتا ہے...... ہمارے لیے یہاں......؟" عدینہ جیسے صباحت کو اکسانے پر تلی بیٹھی تھی۔

"یہ بات امی کو خود سوچنی چاہیے۔ ہم اپنے منہ سے کہیں گے تو اچھے نہیں لگیں گے اور گیا عدیل تو اس نے ایسا ہی بننا تھا۔ اکلوتا پن کوئی نہ کوئی چاند تو ضرور چڑھاتا ہے ناں......!"

"صرف اکلوتا پن ہی نہیں بے جا خواہشوں کی تکمیل بھی کہیے۔" عدینہ چڑ کر بولی تھی

"آپ کو اندازہ ہے اس کے روزمرہ کے خرچے کتنے زیادہ ہیں"

"ہمیں اس سے کیا عدینہ۔ ہمارا چھوٹا بھائی ہے وہ اگر خوش باش زندگی بسر کر رہا ہے تو کیوں اس کی خوشیوں سے جلیں۔"

"یہی تو سوچ کا تضاد ہے آپ لوگوں کا۔ اب میں اس کے آگے کیا کہہ سکتی ہوں۔" عدینہ جیسے زچ سی ہو گئی تھی۔ اب صباحت اسے جواب دیتی کہ صباحت کا بیٹا کچن میں آ گیا۔

"مما آپ کو اور خالہ کو نانو بلا رہی ہیں۔" دونوں بڑے کمرے میں آئیں تو دیکھ کر حی رہ گئیں۔ ماں کے علاوہ میر علی بھی موجود تھے۔ کونے میں ایک طرف صنم رنجیدہ و ملال سی بیٹھی تھی۔ صفیہ کے چہرے پر بے بسی تھی تو میر علی متفکر اور رنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں ہی سمجھ گئیں کہ صنم آپا کا ہی مسئلہ درپیش ہے۔ دونوں میر علی کو سلام کر کے یکے بعد دیگرے بیٹھ گئیں۔ میر علی گفتگو کا آغاز کیا۔

"مدیحہ اور ارم چلی گئیں اگر وہ ہوتیں تو میں انہیں بھی اس وقت شامل کرتا کیونکہ میں وقت ضروری بات کرنے جا رہا ہوں۔" اس کے بعد انہوں نے توقف کیا اور کہنے لگے۔ "بات

م بیٹی کے مسائل روز بروز ہمارے لیے ایک جال کی طرح پھیلتے جا رہے ہیں۔ صنم خود ان مسائل ں کس طرح گرفتار ہے یہ ہم میں سے کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میر علی نے گہری سانس پھر ضبط کرتے ہوئے بولے۔

"ہم مکرم سے بارہ سال سے تعاون کر رہے ہیں۔" چچا کے ان لفظوں پہ صنم کا سر جھک ۔اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں۔

"لیکن مکرم میاں نے ہمیشہ ہی ہمیں مایوس کیا۔ کبھی تو وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرنے ے لیے دنیا کے وزٹ پر نکل جاتے ہیں تو کبھی کارخانہ لگا لیتے ہیں بھلا اس طرح کاروبار ہوتے ں۔ مکرم میں ذرا بھی سنجیدگی اور پختگی نہیں ہے۔ آج دور ایسا ہے لوگ ایک سے دو روپے کمانے کا چ رہے ہیں جب کہ مکرم میاں، لاکھوں روپے یکدم کمانے کے چکر میں تھوڑی پونجی بھی تباہ و برباد رو دیتے ہیں۔ اب آپ لوگ مجھے بتائیں اگر میں اب بھی دو تین لاکھ روپے دے دوں تو کیا گارنٹی وہ چھ ماہ بعد خالی ہاتھ صنم کو اس دروازے پر لا کھڑا نہیں کرے گا۔" شرمندگی و ذلت کے احساس نم کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ یہ سب عدینہ کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ دل ہی دل میں ھ رہی تھی۔

"چچا میاں...... اگر صنم آپا کی مدد کر چکے ہیں تو ان احسانات کو جتلانے کی ضرورت کیا ۔صنم آپا کو حقیر اور کمتر ثابت کرنے کے لیے۔ ہمیں بٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ تماشا بنوانے کے یا گواہ بنانے کے لیے۔"

"اب میں نے فیصلہ کیا ہے مکرم کو کاروبار کے لیے ایک روپیہ نہیں دوں گا۔ میں نے صنم سے پوچھا ہے کہ اس کے گھر کا ماہانہ خرچ کیا ہے اور کتنا ہے؟ پندرہ ہزار، بیس ہزار جو بھی صنم کا خرچ ہے۔ میں دیتا رہوں گا۔ جب تک صنم کے بچے کسی قابل نہیں ہو جاتے۔" چچا میاں کے ۔بڑے احسان اور رحمدلی پر صنم کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ صباحت کی بھی آنکھیں نم ہو گئیں کہ عدینہ کا دل بھی پسیج گیا۔ وہ جو چچا میاں کے خلاف دل میں وسوسے پیدا کر رہی تھی۔ سبھی ہو گئے مگر چچا میاں ابھی اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھے۔

"کچھ دن پہلے مجھے بھائی صاحب خواب میں نظر آئے تھے۔ وہ کچھ پریشان اور ملول ۔ ان کے ایصالِ ثواب کے لیے مدرسے کی تعمیر میں دس لاکھ مختص کیے ہوئے تھے۔ سبھی جانتے ں مگر بھائی صاحب اتنا کچھ چھوڑ کر گئے ہیں اگر ہم سال بہ سال دیتے بھی رہیں تو کچھ فرق نہیں ا۔ اسی لیے جامع مسجد میں پانچ فل سائز ایئر کنڈیشن لگوا دیے ہیں۔ بھائی صاحب کے صدقۂ یہ کے لیے انشاء اللہ اب انہیں راحت ہی راحت ہو گی۔" وہ بڑے فخر سے بتا رہے تھے۔ صفیہ

نے تشکر سے میر علی کی طرف دیکھا اور اپنی نم آنکھیں پونچھ لیں۔ بھتیجوں کے دل میں بھی چچا بلند ہوا تھا۔

☆☆☆

ساری رات صباحت کو نیند نہیں آئی تھی۔ وہ کروٹیں بدل بدل کر بے حال ہو رہی بچے علیحدہ گرمی اور مچھروں کی وجہ سے بے چین تھے۔ یہ کرم نوازی لوڈ شیڈنگ کی تو تھی ہی.... ماحول کی بھی تھی جو گرمی کی تپش سے بچانے کے لیے ناکافی تھا۔ دو کمرے، چھوٹا سا صحن، ایک روم اور عارضی سا کچن پچھلی طرف جگہ تھوڑی سی پڑی تھی۔ ''اللہ دے دیتا تو ادھر لینٹر کی چھت لیتے۔'' سرکنڈوں کی چھت جب پنکھا چلتا تو گرم تھپیڑوں سے نوازتی۔ باہر سونا اور بھی محال تھا۔ چین ہی نہیں لینے دیتے تھے۔ چچا میاں کے الفاظ اب بھی کانوں میں گونج رہے تھے۔

''مدرسے میں دس لاکھ مختص کیے ہوئے تھے، جامع مسجد میں پانچ فل سائز ایئر کنڈ لگوائے ہیں'' صباحت بے چین ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے اندر سے تپش نکل رہی تھی۔ ''کیا م نمازیوں کو ہی ٹھنڈک اور سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ معصوم بچے۔ کیا ان کا اس مال پر کوئی نہیں ہے.....؟''

''کیا بات ہے نیند نہیں آ رہی؟'' طارق کی آنکھ کھل گئی۔ صباحت نے بے چینی سے چہرے پر ہاتھ پھیرا خود ہی ہنس پڑی۔

''انسان کو اپنے نصیب کا کچھ نہیں پتا ساری عمر اے سی میں رہنے والی۔ ان سرکنڈوں چھت کے نیچے گزارہ کرے گی۔ سوچتی ہوں تو حیرانی ہوتی ہے۔ اتنی تو برداشت کہاں سے مجھ میں۔'' وہ جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھی۔ طارق حیرانی سے بیوی کو دیکھنے لگا۔

''تمہارے منہ سے زندگی میں ناشکری کے لفظ کبھی نہیں سنے میں نے..... یہ آج تم باتیں کر رہی ہو؟''

''اپنا اچھا وقت یاد آ رہا تھا۔ اس لیے شاید گرمی زیادہ لگنے لگی ہے۔'' طنزیہ انداز میں ہوئے وہ پانی پینے چل پڑی۔ طارق اسے دیکھتا رہا۔

''اسی لیے کہتا ہوں وہاں نہ جایا کرو۔ جانا چھوڑ دو گی تو سب کچھ خود ہی بھول جاؤ گی طارق کی نصیحت پر صباحت کے اندر چنگاریاں بھڑکیں۔ اس کا دل چاہا چلا چلا کر کہے، مہ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آخر کتنا صبر کروں۔ اگر میری قسمت میں یہی کچھ تھا تو مجھے میر رب نے ایسے گھر میں پیدا ہی کیوں کیا تھا پھر اپنی سوچ پر اسے خود ہی شرمندگی نے آن گھیرا۔ وہ صحن میں بیٹھ گئی اور ٹھنڈے پانی سے اپنے اندر کی آگ بجھانے لگی۔

''تمہیں بھی لالچ نے آن گھیرا ہے صباحت۔ صنم کی طرح تمہیں بھی ہاتھ پھیلا لینے چاہئیں۔ اتار پھینکو یہ بناوٹی خول.....'' صباحت نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ کس طرح سوچنے لگی ہے۔ اسے خود سے گھن آ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر بہنے لگے تھے۔

☆☆☆

''چچا میاں کو نیک کام کر کے تشہیر کرنے کی بہت عادت ہے اور مجھے ان کی یہ عادت کبھی اچھی نہیں لگتی۔'' اگلے روز صبح، صبح عدینہ، صفیہ کے سر میں روغن بادام کی مالش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ صفیہ گہرا سانس کھینچ کر رہ گئیں۔

''ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اچھا نہیں ہوتا، عدینہ۔'' صفیہ نے بیٹی کو ڈپٹ دیا لیکن وہ اپنی لون میں ہی تھی۔

''اصل میں چچا میاں ہمیں بیٹیاں تو کہتے ہیں مگر سمجھتے صرف بیلا کو ہی ہیں۔ پرسوں بیلا نے میرے سامنے ہزار روپے کا ایزی لوڈ منٹوں میں اڑا ڈالا اور اس کا یہ روز کا معمول ہے۔ اتنی دستیاں پال رکھی ہیں اس نے مگر میرے اوپر آپ کی سختیاں ہیں کہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ خرچے بڑھ جائیں گے۔ موبائل نہیں لے کر دوں گی۔ پی ٹی سی ایل ہے ناں وغیرہ وغیرہ۔ بیلا کے مزے ہیں۔ جب مرضی جتنی مرضی شاپنگ کر لیتی ہے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہوتا۔ اکلوتی ہے ناں اس لیے..... میں خوامخواہ پس کر رہ گئی۔ ایک تو عدیل کی شاہ خرچیاں دوسرے بڑی بہنوں کے مسائل..... میرے تو دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔''

''جتنا یہاں صبر اور قناعت سے وقت گزارو گی سسرال میں اتنی ہی راحت پاؤ گی۔''

''جی ہاں، باقی قناعت اور صبر کرنے والیوں کی راحت میں اچھی طرح دیکھ رہی ہوں۔'' وہ چٹیا بنا چکی تھی اب کنگھی سے بال نکالنے لگی تھی۔ صفیہ لاجواب سی ہو گئیں پھر توقف سے بولیں۔

''عدینہ ہر بات میں بحث نہ کیا کرو۔ عادت پڑ جاتی ہے اور یہ اچھی عادت نہیں ہوتی۔'' عدینہ ہنس پڑی۔

''امی اگر آپ مجھے صبر کرنا سکھانا چاہتی ہیں تو یہ بات نہ بھولیں آپ کی ساری بیٹیاں صابر ہیں۔ ہر صبر کرنے والے کو میٹھا پھل نہیں ملتا۔ اب زمانہ الٹا چل رہا ہے۔'' وہ ماں کے سر پر پٹارکھ کر کھڑی ہو گئی۔

''ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا..... نہ صبر سے ملتا ہے نہ شکر سے..... انسان کو اپنے نصیب سے ملتا ہے اور اپنے نصیب پر شکر کرنا ہی سب سے بڑی قناعت ہے۔''

''یعنی آپ مجھے ایسے ہی نصیب کے لیے تیار کر رہی ہیں۔'' اس کا اشارہ اپنی بڑی بہنوں

کی طرف تھا۔

''تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو عدینہ؟ میرا دل دکھتا ہے۔ میں تو ان کا بھی اچھا ہی چاہتی تھی اور تمہارا بھی...... مگر بیٹیوں کے نصیب کے آگے ہر ماں لاچار ہے۔ تم مجھے اپنی چاروں بہنوں کا مجرم سمجھتی ہو۔ میں نے جان بوجھ کر تو ان کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ ان کی قسمت تھی۔ ایسا ہوتا چلا گیا ہے۔ تو کیا میں انہیں بیاہ دینے کے بعد یہاں بٹھا لیتی...... بولو جواب دو۔'' عدینہ لاجواب سی ہو گئی۔ اتنے میں میر علی کھنکھار کر گھر میں داخل ہوئے تو عدینہ کے لب سل گئے۔ وہ چچا میاں کو سلام کر کے کچن میں آ گئی اور ان کے لیے چائے بنانے لگی۔ شاید وہ لوگ کوئی اہم بات کرنا چاہ رہے تھے۔ اس لیے اندر کمرے میں چلے گئے۔

''بھابی جی...... میں یہ فتویٰ لے آیا ہوں۔ صنم بیٹی کے پاس نہ گھر اپنا ہے اور نہ ہی کاروبار نہ ہی زیور اور نہ قیمتی اشیاء۔ مکرم کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے اور یہ چیز ہم کو کھلتی ہے ہم لوگ لاکھوں روپے کی زکوٰۃ ہر سال باہر بھی تو دیتے ہیں، کیوں نہ اپنے گھر میں دیں جو...ری بچیوں کا بھلا ہو۔ مولانا نے کہا ہے کہ قرضہ حسنہ کے طور پر میں اپنی بھتیجیوں کو یہ رقم دے سکتا ہوں۔ ہر ماہ معقول رقم دیتا رہوں گا۔ سال میں زکوٰۃ کا حساب برابر ہو جائے گا۔ حالات صباحت کے بھی صحیح نہیں ہیں۔ وہ لاکھ چھپا لے مگر ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے لیکن وہ ذرا خوددار ہے شاید مجھ سے برا مان لے لیکن آپ اپنے تئیں دیں گی تو اس کا بھرم بھی رہے گا اور وہ محسوس بھی نہیں کرے گی۔ ہر ماہ یہ رقم دے دیا کریں۔ اسی طرح صنم کو بھی ہر ماہ پہنچتی رہے گی۔ کم از کم ان کے روزمرہ کے تو مسائل حل ہوں گے۔ بچوں کا مستقبل تو بنے گا۔ بچے جب بالغ ہو جائیں گے پھر کچھ اور سوچ لیں گے۔ میں نے سال کا حساب لگا لیا ہے پھر ماشاء اللہ میری بیوی کا زیور ہی اتنا ہے کہ اس کی زکوٰۃ ٹھیک ٹھاک بن جاتی ہے پھر عادل کی بیوی کا بھی ٹھیک ٹھاک زیور ہے۔ عادل کی تو ہم نے اتنی بری چڑھائی تھی کہ شاید ہی خاندان میں کسی نے چڑھائی ہو یا چڑھا سکے۔'' یہ کہتے ہوئے میر علی کی آنکھوں میں تمکنت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

''کیا ضرورت ہے زیور کی زکوٰۃ بھی باہر دی جائے۔ اللہ کا فرمان بھی ہے پہلے اپنا قریب میں دیکھو پھر آس پڑوس میں اور پھر دور دراز۔'' میر علی کی بات پہ صفیہ کا دل بوجھل سا ہو گیا آنکھیں بھر آئیں۔

''تم نے میری بچیوں کے لیے نیکی کا راستہ نکالا ہے۔ خدا تمہیں اس کا بہتر صلہ دے گا۔'' وہ آنسو صاف کر رہی تھیں۔

''کیا میں بھی...... اپنی بچیوں کی اس طرح مدد کر سکتی ہوں۔''

''نہیں...... اول تو آپ کے پاس اتنا وافر زیور نہیں ہے۔ چند ایک چیزیں ہیں۔ دوسرے مال اسباب بھی سب بھائی صاحب کے نام ہیں پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ماں، باپ اولاد کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے اور اولاد والدین کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی نہ ہی میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں باقی تمام رشتے دار ایک دوسرے کو قرضہ حسنہ کے طور پر اس عمل کو ادا کر سکتے ہیں۔ میں خوب اچھی طرح سے تفصیل معلوم کر کے آیا ہوں۔ میرا دل مطمئن ہے یہ رقم دے کر جا رہا ہوں۔ صنم کو بلا لیجئے گا وہ آ کر لے جائے گی۔'' عدینہ نے یہ ساری گفتگو سنی تو جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ رات چچا میاں کے لیے عزت و بلندی کا جو مقام بنا تھا سب ڈھیر ہو گیا۔ اس کے اندر غم و غصے کا جوار بھاٹا ٹھاٹھیں مارنے لگا...... اشتعال تھا کہ نکلنے کو بے تاب تھا۔

''کیسی شریعت ہے یہ...... باپ کی وراثت ہوتے ہوئے بیٹیاں زکوٰۃ کھائیں گی اور بیٹے، بھائی اس مال پر اپنا حق سمجھتے ہوئے عیاشیاں کریں گے۔ ان سے کوئی حساب لینے والا بھی نہیں ہوگا۔ بیٹیاں بنیادی ضرورتوں کو ترستی پھر رہیں۔ ارے احسان ہی کرنا ہے تو ان کا حق ادا کر کے کریں۔ خیرات و زکوٰۃ دے کر ان کے سر مزید کیوں جھکا رہے ہیں۔ یہ چچا میاں امی کو کیسا سبق پڑھا کر گئے ہیں اور امی کیا اتنی ناسمجھ ہیں کہ اس معاملے کی باریکی کو نہیں سمجھ سکتیں۔'' میر علی کے جانے کے بعد وہ ماں سے دوبدو ہو گئی۔ صفیہ کے رنگ اڑ گئے۔ انہوں نے گھبرا کر عدینہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''تمہیں میری قسم ہے عدینہ، تم یہ سب اپنی بہنوں کو نہیں بتاؤ گی۔ میر علی شرعی پہلو سے ٹھیک بات کر رہے ہیں۔''

''کیسے، کیسے ٹھیک ہے یہ سب۔ باپ کی وراثت ہونے کے باوجود کیسے لگ جائے گی زکوٰۃ انہیں...... مجھے بتائیں ذرا...... کون سے مولوی نے فتویٰ دیا ہے۔''

''مسئلے کی باریکی کو سمجھو عدینہ۔ تمام پہلو میر علی نے سامنے رکھے ہیں۔ صنم کو اتنا کچھ دیا جا چکا ہے کہ وہ حق دار ہی نہیں۔''

''واہ ای واہ...... خوب کہی آپ نے...... مانا کہ مکرم بھائی نکھٹو ہیں۔ مجھے آپ یہ بتائیں۔ کیا عادل کما کر کھا رہا ہے۔ صنم آپا پہ آپ لوگوں نے احسانات کی بارش کر دی تو اس سے وراثت کا حق اتر جائے گا تو پھر عادل کا حصہ کیسے رہ جاتا ہے ابو کی جائیداد اور کاروبار میں۔ وہ بھی اپنے حصے کا حق اڑا چکا ہے پھر وہ کیسے حق مانگنے کی باتیں کرتا ہے۔''

''جہیز بھی تو انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ ملے ہیں پھر برادری کا کھانا ہر ایک کا اپنے وقت میں عالیشان ہوا ہے۔'' صفیہ بیٹی کو کمزور دلیلوں سے قائل کر رہی تھیں مگر عدینہ پڑھی لکھی اور باشعور تھی۔

وہ ان کمزور دلیلوں سے قائل ہونے والی نہیں تھی۔

''جہیز کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں ہے امی...... اگر والدین بیٹی کو جہیز دیتے ہیں تو وہ صرف تحفہ کہلاتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا ہو اور چاہے کتنا ہی معمولی۔ وراثت کا حق باقی رہتا ہے۔ رہ گیا برادری کا کھانا۔ شریعت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم میں کہاں ہے بیٹی کا ولیمہ...... یہ تو آپ لوگ اپنی ناک اور شہرت کے لیے دیتے ہیں پھر اسے بیٹی کے حصے میں کیوں ڈالتے ہیں۔ آہ یہ برادری والے۔ بیٹیوں کے ولیمے کھاتے ہوئے یہ نہیں سوچتے جس کا ہم یہ رزق اڑا رہے ہیں کیا اس کی تقسیم پر ہم حق پر ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانا ٹھونسنے کے بعد پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھتے یہ لوگ کہ کس حال میں ہیں برادری کی بیٹیاں۔ فاقوں میں گزر بسر کر رہی ہیں یا شوہروں سے پٹ رہی ہیں۔ ثالث ہی بناتے ہیں ناں دونوں طرف سے برادری والوں کو کہاں گئے اب وہ ثالث جو صنم آپا کا بھلا سوچ لیں۔ مکرم بھائی کو سیدھا راستہ دکھا دیں۔''

''ہم نہیں چاہتے کہ ہماری بیٹیوں کے مسائل برادری میں پھیلیں۔ ہم اتنے گئے گزرے لوگ نہیں ہیں کہ ہمای بیٹیاں کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ بیاہی تو پشت پناہی بھی کریں گے اور اسی وجہ سے میر علی ہر دم مدد کر رہے ہیں۔ آخر ہمیں بھی اپنی عزت عزیز ہے۔'' صفیہ ڈپٹ کر بولیں۔

''صرف اپنی ہی عزت عزیز ہے...... ہے ناں......'' عدینہ نے غم و غصے سے ماں کی طرف دیکھا۔ صفیہ چپ سی ہو گئیں پھر ذرا توقف سے بولیں۔

''دیکھو عدینہ، یہ جو تم بار بار وراثت کی بات کرتی ہو۔ ہمارے یہاں ایسا دستور نہیں ہے ساری عمر میکے والے بیٹیوں کی مان مریادا کرتے ہیں اگر بیٹیاں اپنا حق لے لیں گی تو ان کی مان مریادا کون کرے گا اور پھر...... ہم...... ہمیں دیکھو...... میں نے اور تمہاری خالہ نے اپنا حق اپنے بھائیوں کے حصے میں چھوڑ دیا تھا۔ بخوشی، با رضا اور اس پر تمہارے ابو نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے اور اسی میں بیٹیوں کی عزت ہے۔'' مگر عدینہ اس دلیل سے بھی مرعوب نہیں ہوئی۔ اس کے پاس ہر بات کا معقول جواب تھا۔

''نانا ابا غریب آدمی تھے۔ ان کی ملکیت میں ایک چھوٹا سا مکان تھا اور نیچے ایک دکان۔ خالہ اور آپ امیر گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں اگر آپ دونوں نے اپنے غریب بھائیوں پر احسان کیا اپنا حق چھوڑ کر تو آپ نے اپنے بھائیوں کی ایک طرح سے جائز مدد کی۔ آج بھی وہ لوگ غربت کا شکار ہیں۔ آپ بڑی بہن ہونے کے ناطے ان کی اور بھی مدد کر سکتی ہیں۔ اسلام صلۂ رحمی کو سب سے افضل قرار دیتا ہے اور وہ اللہ کا بہترین دوست بھی ہے مگر یہ کیا بھائیوں کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے اپنا حق نہ لینا اور اس طرح سے بیٹیوں کی مدد کرنا۔ نہیں امی، نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی!

زندہ ہیں۔ ابو کو اللہ تعالیٰ نے مہلت نہیں دی۔ اللہ تبارک ان کی مغفرت فرمائے...... مگر یہ سوچیں ان فیصلوں پر اگر ابو کو اس چیز کی جواب دہی کرنا پڑی تو کیا ہوگا؟ لاکھوں روپے جو مسجد اور مدرسوں میں لگائے جا رہے ہیں بے مایہ ہو جائیں گے۔ آپ کیوں نہیں سمجھتیں امی...... کیوں نہیں، نوافل ادا کر لینے سے فرض کا قرض نہیں اترتا۔ صدقہ دینے سے زکوٰۃ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ جب تک ہم قرض ادا نہیں کریں گے ہماری خیرات بھی قبول نہیں ہوگی۔'' یہ کہہ کر عدینہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد پھر وہ کبھی نہیں روئی چپ چاپ اہلِ تماشا بن گئی مگر صفیہ کی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام ہو گیا۔ وقت جیسے تیسے سرک سرک کر گزر رہا تھا۔ بالآخر قوتِ الٰہی نے صفیہ کو حق بات کہنے پر مجبور کر دیا۔

''میر علی میں نے ایک فیصلہ کیا ہے اور شاید زندگی میں، میں نے پہلی بار کوئی فیصلہ کیا ہے۔ عدیل بار بار اپنا حق مانگنے کی باتیں کرتا ہے۔ کیا اپنے باپ کی جائیداد میں عدیل ہی حصے دار ہے۔ تمہارے بھائی کی بیوہ ہونے کے ناطے میرا کچھ بھی نہیں ہے۔'' صفیہ کے سوال پر میر علی سراسیمہ ہو گئے پھر پہلو بدل کر بولے۔

''کیوں نہیں، بھائی صاحب نے کچھ بھی آپ کے نام نہیں کیا ہو مگر جو کچھ ہے اس میں حق دار آپ بھی ہیں۔'' میر علی نے بدقت الفاظ ادا کیے تھے تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

''میں اپنے حصے کو اپنی بیٹیوں کے نام کرنا چاہتی ہوں۔''

''بھابی جی، میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا...... یا عدیل کے رویے سے دل برداشتہ ہو رہی ہیں۔'' صفیہ نے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھ لیے اور دل گرفتہ انداز میں بولی۔

''نہ مجھے تم پر بداعتمادی ہے نہ عدیل کے رویے سے دلبرداشتہ ہوں۔ انسان دنیا میں آنے کے لیے آتا ہے۔ تمہارے بھائی صاحب اتنا کچھ بنا کر گئے مگر گئے خالی ہاتھ اور سبھی نے خالی ہاتھ سبھی کو جانا ہے پھر کیوں نہ انسان زندگی میں سکھ بانٹ کر جائے...... میں اس مال و اسباب کی وجہ سے بڑی سکھ سے گزار رہی ہوں۔ اس سکھ کو میں اپنی بچیوں میں بھی تقسیم کرنا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر صفیہ کھڑی ہو گئی تھیں۔

میر علی دم بخود سے بیٹھے رہے۔ ظاہر ہے ان کے پاس جرح و بحث کا جواز نہیں تھا اگر صفیہ شوہر کی وراثت کی بات کرتیں تو یقیناً میر علی کے جواب سن کر چپ ہو جاتیں۔ وہ ٹالنے کے لیے کئی پہلو نکال سکتے تھے۔ مگر اب میر علی کے پاس نہ کوئی سوال تھا اور نہ ہی جواب۔ بہت دیر تک

کمرے میں خاموشی رہی پھر میر علی خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔

''ٹھیک ہے، میں کاغذات تیار کرا لیتا ہوں۔ جس طرح آپ کی مرضی۔''

''سنو میر علی۔'' صفیہ نے پیچھے سے آواز دی۔ میر علی کے قدم رک گئے۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا صفیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''میرا یہ فیصلہ تمہارے پاس تب تک امانت ہے جب تک میرے جسم میں سانسیں ہیں۔ میں نہیں چاہتی میرا بیٹا مجھے بڑھاپے میں اس گھر سے نکال دے۔ یہ کہہ کر میں اپنا حق لے چکی ہوں۔ شاید بڑھاپے میں ماں، باپ ایسے فیصلے اس لیے نہیں کرتے کہ انہیں اپنی دربدری کا ڈر ہوتا ہے مگر پھر زندگی بھی تو مہلت نہیں دیتی اور سارے فیصلے ادھورے رہ جاتے ہیں مگر آج میں تمہیں یہ فیصلہ سونپ رہی ہوں۔ تم میری امانت کی پاسداری کرنا۔'' میر علی پلٹ کر صفیہ کے سامنے آ گئے۔ صفیہ کے آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے۔

''بیٹیوں کے غم نے آپ کو اندر سے بالکل کمزور کر دیا ہے پھر عدیل کی نادانیاں..... میں آپ کا غم سمجھ سکتا ہوں اور بانٹنے کی کوشش بھی کرتا ہوں مگر.....'' میر علی چپ ہوئے پھر کہنے لگے ''آج آپ اہم فیصلوں پر آ گئی ہیں تو میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہوا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس میں اب بالکل بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔'' ''میں عدینہ کو اپنے فراز سے بیاہنا چاہتا ہوں اور یہ خواہش میری تب سے ہے جب عدینہ اور فراز چھوٹے چھوٹے ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ آج آپ نے ان معاملات چھیڑے ہیں تو اس فیصلے پر بھی نظر ثانی کر لیجیے۔'' میر علی کی محبت پر صفیہ زار زار رونے لگیں

''تم نے زندگی بھر مجھ پر احسانات ہی کیے ہیں میر علی لیکن یہ احسان شاید سب سے بڑا ہے۔'' صفیہ ہچکیوں کے درمیان بولیں تو میر علی رنجیدہ سے ان کے سامنے آ گئے۔

''آپ مجھے شرمندہ نہ کریں اور بس شادی کی تیاریوں کا آغاز کریں۔ بہت دن ہو گئے مسائل سے جنگ لڑتے لڑتے دو دن خوشی کے گزاریں ہمارا بھی حق ہے۔'' میر علی نے مسکراتے ہوئے کہا تو صفیہ بھی آزردگی سے مسکرا دیں۔

☆☆☆

مایوں کے پیلے جوڑے میں عدینہ کا وجود سرسوں کی طرح مہک رہا تھا۔ گھر والے فراز کا ابٹن لے کر جا رہے تھے اس کے باوجود بیلا اس کے پاس تھی اور یہیں سے جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

''تم فراز کی اکلوتی بہن ہو پھر بھی عدینہ سے چپک کر بیٹھی ہو حالانکہ عدینہ کی تو بہنیں اور بھی ہیں۔'' تائی نے کہا تو بیلا کو بہت برا لگا۔

''میں عدینہ کی بہن نہیں، دوست بھی ہوں۔ یہ بات آپ لوگ بار بار کیوں بھول جاتے ہیں اور ویسے بھی فراز اتنا بورنگ اور سڑیل مزاج ہے کہ اس کی بہن بننے سے بہتر ہے میں ساری شادی عدینہ کی دوست بن کر ہی اٹینڈ کروں۔''

''حد ہوتی ہے، اپنے ہی بھائی کی برائیاں کرتے ہوئے تمہیں ذرا شرم نہیں آ رہی۔ دو دن کے بعد عدینہ اس کی زندگی میں شامل ہونے والی ہے۔ کیا، کیا خیالات نہ آئیں گے اس کے دل میں۔'' چھوٹی پھوپھو کی بیٹی نے کہا تو بیلا مچل کر بولی۔

''جو کچھ بھی ہے سامنے ہے۔ ابھی تو عدینہ کے پاس چانس ہے فیصلہ بدل لے۔'' بیلا کی بے باکی سب کو بری لگی جب کہ عدینہ چہرہ جھکا کر رہ گئی۔ وہ فراز کو اچھی طرح جانتی تھی۔ جس چیز کو بیلا سنجیدگی اور بورنگ کہہ رہی تھی وہ فراز کی ذمے دارانہ طبیعت تھی۔ فراز چچا میاں کے..... بیٹوں میں اکلوتا تھا اس لیے چچا میاں کا رائٹ ہینڈ بھی تھا۔

''عدینہ کو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیے کہ اسے اتنا اچھا ر ملا۔'' بڑی پھوپھو کی بیٹی کہہ رہی تھیں۔

''باقی رشتے تو ماموں، ممانی نے بس ایسے ہی کیے تھے یا تو رشتہ عدیل کا ہوا تھا اور یا عدینہ کا ہونے جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ خیر خیریت سے انجام بخیر کرے۔''

شکیلہ آپا کی بات عدینہ کو بہت بری لگی تھی چونکہ اس وقت وہ بول نہیں سکتی تھی۔ سوچ سکتی تھی جب اس کے دل کو بری لگی ہے تو اس کی بہنوں کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

''میں اسی وقت کو روتی تھی۔ دولت کے اعتبار سے لوگ ہم میں تفریق نہ کریں گے..... لیکن یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ کیا حق پہنچتا تھا شکیلہ آپا کو آپ لوگوں پر تنقید کرنے کا۔'' رات کو وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے خود کو باز نہ رکھ سکی تھی۔

''کیوں جی جلاتی ہو عدینہ۔ اس بات میں کوئی شک بھی نہیں۔ تمہارا رشتہ ہم سب بہنوں کی نسبت بہت اچھی جگہ ہو رہا ہے اور سب سے بڑھ کر اپنوں میں۔ ہمارے یہاں بہوؤں کو سر پر بٹھا کر نہیں کیا جاتا ہے۔ واقعی عدینہ تمہاری قسمت ہم سب سے اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے تمہیں بھی ان مسائل سے دوچار نہ ہونا پڑے جن سے ہم گزر رہے ہیں۔'' ان سب نے باری باری پیار کیا تھا۔ صنم سب سے زیادہ دلگرفتہ اور مرجھائی ہوئی تھی۔ عدینہ کے دل میں پھانس سی چبھ گئی۔

عدینہ کافی عرصے سے محسوس کر رہی تھی۔ صنم بجھی بجھی اور دلگرفتہ ہی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی جیسے ہی شادی کی تیاریوں کا آغاز ہوا تھا۔ صنم آپا نے نہ صرف امی کا سنبھال رکھا تھا بلکہ چچا میاں اور چچی جان کی بھی حضوری کر رہی تھیں۔ ہزاروں بکھیڑے تھے جو صنم آپا کے ذمے پڑ گئے۔ بچوں کے ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ تھکن سے نڈھال صنم آپا،

چچی جان کو کبھی بھی انکار نہیں کر پاتیں پھر بھی چچی جان کا منہ صنم آپا سے چڑھا رہتا اور وہ صنم آپا دبا دبا سا محسوس کرتی رہتی۔ پھر ایسا ہی حال صباحت آپی کا تھا۔ چچی جان نے اپنے کپڑے بری کپڑے صباحت آپی سے سلوائے اور ایک روپیہ بھی ان کی ہتھیلی پر نہ رکھا تھا۔ گویا وہ مطمئن تھی میر علی اپنی بھتیجیوں کی ہر دم مدد کرتے رہے ہیں وہ مدد کیسی ہوتی ہے۔ کیا وہ اس بات سے واقف نہیں تھیں۔ کیا محنت کا صلہ بھی زکوٰۃ سے ادا ہو جائے گا۔ وہ سوچتی تو اس کی دماغ کی رگیں پھٹنے لگتیں بہت چاہتی کہ کچھ نہ سوچے مگر آنکھیں بند نہیں کر سکتی تھی وہ کیسے فراموش کر دیتی اس بات کو جب شادی کی تیاری شروع ہونے لگی تھی تو ایک دن صنم آپا چپ چاپ اس کے پاس آئیں۔ وہ شرمندہ شرمندہ سی تھیں مگر اپنی حاجت روائی سے انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کے نزدیک بیٹھ کر بولیں۔

''عدینہ ایک بات کہوں تم سے؟'' اس نے چونک کر ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔ بات کرتے ہوئے صنم کی زبان کپکپا رہی تھی۔

''تم تو سب حالات سے واقف ہو۔ چچا میاں ماہانہ پندرہ ہزار روپے دے رہے چھ ہزار کرائے میں چلے جاتے ہیں باقی رقم، بجلی، گیس روزمرہ کے کھانے پینے بچوں کی تعلیم اخراجات پھر سب سے بڑھ کر دکھ درد میں خرچ ہو جاتے ہیں پھر بھی بہت کوشش کر کے بچوں کی گرم سردی کا انتظام کر دیتی ہوں لیکن شادی بیاہ کے کپڑوں پہ تمہیں پتا ہے کتنا خرچ آتا ہے۔ بچیوں چمک دمک کے کپڑے بنوانا اتنا آسان نہیں ہے۔ تمہارے اتنے اچھے، اچھے کپڑے ہیں تم کام والی بھی تو دو گی۔ ثمرہ اور نمرہ کو دے دو۔ اچھے خاصے قد نکل رہے ہیں ان کے۔ کچھ کانٹ چھانٹ کر بنا دوں گی۔ گزارہ ہو جائے گا پھر دونوں چھوٹیوں کا بھی۔ غرارے شرارے بن جائیں گی۔'' صنم آواز گویا حلق سے پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔ بہن کی فریاد پہ عدینہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ صنم کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔

''چچا میاں کا احسان ہے میرے بھوکے مرتے بچوں پہ سرپرستی کی ہوئی ہے لیکن مانگوں میرا منہ نہیں پڑتا۔'' عدینہ چپ چاپ اٹھی اور ساری الماری کھول دی۔

''آپ کہیں تو سارے کپڑے اٹیچی میں رکھ دیتی ہوں۔ کسی کو پتا بھی نہیں لگے گا۔ آ ٹیلر کو دینے جا رہی ہیں یا......'' صنم بہن کی پردہ پوشی پر قائل ہی ہو گئی اور ممنون سی اس کی طرف لگی۔ عدینہ احتیاط سے کپڑے رکھ رہی تھی جو بہت قیمتی اور فیشن کے کپڑے تھے۔ صنم کی بچ ساری شادی ٹھاٹ سے گزر سکتی تھی۔ وہ صنم آپا کے چہرے پر آئی خفت نہیں بھول سکتی تھی جو آپا جاتے وقت ان کے چہرے پر تھی۔ عدینہ نے تھک کر سر تکیے پر گرا لیا۔ ابھی ابھی بیلا اپنی دوست ہمراہ اس کے ہاتھوں، پیروں پر مہندی لگوا کر گئی تھی۔ وہ بستر پر خالی دماغ لیٹی تھی۔ اتنی الجھ

ن میں کہ ایک بار بھی فراز کا کوئی خوش گماں سایہ بھی نہیں گزرا تھا۔ ای کی تنہائی کی فکر...... بہنوں کی م مائیگی کی فکر...... عدیل کی بے اعتنائیوں اور بے پروائیوں کی فکر...... کتنی فکریں تھیں اس کے واں وجود پہ کہ وہ روز بروز نڈھال ہی ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ کل اس کی بارات آنی ہے اور وہ بالکل بھی خوش نہیں ہے اگر وہ صرف اپنی ذاتی خوشی دیکھتی تو مستقبل میں اس کے آنگن میں سودگی اور خوشیاں ہی خوشیاں تھیں مگر ناانصافیاں، غلط فیصلے، حقارت جو اس کی بہنوں کے حصے میں رہی تھی وہ کسی بھی چیز کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ مستزاد اس پر یہ جان لیوا گھڑی۔

''ای...... آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟'' صفیہ کے منہ سے ساری کتھا رس سن کر وہ دم بخود رہ گئی۔ وہ چاروں بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ عدینہ نے باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔

''کیا...... آپ سب بھی...... ایسا کر چکی ہیں۔''

اس نے لرزتی زبان سے بہنوں سے پوچھا۔ ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں جبڑے لٹکے ہوئے تھے جب کہ صفیہ نے کہا۔

''تب اس بات کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حالات کچھ اور ہیں اب میں اپنا حصہ لے لی ہوں وہ میں نے اپنی پانچوں بیٹیوں میں برابر تقسیم کر دیا ہے اس کے باوجود عدینہ کا سارا جہیز ہر علی نے خود بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چاروں بڑی بہنوں کے لیے بھی مختلف تحائف رکھے ہیں اک لوگ یہ نہ کہیں کہ میر علی نے اپنا گھر بھر لیا اور بڑی بھتیجیوں کا نہ سوچا پھر برادری کا عالیشان کھانا ی ہے۔ یہ سب میر علی اپنے پاس سے کر رہے ہیں۔ میں میر علی کے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی الانکہ اب میرا اس پر کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے ابو کی جائیداد میں اب کوئی حصہ ہے مرا...... تمام عمر میر علی نے محنت کی اور ذرا سے پودے کو تناور درخت بنایا۔ عدیل کے نام جو کچھ بھی ہے وہ جب چاہے لے سکتا ہے۔ تمہارے ابو فوت ہو چکے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ن کے درجات بلند ہوں اور وہ کسی پکڑ میں نہ آئیں۔ اس لیے میں تم سب سے گزارش کر رہی ہوں کہ تم اپنے ابو کی جائیداد میں سے اپنا، اپنا حق معاف کر دو تاکہ ان کی آخرت اور آسان ہو جائے'' یہ تے کہتے صفیہ رو پڑی تھیں۔ وہ چاروں بھی آبدیدہ ہو گئیں لیکن عدینہ جیسے پتھرا سی گئی تھی۔

''ای، ہم تو وہ بھی نہیں لینا چاہتے تھے جو آپ نے دیا ہے۔'' ارم اور مدیحہ رو رہی تھیں۔ ارم آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''لیکن ہم میں سے کچھ بہنیں معاشی طور پر اتنی کمزور ہیں کہ ان کے لیے یہ ضروری بھی'' صنم اور صباحت بھی رو رہی تھیں۔

''ہم نے پہلے بھی اپنے ابو کو معاف کیا ہوا تھا اور اب بھی معاف کر رہے ہیں۔'' وہ

چاروں ہی آبدیدہ تھیں پھر وہ عدینہ کی طرف دیکھنے لگیں جس کی آنکھوں میں نہ آنسو تھے اور نہ ہی کوئی غم وفکر جیسے ساکت سی ہو گئی تھی۔

"تم بھی عدینہ اپنا حق معاف کر دو، ای کے دل سے بوجھ اتر جائے گا۔" مگر عدینہ کے دماغ میں عدیل کے لفظ سائیں سائیں ہو رہے تھے جو کل رات اس نے سنے تھے۔

"تو گویا آپ نے انتہائی فیصلے کر ہی لیے...... چلو میرے لیے تو آسان ہی ہوا۔ اب ممی چچا میاں سے اپنا حصہ آسانی سے وصول کر لوں گا۔" اس حصے میں ہمارا بھی حق ہے عدیل۔ وہ چلا کر کہہ دینا چاہتی تھی مگر نہ جانے کیوں اس کے لب سل گئے تھے۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی تھی۔

گھر میں کل رات سے اور اب تک جو بے چینی پھیل رہی تھی اس کے سامنے آ گئی تھی۔

"تو گویا ای نے ہم بیٹیوں کے لیے قربانی دے ہی دی۔ مگر لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ بس اتنا معمولی سا حصہ ملا انہیں اپنے ماں، باپ کی وراثت میں سے۔ اس سے بہتر ہونے سے نہ ہونا تھا۔ مگر یہ لوگ تو اس پر بھی شاکر ہیں۔" عدینہ نے سوچوں سے نڈھال ہو کر آنکھیں موند لیں پھر عدیل کا چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔

"میں اپنے باپ کی جائیداد کا اکلوتا وارث ہوں۔ سیاہ کروں یا سفید...... کوئی کون ہوتا ہے مجھ سے حساب کتاب کرنے والا۔ کل رات وہ ماں پہ بھی غرایا تھا۔ عدینہ کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔

"چچا میاں جو احسان کر رہے ہیں وہ اس لیے کہ برادری میں ان کی پگڑی اونچی ہو اور بیلا کے رشتوں کی لائن لگ جائے۔ ای سب کچھ جانتی ہیں اس کے باوجود احسان مند ہو رہی ہیں۔" اس کی آنکھیں بند تھیں مگر ان کے کناروں سے آنسو نکلنے لگے تھے۔

"کہو عدینہ تم اپنا حق معاف کر رہی ہو تا کہ روزِ قیامت ہم والدین تمہارے لین دین سے پاک ہوں۔" صفیہ روتے ہوئے بیٹی کو مجبور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ عدینہ کے اعصاب کھنچنے لگے۔ اسے ماں کے لفظوں سے تکلیف ہو رہی تھی۔

"آخرت میں آسانیوں کی سب کو فکر ہوتی ہے اس کے باوجود ہم دنیا میں آسانیاں نہیں بانٹ سکتے۔" اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ "ہے ناں ای......؟" پھر گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ "ای...... میں اپنا حق معاف نہیں کروں گی۔" عدینہ کے لفظ تھے یا سنگ۔ صفیہ نے ہول کر دل تھام لیا۔ وہ چاروں بھی ششدر رہ گئیں۔

"آپ نے ہمارے لیے قربانی دی مگر پورے حق کے لیے تو آواز اٹھائیں۔ اس گھر کے دروازے ہمارے لیے بند تو ہونا ہی ہیں پھر ہم اپنا ادھورا حق کیوں لیں؟"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں عدینہ۔ اتنا لالچ کیوں آ گیا ہے تمہارے اندر...... تم تو سب

کے گھر میں جا رہی ہو اس مال و زر کی تو تمہیں قطعی ضرورت بھی نہیں پھر کیوں تم...... ایسی باتیں کر رہی ہو۔" صفیہ نے عدینہ کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ عدینہ بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

"مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے۔ میں کیسے کہوں کیسے سمجھاؤں۔" وہ بے آواز رو رہی تھی۔

"اگر ہم سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے مد میں کم از کم ایک سا رزق تو جائے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور بھبک کر رو پڑی۔

"یہ سب خداوند کے ہاتھ میں ہے۔" صفیہ نے دل سخت کر لیا۔

"اگر آپ خداوند کو مانتے ہیں تو اس کے احکام پر بھی چلیں۔ میرے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا۔ میں اپنا حق بالکل معاف نہیں کروں گی۔" یہ الفاظ تھے کہ تیر میر علی کے سینے میں جا گھسے جو وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ وہیں سے پلٹ گئے۔

"تمہیں ہوش ہے عدینہ تم کیا کرنے جا رہی ہو۔ تم ان لفظوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکتیں۔ خدا کے واسطے ان لفظوں کو واپس لے لو۔" صنم اسے سمجھا رہی تھی گو کہ صنم کی آنکھوں میں خود بھی آنسو تھے۔

"اگر ہمیں حق ہی لینا ہوتا تو طارق ہی اپنے بھائیوں سے اپنا حق لیتے جب ہمیں وہیں سے نہیں ملا تو ہم یہاں کیوں ذلیل و خوار ہوں۔" صباحت بہن کو شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"جن بیٹیوں نے وراثت کا مطالبہ کیا وہ نظروں سے گر جاتی ہیں۔ اپنے تو اپنے برادری بھی اسے اچھا نہیں سمجھتی۔" مدیحہ دبی دبی زبان میں بہن کو سمجھا رہی تھی۔

"کیا وراثت لے لینے سے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں؟" ارم کی زبان پر اپنے حالات کا شکوہ تھا۔

"ٹھیک ہے وراثتوں سے مسائل حل نہیں ہوتے تو پھر کوئی بھی مر جانے والوں کے حق پر قبضہ نہ کرے۔ سب برابری پر آ جائیں گے۔" وہ جیسے اپنے ارادے میں اٹل تھی۔

"ٹھیک نہیں کر رہی ہو عدینہ۔" صفیہ نے برہم نگاہوں سے بیٹی کی طرف دیکھا تھا۔ عدینہ رونے لگی تھی۔

"میں اپنا حق معاف نہیں کروں گی ای۔ ہاں مگر کسی سے مانگوں گی بھی نہیں اس کا جواب روزِ محشر پر چھوڑتی ہوں۔" اس نے تندہی سے اپنے گالوں پر آئے آنسو صاف کیے اور ان کے درمیان سے اٹھ گئی۔ اس کی جارحیت پر صفیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے جب کہ وہ چاروں دنگ ہی تو رہ گئی تھیں۔

دلہن بنی ہوئی وہ کانچ کی گڑیا لگ رہی تھی...... واقعی وہ کانچ کی گڑیا ہی تو تھی۔ بے حد حساس، درد مند دل رکھنے والی۔ اس نے اپنی ذات کو نشانہ بنا کر اپنی بہنوں کا بھلا سوچا تھا مگر اسے

ابھی تک یہ نہیں پتا تھا کہ اس کا یہ احساس اس کے لیے کتنا مہنگا پڑے گا۔ اس کے لیے مسائل کے ایسے در کھول دے گا جو نہ صنم کے ہوں گے نہ صباحت جیسے اور نہ ہی ارم اور مدیحہ جیسے۔ اس کے مسائل تو سب سے ہی انوکھے ہوں گے۔ پیسے کی ریل پیل کے باوجود بھی وہ گھٹن اور مسائل کا شکار ہوتی چلی جائے گی۔ غم وفکر سے نڈھال اس نے بابل کی دہلیز پار کی تھی۔

پیا کے آنگن میں کوئی سواگت بھی نہ تھا۔ چپ چاپ اسے ڈرائینگ روم میں لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ قریباً دو گھنٹے ہو گئے تھے کوئی اسے کمرے میں پہنچانے والا بھی نہیں تھا۔ نہ ہی اس کے قریب کوئی آ کر بیٹھا تھا۔ حتیٰ کہ بیلا بھی...... نہ جانے بیلا کو کیا ہو گیا تھا۔ صبح سے اس کے قریب ہی نہیں آئی تھی۔ ہو سکتا ہے مصروف ہو۔ دل میں کوئی بھی شکوہ لائے بغیر اس نے پہلو بدل کر سوچا تھا۔ بھاری بھرکم زیورات اسے بوجھل کر رہے تھے۔ اس مہنگائی میں بھی چچا میاں نے تقریباً پچاس تولے سونا دونوں طرف سے چڑھایا تھا۔

”سونا تو مدیحہ آپا کو بھی بہت چڑھایا تھا مگر آج ان کے پاس بری کی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ یہ دان بری کے زیورات صرف دکھاوے کے لیے ہوتے ہیں۔ جب چاہیں چھن جائیں۔“ وہ ان سوچوں میں گھرنے لگی تو خود کو دل ہی دل میں سرزنش کیا۔ ”یہ میں کیا سوچنے لگی ہوں۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے سب سے پہلے عزت پھر دولت، میں یہاں محبتیں نچھاور کروں گی تو تبھی مجھے عزت و مان دیں گے۔ مجھے ان مادی اشیاء کی ضرورت بھی نہیں ہے......“ مگر اسی لمحے اس کی سماعتوں نے کچھ سنا تھا۔

”فراز تم اوپر اپنے کمرے میں جا رہے ہو۔ پہلے میری بات سن لو پھر جانا۔“ میر علی کا لہجہ کیسا تھا اس کی ریڑھ کی ہڈی میں برف اتر گئی۔

”جتنا کیش تمہارے پاس ہے یہیں رکھ دو، چھٹیوں کے بعد آفس جاؤ تو اپنی امی سے لے جانا اور آج کے بعد کاروبار کی کوئی رقم تم اپنے کمرے میں نہیں لے کر جاؤ گے۔“ ان کے لہجے میں دنیا جہان کی سرد مہری تھی۔ فراز کے بولنے کی ذرا آواز نہ آئی۔

”یتیم سمجھ کر سرپرستی کی تھی ہم نے اس کی مگر ہمیں کیا پتا تھا کہ اس کی نیت میں کوٹ کوٹ کر لالچ بھرا ہوا ہے۔“ میر علی کی ناگواری اور نفرت نے عدینہ کو ہلا ڈالا اس کے وجود میں آندھیاں چلنے لگیں۔ ابھی وہ ان جھگڑوں سے خود کو نکال بھی نہ پائی تھی کہ چچی جان اس کے پاس آ گئیں۔

”رات کے دو بج رہے ہیں۔ تم بھی اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔“ اس نے حیرانی سے چچی کی طرف دیکھا۔ جہاں اجنبیت اور نفرت تھی۔ ”اور ہاں یہ سارا زیور یہیں اتار کر رکھ جانا۔“ یہ کہہ کر زیورات کے خالی ڈبے انہوں نے اس کے سامنے رکھ دیے۔ ظاہر ہے وہ یکایک تو ان کے حکم پر ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے تامل پر چچی جان بھڑک گئیں۔

”یہ زیورات تمہارے باپ کی وراثت سے نہیں بنے ہیں جس پر تم اپنا حق جتاؤ گی اِدھر سے ہے یا اُدھر سے ہے تو میرے شوہر اور بیٹوں کی کمائی۔“ پھر وہ پسر کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ”توبہ، توبہ ایسی اپنی فطرت۔ ہم نے کہیں نہیں دیکھی۔ نکاح ہی تو ہو رہا تھا تمہارا۔ تمہیں عاق تو نہیں کر رہے تھے جو تم نے وراثت کا مطالبہ کر دیا۔ میرے فراز پر تو کاروبار کی ساری ذمے داریاں ہیں اور وہ ذمے داریاں بس آج تک ہی تھیں۔ میں نے تو کہہ دیا ہے میر علی۔ کیش سارا اپنے پاس رکھا کریں آپ کی بھتیجی کی نیت بھی ٹھیک نہیں ہے ہمیں کیا پتا تھا کہ سنپولیا بیاہ کر لا رہے ہیں جو ہمیں ہی ڈس لے گا۔ وراثت میر علی دیں گے تو کیا تمہیں ہی دیتے باقی چار کو بھی تو دینا پڑے گی۔ اب تک ان کے ساتھ جو تعاون ہو رہا تھا لوگوں نے دیکھا تھا کیا۔ اب وراثت نہیں دیں گے تو لوگ کیا کہیں گے۔ اپنے ہی گھر میں اپنا مال رکھ لیا۔ ان باتوں کا کون جواب دے گا۔ ایسی زبان ہماری تو نہ نکلی تھی جیسی تمہاری سننے میں آئی ہے۔ اس کو بھی بھڑکا کر تم نے ہی حصہ مانگنے پر مجبور کیا ہوگا ورنہ اس عورت نے تو آج تک دیور پر اعتماد ہی کیا تھا۔ بھائی تو تمہارا کسی لائق ہوا نہیں۔ حق مانگنے تم اٹھ کھڑی ہوئیں۔“ چچی کے لفظ تھے کہ نشتر اس کا بدن تار تار ہو گیا۔ تکلیف کے احساس سے دوچار ہو کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ آنسو ٹپک کر جھولی میں گرنے لگے۔

”جس بیٹی نے اپنا جائز حق مانگا وہ ذلیل و خوار ہی ہوئی ہے۔“ چاروں بہنوں کی سرگوشیاں اردگرد بھٹک رہی تھیں۔ اسے کمزور اور پشیمان کرنے کے لیے لفظوں کی بازگشت تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔

”آئے دن اتنے قانون بنتے ہیں۔ کاش کوئی ایسا بھی قانون بن جائے جس کی بدولت عزت و وقار سے اس قوم کی بیٹیوں کو اپنے حقوق ملنے لگیں اور کوئی بھی بیٹی حق مانگ کر نظروں سے نہ گرے۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا اب اسے حوصلے سے اس وقت کو جھیلنا تھا کیونکہ وہ بنجر زمین پر بارش کا پہلا قطرہ بنی تھی۔ سوکھی اور ویران زمین کو سیراب کرنے کے لیے پہلے قطرے پر کیا گزرتی ہے وہ آج محسوس کر سکتی تھی۔ وہ دھرتی کے جلتے بدن میں کس طرح سماتا ہے اور اس جلن اور تکلیف کو کیسے جھیلتا ہے۔ وہ انہی کیفیات سے دوچار تھی۔

وہ بارش کا پہلا قطرہ ضرور بنی تھی مگر اسے امید تھی اب جو بارش ہوگی تو رج کر ہوگی۔ شعور کی آندھی چلی ہے تو یہ بارش ہرگز نہیں تھمے گی۔ ایک نہ ایک دن اس بنجر زمین پر انصاف اور حق کی لہلہاتی فصل ضرور اگے گی...... فراز کے بھی اس کے بارے میں ایسے خیالات ہوں گے لیکن وہ اسے اعتماد میں لے کر ہر بات سے آشنا کر دے گی وہ اپنے اعتماد کو ضرور بحال کرے گی۔ مگر اس میں وقت لگے گا۔ وہ جانتی تھی لیکن پُر امید تھی۔ اس لیے کہ وہ پُر حوصلہ لڑکی تھی۔

......✿......

رابطے اور رشتے

"زبیر اٹھو تمہارے پاپا کا فون آیا ہے۔"

"ان سے کہیں میں گھر پر نہیں ہوں۔"

"زبیر..... وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"یوں کہیں صرف لیکچر دینا چاہتے ہیں۔"

"زبیر! تم بدتمیزی کر رہے ہو، حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو....."

"کہہ میں فیل ہو گیا ہوں۔" وہ جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔

ربیعہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔ "کتنی شرمندگی ہو رہی ہے مجھے، تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہے۔" ربیعہ کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔

"کیا ہوا..... میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا اور قصور میرا نہیں، سراسر آپ لوگوں کا ہے۔ آخر: کیوں بنوں ڈاکٹر؟ صرف اس لیے کہ عمیر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، اس لیے اب مجھے بھی ڈاکٹر ہی پڑے گا۔"

"وہ تمہارا بھائی ہے زبیر!"

"یہی میری بدقسمتی ہے کہ وہ میرے ساتھ دنیا میں آیا، اگر ہماری ڈیٹ آف برتھ ایک. تو کیا ہماری قسمت بھی ایک سی ہوگی؟ کیا ہماری سوچ بھی ایک سی ہوگی؟ کیوں چاہتی ہیں آپ کہ جو کچھ کریں ایک سا کریں۔"

"میں یہ بحث نہیں کر رہی ہوں تم سے زبیر..... تمہیں اپنے مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔"

"آپ یہ فکر چھوڑ دیں، مجھے اپنے کیریر کی آپ سے زیادہ فکر ہے۔"

"اگر تمہیں فکر ہوتی تو تم یہ گل کھلاتے"

"پھر وہ مرغے کی ایک ٹانگ....."

"ہاں تو کیوں نہ ہو، پورے خاندان میں عمیر کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ اماں نے پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کرائی ہے اس کی خوشی میں۔ اگر تم بھی کامیاب ہو جاتے تو میرے لیے یہ خوشی دوگنی نہ ہوتی۔ تمہارے پاپا، عمیر کو اسپیشلائز کرانے کے لیے بیرون ملک بھیجیں گے۔ کتنا اچھا لگتا کہ تم دونوں ایک ساتھ جاتے۔"

"مائی فٹ! میں اس آسیب سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں اور کتنا اچھا ہوا قدرت کچھ عرصہ کے لیے ہی سہی مجھے عمیر کے بھوت سے نجات تو دے گی۔ جو آپ کے..... نانوں کے..... اور پورے ددھیال والوں کے سر پر چڑھا ہوا ہے۔"

"زبیر! تم مجھے بھی الزام دے رہے ہو، اپنی ماں کو..... جو تمہاری کمزوریوں پہ، غلطیوں پہ ڈھال بنی رہی ہے۔" ربیعہ کو خاصا رنج ہوا تھا۔ زبیر یکدم چپ سا ہو گیا۔

"اب اس رنج و ملال کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔" نانی جو نجانے کب سے ماں بیٹے کی گفتگو سن رہی تھیں، بیچ میں بول پڑیں۔

"اور یہ تم کیا خواب دیکھنے لگیں یہ اور عمیر کا خیال رکھتا؟ خوب کہی..... شکر کرو یہ یہیں رہ گیا۔ ورنہ..... دیار غیر میں بچے کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ میرا تو سوچ کر ہی کلیجہ کانپ اٹھا۔"

"ہاں میں تو جیسے جلاد ہوں اور وہ معصوم مینا..... ہاں نا، یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ۔ مگر بتا دوں آج تک آپ کے مشکل وقت میں، میں ہی کام آیا ہوں۔"

"ہاں تو تو جیسے دن رات خدمتیں کر رہا ہے۔ مانا کہ وہ کام کاج میں طاق نہیں ہے، پر اس نے کبھی ستایا بھی نہیں۔"

"کیا بحث لے کر بیٹھ گئی ہیں اماں آپ بھی....." ربیعہ کو اماں کی اس کشاش سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

"اری تو چپ کر..... تو نے ہی سر چڑھا رکھا ہے اسے..... رہتا نا اپنے چاچاؤں کے زیر سایہ تو عقل ٹھکانے آ جاتی اس کی۔" یہ زبیر کی دکھتی رگ تھی۔

مگر وہ زبیر ہی کیا جو نانی کو دو بدو جواب نہ دیتا۔

"شکر ادا کریں نانی! ماما کی وجہ سے آپ کی تنہائی ختم ہو گئی، ورنہ آپ اس گھر میں تنہا پھرا کرتیں، تب سوجھتیں کیا ہوتا۔"

"زبیر......! بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

یہ نانی کی دکھتی رگ تھی، فوراً ہی ان کا منہ لٹک گیا۔ اس سے قبل ربیعہ، ماں کا دفاع کرتی اماں خود ہی چمک کر بولیں۔

"میں نے ربیعہ کی نہیں، صرف تمہاری بات کی ہے۔"

"اور اب آ لینے دو تمہارے باپ کا فون۔ کہوں گی اس زبیر بلکہ زلزلے آندھی طوفان کو اپنی اماں اور بھائیوں کے سر مونڈھو۔" زبیر ہنستا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"یہ موا بچپن سے ہی جلتا ہے میرے عمیر سے۔"

ماں کی بات پہ ربیعہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"اے بی بی! سر پکڑ کر بیٹھنے سے بات نہیں بنے گی، یہ کچھ کرنے کا وقت ہے۔ جب تک تھا بہت سنبھالا، اب تو بے نتھا بیل بن گیا ہے۔ ہم دو عورتیں کہاں ماری ماری پھریں گی اس کے پیچھے"

"اماں! اب بس بھی کریں، آپ کی ان ہی باتوں کی وجہ سے اس کا ذہن خراب ہو رہا ہے۔"

"تو کیا ابھی تک وہ بچہ ہے، جو ان باتوں سے اسکا ذہن خراب ہوتا رہے گا۔ میں تو صاف صاف منہ پہ کہتی ہوں، جلتا ہے وہ عمیر سے۔ عمیر جیسا لائق فائق بچہ پورے خاندان میں نہیں ہے۔" اماں، عمیر کی تعریفوں میں رطب اللسان ہو گئیں۔

"اصل میں یہ خرابی آپ لوگوں کی ہی ڈالی ہوئی ہے جسے اب کوئی سمجھنا نہیں چاہتا۔"

ربیعہ نے تاسف سے ماں کی طرف دیکھا اور کچن کی طرف پلٹ گئی۔

☆☆☆

ڈور بیل بجنے کے ساتھ ہی دروازے پہ دھڑ دھڑ شروع ہو گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی زبیر اور عمیر کی اسکول سے آمد تھی۔ حسب معمول بکتے جھکتے نانی نے دروازہ کھولا۔ دونوں گتھم گتھا تھے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون کسے مار رہا ہے مگر یہ نانی ہی تھیں جو فوراً جان لیتی تھیں۔ زبیر عمیر کو مار رہا ہے۔

"ارے کم بخت! چھوڑ، کیا بچے کی جان لے گا؟"

عمیر کی گردن پر زبیر کا ہاتھ دیکھ کر نانی بلبلا اٹھیں۔

"پہلے اسے کہیں کہ میرا گریبان چھوڑے۔" زبیر چلایا۔

"کم بخت! اس نے تو صرف گریبان پکڑ رکھا ہے اور تو نے اس کی شاہ رگ دبا رکھی ہے۔"

"میں کہتی ہوں چھوڑتا ہے بچے کی گردن یا لگاؤں۔" یہ کہتے کہتے ہی نانی نے تین زبیر کی کمر پہ جڑ دیے۔ زبیر کو اتنا غصہ چڑھا، اس نے عمیر کو زمین میں پٹخ کر گھونسوں کی بارش کر دی

نانی چلانے لگیں۔

"ربیعہ...... او ربیعہ! ذرا دیکھ تو آ کر......" ربیعہ چھت پہ کپڑے ڈالنے گئی تھی، ماں کی آوازوں پہ دوڑتی آئی۔ اماں بری طرح ہانپ رہی تھیں۔

زبیر اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور عمیر کی جیب سے پیسے نکالتے ہی اس کے اوپر سے ہٹ گیا۔

عمیر پیسے چھن جانے پہ بھاں بھاں کر کے رونے لگا اور زبیر تو دو گیارہ ہو گیا۔ ربیعہ کو عمیر کے چلانے پہ اتنا غصہ آیا کہ ایک تھپڑ اسے جڑ دیا۔

"کوئی بھی معصوم نہیں ہے ان میں سے، دیکھ لیا ہے میں نے اچھی طرح سے۔ ساری شرٹ کے بٹن توڑ ڈالے ہیں اس نے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے ربیعہ زبیر کو آوازیں دینے لگی۔ نانی عمیر کو چپ کرانے لگیں۔ جو رو رو کر اپنی امیر حمزہ سنا رہا تھا۔

"اگر میں اسے نہ ڈپٹوں، نہ ماروں تب آپ یہ بات کہیں بھی۔" مگر ربیعہ غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔

"وہ تمہارے ہاتھ آئے گا تو سدھارو گی نا اسے۔" اماں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا اور عمیر کو کلیجے سے لگائے لگائے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ ربیعہ کو بے حد غصہ آ گیا۔ اسی وقت زبیر سامنے آ جاتا تو اس کی اچھی طرح سے چٹنی بنا دیتی۔ تب اماں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی مگر یہ کیا...... سارے گھر میں چکرا گئی اور زبیر کہیں نظر نہ آیا، تب وہ غصے میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر گئی کیا دیکھتی ہے، یونیفارم میں ملبوس پسینے میں شرابور، لال بھبھوکا چہرہ لیے موصوف پتنگ اڑانے میں مگن ہیں۔

"زبیر......!" ربیعہ حلق کے بل چلائی۔

"نیچے اترتے ہو یا اوپر آؤں۔" زبیر نے ماں کو اتنے غصے میں دیکھا تو ڈر گیا۔

"زبیر...... نیچے اترو۔"

ڈور پتنگ چھوڑ کر جو زبیر نے چھلانگ لگائی تو دیوار میں بازو ٹکرانے سے ساری کہنی چھل گئی جس میں سے خون بھی رسنے لگا تھا۔

غصہ تو ربیعہ کو اتنا تھا کہ اسے یہیں ادھ موا کر دے مگر اس کی حالت دیکھ کر تاسف سے ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔

وہ نہا کر نکلا تو ربیعہ نے زخمی کہنی پہ اسپرٹ لگائی پھر اسے بنا کچھ کہے کھانے کی میز پہ لے گئی، جہاں کھانا جانے کب سے ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

وہ بے دلی سے کھانا کھانے لگا۔ ربیعہ کو پتا تھا اگر وہ سامنے بیٹھی نہ ہو تو وہ ایک لقمہ بھی نہ کھائے۔ ابھی اس نے دو نوالے ہی زہر مار کیے تھے کہ عمیر اور نانی کی آوازوں پہ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

نانی پرجوش انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ پانچوں پارہ ختم ہو رہا ہے میرے بچے کا، بس جلدی سے قرآن پاک ختم لے پھر دیکھنا کیسا فنکشن کروں گی۔ سارے خاندان اور محلے میں دھوم مچ جائے گی۔"

"نانی..... قاری صاحب..... روزانہ زبیر کو سزا میں کھڑا کرتے ہیں مگر اتنا ڈھیٹ ہے، سے پھر بھی سبق یاد نہیں کرتا۔ وہی پہلے سپارے پہ اٹکا ہوا تھا۔"

"ارے میرے بچے، میں تجھے کون سا خود سبق یاد کراتی ہوں۔ تجھے شوق ہے تو تو سپارہ لے کر دونوں ٹائم خود آ جاتا ہے یاد کرنے۔ ماشاء اللہ ساری نماز آ گئی ہے تمہیں۔" عمیر نانی کی باتوں پہ مسکرانے لگا۔

زبیر نے غصے میں نوالہ چھوڑا اور کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ لگتا تھا گھمسان کی جنگ شروع ہو گی مگر ربیعہ ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

"زبیر! چپ چاپ کھانا ختم کرو۔"

"اسے روک لیں، وہ میری باتیں کیوں بتاتا ہے۔" وہ غرور بھرے لہجے میں کہتے ہو۔ واپس بیٹھ گیا۔

"وہ صحیح کہہ رہا ہے، تم اگر خود کو سدھارو..... تو وہ کیوں تمہاری برائیاں کرے۔"

اس وقت ربیعہ اسے نوالہ بنا کر خود دے رہی تھی، چونکہ وہ پلیٹ صاف کرنے کی ترغیب دے رہی تھی مگر نانی نے یہی سمجھا کہ باوجود بدتمیزیوں کے ان کی بیٹی اولاد کے ناز نخروں میں کوئی نہیں چھوڑ رہی۔

زبیر، نانی کی بات پہ جل بھن گیا اور شرارے کی طرح بکھر کر منٹ کی چوتھائی میں عمیر سر پر پہنچ گیا۔ عمیر سر پر ٹوپی جمائے سپارہ سینے سے لگائے کمرے سے نکل رہا تھا۔

زبیر کے جارحانہ تیور دیکھ کر سمجھ گیا۔ اس سے پہلے کہ زبیر کچھ کرتا، عمیر نے آؤ دیکھا نہ اور زور کا دھکا جو اسے دیا، وہ دروازے سے ٹکرایا اور پھٹی ہوئی کہنی دوبارہ دروازہ سے لگی تو زبیر کو درد ہوا اور اس مزید کھال چھل کر خون بہنے لگا۔ اسی لمحے کو غنیمت جان کر عمیر نے دوڑ لگائی اور یہ جا وہ جا۔

زبیر کو تکلیف اتنی گہری تھی کہ وہیں بیٹھ کر رونے لگا۔ نانی کو شک گزرا کہیں عمیر نہ دیکھ کر دل کو ڈھارس بندی۔ ربیعہ جھنجلاتے ہوئے اس کے زخم پہ ڈیٹول لگانے لگی۔ ساتھ ساتھ اسے

ڈپٹ بھی رہی تھی۔

"اب نظر نہیں آئے گا نانی کو، ہمیشہ میں ہی مارتا ہوں اسے۔" وہ روتے ہوئے دہائیاں دے رہا تھا۔ نانی کان پہ سے مکھی اڑا کر آگے بڑھ گئیں۔

"یہ چوٹ تمہیں پہلے کی لگی ہوئی ہے، کس نے کہا تھا تمہیں کہ اس سے لڑنے چلو۔ زخم تو تمہیں ہی آنا تھا نا۔"

"ہاں آپ بھی اس کی حمایت کریں، سب کا لاڈلا وہ ہے۔" وہ رو رو کر کہہ رہا تھا اور یہی کہتے کہتے وہ جوان ہوا تھا۔"

☆☆☆

"ناصر کی بیٹی بہت پیاری ہے، بالکل سیدھی اور اٹھول۔ منہ میں تو مانو زبان ہی نہیں ہے۔ میں تو کہتی ہوں ربیعہ! بات ڈال دو، اتنے اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں۔ عمیر کے لیے تو ایسی ہی لڑکی ہونی چاہیے، بہت ہی صلح جو اور سیدھا بچہ ہے۔"

"اماں! آپ بھی نا! ابھی عمیر کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی اور آپ شادی کے خواب دیکھنے لگیں۔ جب تک وہ اپنے پیروں پہ کھڑا نہیں ہو جاتا، میں اس کی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی اور پھر عمیر سے بڑا تو زبیر ہے۔ پہلے زبیر کا رشتہ طے ہو گا پھر عمیر کی باری آئے گی۔"

"ذرا بتا تو کتنے برس بڑا ہے تمہارا لاڈلا عمیر سے؟"

"چند سیکنڈ ہی سہی مگر بڑا تو زبیر ہی ہے نا!"

"چند سیکنڈ بھی نہیں، ہماری تو گود میں نرس نے دونوں کو اکٹھا ہی لا کر ڈالا تھا۔ ہاں فرق صرف یہ تھا، زبیر میاں چلا چلا کر اپنی آمد کی اطلاع دے رہے تھے جبکہ عمیر سست سا پڑا ہوا تھا۔" اماں کی منتقر کشی پہ ربیعہ کو بھی وہ وقت یاد آ گیا تو مسکرا کر بولی۔

"اب مان لیں آپ عمیر فطرتاً سیدھا ہے اور زبیر فطرتاً چلبلا۔ اس کو بگاڑنے میں میرا بالکل بھی ہاتھ نہیں۔"

"یوں کہو اس کو سنوارنے میں تمہارا بالکل بھی ہاتھ نہیں۔"

"اگر تم سسرال میں ہوتی نا تو عقل ٹھکانے پہ آ جاتی۔"

"سچ اماں! مجھے تو سوچ کر ہی وحشت ہوتی ہے۔ عدیم کے بنا میں کیسے بچوں کی پرورش کر پاتی۔ عدیم تو ایسے پردیسی ہوئے کہ آنے کا دل ہی نہیں کرتا۔" ربیعہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اماں بھی آبدیدہ ہو گئیں۔

"شادی سے پہلے انسان کا معاشی طور پر مستحکم ہونا کتنا ضروری ہے، یہ مجھ سے زیادہ کو

جان سکتا ہے۔ اس پیسے کے پیچھے میں نے نہ صرف عدیم کی جدائی کا کرب برداشت کیا ہے بلکہ لوگوں کی باتیں بھی سنی ہیں اور اب میری یہی سوچ ہے جب تک عمیر اور زیر اپنے پیروں پہ کھڑے نہیں ہو جاتے، ان کی شادی کے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں۔"

ربیعہ نے دوٹوک لہجے میں کہا تو اماں بھی قائل ہو گئیں پھر بھی دبے دبے لہجے میں بولیں۔

"رشتہ برا نہیں ہے۔ کہو تو ناصر کے کانوں میں ڈال دوں۔ بے شک دس سال کے بعد شادی کر لینا۔" اماں کو اس قدر مضر پا کر ربیعہ ہنس پڑی، وہ بھلا اب کیا کہہ سکتی تھی۔

"ہونہہ..... تو یہ بات ہے..... عمیر میاں کی شادی کی فکریں ہونے لگی ہیں۔ ناصر انکل کی بیٹی..... ارے کہیں یہ اریبہ تو نہیں، کیا ڈھونڈ کے ہیرا نکالا ہے نانی نے اور ماما کو تو دیکھو کیسے ہنس رہی ہیں۔

بچپن سے میرے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔ پاپا جو کپڑے بھیجتے تھے۔ نانی، عمیر کے لیے پہلے ہی الگ کر لیتی تھیں اور پھر مجھے سمجھ میں آ گیا تھا جو چیز پہلے منتخب کر لی جاتی ہے، وہی بہتر ہوتی ہے، اس لیے تو میں پھر اس پہ ضد لگا کر بیٹھ جاتا جو ماما اور نانی، عمیر کے لیے پسند کر لیتی تھیں اور اب بھی میرے ساتھ کچھ ایسی ہی ناانصافی ہونے والی ہے۔

مگر میں نے بھی ٹھان لی ہے، شادی کروں گا تو صرف اریبہ سے ورنہ کسی سے نہیں۔"

زیر سوچتا ہوا کچن میں آ گیا۔

☆☆☆

"یہ کس کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں؟" زیر انجان بنتے ہوئے کچن میں داخل ہوا تو یکدم گڑبڑا گئیں۔

"خبردار جو تم نے اسے کچھ بتایا۔" انہوں نے جلدی سے بیٹی کے کان میں سرگوشی کی۔

"کسی کی نہیں، تم بتاؤ..... تم اتنی جلدی کالج سے کیسے آ گئے؟"

"پیریڈ فری تھے، اس لیے۔" وہ پتیلیوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ "یعنی نیوڈل کھانا پک رہا ہے۔"

اس نے جیسے خود کلامی کی۔

"چلیں میری بغاوت نے اس گھر کا ایک تو مسئلہ حل کیا۔ وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے سے باہر نکل گیا۔

ربیعہ ششدر سی کھڑی رہ گئی۔ تب ہی نانی اس کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔

"زیر کو بھولے سے بھی یہ بات نہ بتانا ورنہ....." نانی نے اس خوف ناک طریقے

آنکھیں پھیلائیں کہ ربیعہ کو جھرجھری سی آ گئی۔

☆☆☆

ربیعہ نے غور کرنا شروع کیا۔ دونوں بچوں میں بالکل بھی ہم آہنگی نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں یا یہ کہ جان بوجھ کر ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔

"عمیر میرے ساتھ کرکٹ کھیلو گے" زیر گیند بلا اٹھائے لال بھبھوکا چہرہ لیے عمیر سے چور ہا تھا۔

"نا بابا! اتنی گرمی ہو رہی ہے اور لان میں دیکھا ہے دھوپ کتنی ہے۔ میں تو ویڈیو گیم کھیل ہوں۔"

"تم تھکتے نہیں ہو، یوں ہر وقت بیٹھ کر کھیلنے سے۔" زیر جیسے چڑ سا گیا تھا۔

"تم تھک جاتے ہو یوں بندروں کی طرح اچھلنے سے۔"

"مجھے پتا ہے تم نانی کی نظروں میں نمبر بنانے کے لیے نہیں کھیلتے۔"

"جی نہیں، میں کھیلتا ہوں لیکن کوئی وقت دیکھ کر۔" عمیر چڑ کر بولا۔

"تو اب میرے ساتھ کھیلو نا!" زیر منتوں پہ اتر آیا۔

"میں نے کہا نا، باہر دھوپ ہے اور پھر میرا موڈ بھی نہیں ہے۔" عمیر گیم میں مگن تھا۔

"ہم باہر برآمدے میں کھیل لیں گے۔" زیر نے آفر کی۔

"اور وہاں کی لائٹ پھوڑ دیں گے، ساتھ ہی نانی کا کمرہ ہے۔ بار بار دروازے پہ گیند لگتی نانی ڈسٹرب ہوتی ہیں۔"

"نانی تو گھر پر ہیرا ہی نہیں۔" زیر خوشی سے بولا۔

اب عمیر کے پاس انکار کا کوئی جواز نہ تھا۔

ربیعہ دونوں کو بہت دیر سے نوٹ کر رہی تھی۔ بالآخر بول پڑی۔

"عمیر اتنی منتیں کیوں کرا رہے ہو۔ جاؤ بھائی کے ساتھ جا کر کھیل لو۔"

"ماما..... یہ مجھے باری نہیں دیتا۔" عمیر نے پھر ایک جواز گھڑا۔

"زیر! بھائی کو پوری باری دینی ہے۔" ربیعہ نے نرمی سے کہا۔

"ماما..... میرا دل نہیں کر رہا اور باہر دیکھیں کتنی گرمی ہے۔" عمیر ہمیشہ ہی اسی طرح کرتا، زیر کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے آگے بڑھ کر گیم کی تاریں کھینچ دیں، گیم بند ہو گیا تو سے لڑنے لگا۔

ربیعہ یکدم بیچ میں نہ آتی تو دونوں ایک دوسرے کو خاصا نقصان پہنچا لیتے۔

"یہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔" زبیر شکوہ کر رہا تھا۔

"میں آخر کس کے ساتھ کھیلوں، گلی کے لڑکوں کے ساتھ آپ مجھے کھیلنے نہیں دیتیں۔"

ربیعہ چپ سی ہو گئی۔

زبیر غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا جبکہ عمیر پُرسکون انداز میں پھر سے گیم اسٹارٹ کر کے بیٹھ گیا تھا۔

ربیعہ، عمیر کو بھی قائل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک طرح سے تو عمیر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا مگر یہ بات زبیر کو سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ چھٹی کا دن وہ ضائع نہیں کرتا تھا۔ سارا دن کھیل کود میں گزارنا چاہتا تھا۔ جبکہ عمیر کھیل کود کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی فرمائشیں اور آرام کو بھی نہیں بھولتا تھا۔ وہ یہ سمجھائے ہی اتنا سمجھ دار تھا جبکہ زبیر کو سمجھا سمجھا کر اس کی اپنی سمجھ داری خطرے میں پڑ گئی تھی۔

"اس وقت تم عمیر کے ساتھ گیم کھیل لو۔ باہر واقعی دھوپ ہے، شام کو کھیل لینا!"

"میں اس کے ساتھ ہرگز نہیں کھیلوں گا۔" زبیر کی ضد عروج پر تھی۔

"نا کھیلو..... میں تمہارے بغیر کھیل رہا ہوں۔" عمیر اسے چڑا رہا تھا۔

نتیجہ وہی، زبیر نے گیم پہ جھپٹنا چاہا۔ ربیعہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

اس پہ غصہ و جھنجلاہٹ سوار تھی۔

"ماما! میں اس وقت کھیلنا چاہتا ہوں۔ مجھے کھیلنے کے لیے ساتھی کی ضرورت ہے۔" وہ کے بل چلایا تھا۔

ربیعہ اس کا جنون دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر برآمدے میں لے آئی۔ "تم کھیلوں گی تمہارے ساتھ، چہرے سے پسینہ صاف کرو اور خود کو ریلیکس کرو۔" ربیعہ کا اتنا کہنا زبیر چہک اٹھا۔

ربیعہ اس کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگی۔

ایک گھنٹے کے بعد قاری صاحب نے آ جانا تھا پھر رات کو ٹیوٹر نے۔ آخر وہ کتنا کھیل لیتا زیادہ سے زیادہ ایک ہی گھنٹہ۔ اس گھنٹے میں ربیعہ بھی فارغ تھی۔ چلو اس طرح وہ حسد اور چڑچڑ پن سے تو بچ رہا تھا۔

اماں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں، گھر میں داخل ہوئیں تو منظر دیکھ کر ماتھا پیٹ لیا۔ اس کی تو مانو مت ہی ماری گئی۔ ربیعہ دوڑ دوڑ کر ہانپنے لگی تھی۔ اماں سے نظریں چار ہوئیں تو کھسیا سی گئی۔ اماں کے چہرے پہ تعجب اور پھر ناگواری ابھر آئی۔

"بس یہی کسر باقی تھی۔" وہ جوتیاں گھسیٹتی کمرے میں چلی گئیں۔

"بس کرو زبیر! میں تھک گئی ہوں۔"

"ماما پلیز! ایک اوور اور..... اگر پاپا یہاں ہوتے نا تو میں روزان کے ساتھ کھیلتا اور پھر ل عمیر کو بتاتا۔"

"کیا بتاتے، وہ تو بنا ساتھی کے ہی کھیلتا رہتا ہے اور تم..... تمہارے ساتھ مسئلہ یہی ہے کہ نہیں ساتھی چاہیے۔" ربیعہ نے پھولی سانسوں سے گیند زبیر کی طرف پھینکی۔

"ماما! بھی کوئی بنا ساتھیوں کے بھی کھیلتا ہے؟" زبیر نے اس معصومیت اور سادگی سے ال کیا کہ ربیعہ چپ سی ہو گئی۔

"بچے تو اپنے ساتھیوں میں ہی کھیلتے ہیں۔ اگر زبیر نارمل ہے تو کیا عمر ابنارمل ہے۔" وہ ناسمجھی گئی اور تب ہی زبیر نے گیند کو اس قدر پرجوش ہو کر ہٹ لگائی کہ وہ اماں کے دروازے کی جالی ماز کر لے آئی۔

"توڑ دو دروازے کھڑکیاں..... تمہارا باپ بنوا کر دے گیا تھا۔"

اماں غصے میں بولتی باہر آئیں تو زبیر بیٹ چھوڑ کر بھاگ لیا۔ ربیعہ نے اس موقع کو غنیمت ا اور پنکھے کے نیچے بیٹھ کر پسینہ سکھانے لگی۔

☆☆☆

"ارے اب تو ان کتابوں کا پیچھا چھوڑ دو، اب تو تم ڈاکٹر بن گئے ہو۔ لو دودھ پیو۔"

"ابھی کہاں..... نانی..... ابھی تو ایک مرحلہ اور ہے۔" عمیر نے نانی کے ہاتھ سے دودھ لاس لے لیا پھر مسکرا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ یہ میرے نصاب کی کتابیں نہیں ہیں، یہ دبی کتابیں ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے مجھے ادب سے کتنا لگاؤ ہے۔"

نانی نہال ہی ہو گئیں۔

"بڑا ہی با ادب بچہ ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتی ہوں۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے پہلے ہی با ہے۔"

عمیر کو ہنسی آئی مگر مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"نانی.....! ادبی کتابوں سے مراد ہے....."

"ارے چھوڑو..... ہمیں کیا لینا دینا..... وحید مراد کی کتابوں سے۔"

"وحید مراد کی فلمیں دیکھتی تھیں نا آپ؟"

"پرے ہٹ۔ تو بھی اپنے بھائی کی طرح مجھ سے مذاق کرنے لگا ہے۔"

"اوہو نانی..... آپ تو برا مان گئیں۔"

"میرا مقصد ہے آپ وحید مراد کو جانتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے، آپ فلمیں دیکھتی ہوں گی، اس کا مطلب ہے اسٹوریز کا بھی پتا ہوگا آپ کو۔ آئی مین، ڈرامے وغیرہ کا۔ میں یہی بتانا چاہ رہا تھا کہ یہ سب کتابیں میں اس لیے پڑھتا ہوں کہ میں ٹی وی کے ایک پرائیویٹ چینل کے لیے ڈراما لکھ رہا ہوں۔"

"ہائیں....." نانی اچھل پڑیں۔

"ہاں نانی! ڈاکٹر عمیر ربانی، جب ٹی وی اسکرین پہ یہ نام آئے گا نا تو آپ....." کہ عمیر چپ سا ہوگیا۔ اور ساکت وجامد نانی کو دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"پھر بتائیے آپ کی کیا فیلنگ ہوں گی؟"

"ہائیں، تو سچی کہہ رہا ہے؟" نانی نے دل پہ ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں پوچھا۔

"بالکل سچ۔" عمیر اتراتے ہوئے کرسی سے کھڑا ہوگیا۔"

"اور یہ بات کس کس کو پتا ہے؟" نانی ایسے نہال ہوئیں جیسے ابھی عمیر کو نظر بد سے بچا کے لیے کلیجے میں چھپالیں۔

"سب ہی کو کیوں؟"

"سب کو چھوڑ..... یہ بتا وہ تیرے بھائی..... زبیر کو بھی پتا ہے؟"

"پتا نہیں، مگر کیوں؟"

"اسے نہ ہی پتا چلے تو اچھا ہے۔ معبث تیری راہ میں کانٹے بوئے گا۔ جلتا جو ہے تجھ سے عمیر، نانی کی زنانی منطق پہ ہنس پڑا۔

"میرے اس مشغلے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق اسے تب پڑتا ہے جب ماما میرے پیچھے چلنے کو کہیں۔ آئی مین، میری طرح کچھ کرنے کو۔"

"ہاں، یہ بھی تو ٹھیک کہہ رہا ہے اور اس کے لیے تو عقل چاہیے جو کم از کم اس کے ہے نہیں۔"

نانی نے یہ کہہ کر خود ہی ٹھٹھا لگایا۔

"اگر اس کے پاس عقل نہ ہوتی تو مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ ماسٹر نہ بنتا۔"

ربیعہ باہر سے ہی بولی تو نانی، عمیر کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ "بچپن سے بندر طرح اچھلتا تھا۔ اب اس اچھل کود کے ایوارڈ بھی ملنے لگے۔" عمیر ہنس پڑا۔

"سیلف ڈیفنس۔ آئی مین، اپنی ذات کا دفاع۔" وہ اپنی کتابوں میں مشغول نانی بتا رہا تھا۔

"بھلا اس کا کچھ فائدہ ہے خوامخواہ کا پاگل بن۔"

عدیم نے بھی کچھ ایسا ہی رسپانس دیا تھا اور تب اس نے عدیم سے کہا تھا۔ اپنے شوق کی تکمیل سے انسان کو بذاتِ خود سکون ملتا ہے اور یہ سکون شخصیت کو پازیٹو رکھتا ہے اور زبیر کو ایسے ہی پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ فضول وہ اپنی انرجی اِدھر اُدھر ویسٹ کرتا ہے۔ کیوں نا ہم اس کے ان کو کسی منظم ادارے کے سپرد کر کے دیکھیں۔"

گیارہ سال کی عمر میں عدیم نے اسے مارشل آرٹ کلب جوائن کرایا تھا اور اب وہ بائیس سال کا ہو چکا تھا۔ ٹھوس جسم اور نکلتا ہوا قد اس کی شخصیت کو پرکشش بنا رہا تھا۔ مارشل آرٹ میں اس نے کئی ایوارڈ حاصل کیے تھے اور اب مختلف کمپنیوں کے تعاون سے اپنا ذاتی ادارہ بنا رہا تھا اور یہ اس کا خواب تھا کہ جنوبی پنجاب میں پاکستان کا سب سے بڑا مارشل آرٹ کلب قائم کرے۔

☆☆☆

"یہ موٹی کون ہے؟"

"راحو۔"

"کون سے پنڈ سے آئی ہے۔"

"زبیر! تمیز سے بات کرو، یہ ہماری مہمان ہے۔ چکلالہ سے..... آئی ہے۔"

"ارے تم گل رانی ہو، اف کتنی موٹی ہوگئی ہو۔ بالکل بھینس کی بھینس۔"

"منہ سنبھال کے بات کرو۔ بچو..... تمہارے اوپر بیٹھ گئی نا تو تمہارا کچومر نکال دوں گی۔"

"مجھ سے پہلے اور کتنوں کا کچومر نکال چکی ہو؟"

"تم سے پہلے کسی نے بھینس بھی نہیں کہا۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی اور کتابیں اٹھا کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ زبیر نے استہزائیہ نگاہ ماں پہ ڈالی۔

"گل رانی بورڈ کے امتحان دینے کے لیے یہاں آئی ہے۔ چند دن یہاں ٹھہرے گی پھر جائے گی، اسے تنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اپنی خالہ کے ہاں بھی رہ سکتی تھی لیکن بڑوں کا یہ دستور ہے جہاں لڑکیوں کی نسبت طے ہو جاتی ہے، وہ اس گھر میں صرف دلہن بن جاتی ہے۔ احمد سے اس کی بچپن کی نسبت طے ہے، اس لیے وہ یہاں رہے گی۔"

"ہائے اللہ..... احمد..... وہ سوکھا تیلا۔ قسم سے الف نون کی جوڑی لگے گی دونوں کی۔" ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا۔

"بائی واے..... اس توپ کے گولے کو کالج لے کر کون جائے گا۔"

"یہ ذمہ داری عمیر نے سنبھال لی ہے، تمہیں اس کی فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

''ارے واہ، آپ نے کیسے کہہ دیا، فکر نہ کروں۔ اتنی مہنگائی کے دور میں اتنی فربہ مہمان نجانے کتنی روٹیاں کھاتی ہوگی۔ آٹا دیکھا ہے کتنا مہنگا ہے۔'' وہ شرارت سے سرگویانہ لہجے میں بو ربیعہ نے اس کی کمر پر زور کی دھپ لگائی جو لگائی، خود رانی بھی کمر پہ ہاتھ رکھ کر لڑنے کے لیے نکل آئی۔

''لگتا ہے تم بچپن کی وہ سزا بھول گئے ہو جو تمہیں سارے مہمانوں کے سامنے ملی تھی۔''

زبیر کے چہرے کا رنگ یکدم پھیکا سا پڑا تو وہ آنکھیں گھما کر بولی۔

''ریاض مصطفیٰ کی بیٹی ہوں میں۔''

''اب بھی ویسے ہی ہو یا کچھ قرینہ بھی آ گیا ہے۔''

نانی سیر کو سوا سیر ملنے پہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں جبکہ ربیعہ کے چہر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''ماما! اس سے کہیں، اپنا منہ بند کرے۔ ورنہ.....''

''ورنہ کیا.....'' وہ دوبدو بولی۔

''آنٹی کو بیچ میں کیوں لا رہے ہو۔ اچھا..... ابھی تک ننھے منے ہی ہو۔ اب بھی آنٹی پلوے بندھ کر سوتے ہو۔''

''موٹی..... چھوڑوں گا نہیں۔'' رانی' ربیعہ کے پیچھے چھپنے لگی۔ ربیعہ ان کی نوک جھونک اسی منظر میں چلی گئی جو رانی' زبیر کو یاد دلا رہی تھی۔

☆☆☆

نغمہ کی منگنی پر سارے ہی جمع تھے۔ خواتین ڈھولکی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور حضرات کرکٹ میچ اور سیاست سے فیض یاب۔ ایسے میں بچے اندر باہر کودتے پھاندتے پھر تے پھرتے نجانے بچے کھیلتے کھیلتے کب چھت پر چلے گئے کسی کو پتا ہی نہ چلا۔ شام ڈھلے رسم ادا کھانے کا شور اٹھا۔ خواتین کو اپنے اپنے بچوں کا خیال آیا تو ٹولیوں کی شکل میں جسے جہاں بچوں سمیت پسر گئیں اور کھانے میں مشغول ہو گئیں۔ عاقلہ بھابھی بہت دیر سے کسی کی تلاش ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ پھر ربیعہ کے قریب آ گئیں اور پریشانی سے بولیں۔

''بھابھی! بڑی پریشانی ہو گئی ہے۔ گل رانی نجانے کہاں چلی گئی ہے۔ جمیلہ باجی رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔ مصطفیٰ بھائی کو پتا چل گیا نا کہ گل رانی پچھلے کئی گھنٹے سے غائب اس پنڈال میں آگ لگا دیں گے۔''

''مگر رانی تو بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی، کہاں جا سکتی ہے وہ۔'' ربیعہ مہمانوں کو

کرتے کراتے پریشان ہو گئی۔

ابھی کچھ دیر پہلے تو اس نے اپنے بچوں کے ساتھ دیکھا تھا رانی کو۔ اس سے پہلے کہ ربیعہ بچوں سے پوچھتی، عمیر دوڑتا ہوا آیا اور سب کے درمیان کھڑا ہو کر پھولی سانسوں سے بولا۔

''ماما..... رانی کو چھپن چھپائی کھیلتے ہوئے۔ زبیر نے اوپر مرغیوں کے ڈربے میں بند کیا تھا۔''

''کیا.....'' ربیعہ کے سر پر آسمان آ گرا جبکہ عاقلہ اور جمیلہ آہ و فغان کرتی اوپر کی طرف دوڑیں۔ ربیعہ ان کے پیچھے لپکی اور اس کے پیچھے اور گھر کی دوسری خواتین..... یوں بھگدڑ سی مچ گئی۔

مرغیوں کے ڈربے میں بند گل رانی بے ہوش پڑی تھی۔ عاقلہ نے سینہ پیٹ ڈالا۔ ٹھنڈ اتنی تھی کہ گل رانی کو بخار چڑھ آیا تھا۔

عاقلہ اور سیلہ بچی کو نیچے تو لے آئیں مگر نیچے آنے کے بعد جو شور مچا لوگ کھانا بھول گئے۔ شور شرابا مردانے تک پہنچا تو ندیم کے بھائی بہنوئی بھی اندر آ گئے۔ ندیم نے فکر مندی سے بیوی کی طرف دیکھا تو عاقلہ نے انہیں سارا واقعہ کہہ ڈالا۔ جمیلہ چونکہ ندیم کی سالی تھی، اسے بہت سکی محسوس ہوئی۔ ندیم نے سارے بچوں کو اکٹھا کر لیا پھر ساری گواہیوں اور بیانات سے یہی نتیجہ اخذ ہوا کہ یہ سراسر کارستانی زبیر کی تھی۔

ندیم کو بھتیجوں سے بہت پیار تھا پھر بھائی بھی دیار غیر میں بیٹھا تھا، وہ قطعاً سخت سزا نہ دیتا۔ اگر جمیلہ واویلا مچانے سے باز رہتی۔ وہ تو رو رو کر دہائیں دے رہی تھی۔ ''اگر میری بچی کو کچھ ہو جاتا تو ہائے میں مر گئی، میری معصوم بچی!'' پھر مجمع میں بھی چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔

''بچے ایک دوسرے کو مارتے پیٹتے تو ہیں لیکن اس بچے کی کیسی خونخوار فطرت سامنے آئی ہے۔ خدانخواستہ بچی ٹھنڈ یا خوف سے مر جاتی تو.....'' ربیعہ کی ایسی حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ شرمسار و پشیمان جمیلہ کو حوصلہ دے رہی تھی۔

''ہٹو بہن! میرے ہاتھ مت لگاؤ۔ تم سے بچے نہیں سنبھلتے تو اپنے میاں کو واپس بلا لو۔ کم از کم بچے تو کنٹرول ہوں گے۔'' ربیعہ کا سر شرم سے جھک گیا۔

جبکہ اماں جی کہہ رہی تھیں۔

''میرا بیٹا تو ابھی چند دن پہلے ہی گیا ہے اور اللہ کرے گا جلد واپس بھی آ جائے گا۔ کھیل میں بچے سے نادانی ہو گئی۔''

''نادانی.....'' جمیلہ کاٹ کھانے کو دوڑی تو عاقلہ کو بھی حوصلہ ہوا۔

''اماں جی.....! آپ فضول حمایت کر رہی ہیں۔ ندیم بھائی کے بچوں کی۔''

''اصل میں بھابھی حضور اپنے بچوں کو روکتی ٹوکتی نہیں، اس لیے تو وہ ایسے چاند چڑھاتے ہیں۔''

صرف زبیر ہی ایسا ہے۔ عمیر تو ایسا بھولا بچہ ہے۔ ہوتے ہوئے بھی اس کے ہونے کا پتا نہیں چلتا۔ اماں جی نے بات ختم کرنا چاہی مگر بجیلہ چادر لے کر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

ربیعہ شرمندگی اور خفت سے ایک کونے سے لگی کھڑی تھی پھر اچانک اسے بچوں کا خیال آیا، اسکا جی چاہ رہا تھا کہ زبیر کو کان سے پکڑ کر ایسی پٹائی کرے کہ بجیلہ واویلا کرنا بھول جائے لیکن زبیر کو غائب پا کر جب باہر آئی تو منظر دیکھ کر دل تھام لیا۔

ندیم نے زبیر کی جی بھر کر ٹھکائی کی تھی اور اب اسے سب کے سامنے کان پکڑوا رکھے تھے۔ زبیر کا لال بھبھوکا چہرہ اور کانپتی ٹانگیں۔ ارد گرد اس کا مذاق اڑاتے بچے اور سہما ہوا عمیر..... ربیعہ کے دل میں جتنا غصہ تھا، یکدم زائل ہو گیا۔

ابھی چند روز قبل ہی تو اس کی اور ندیم کی اس بات پہ ٹھیک ٹھاک لڑائی ہوئی تھی۔

''پلیز ندیم! اسے میں گھر جا کر سمجھاؤں گی مگر یہاں سب کے سامنے..... بچے کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔'' وہ دبی دبی آواز میں ندیم سے التجا کر رہی تھی۔

''بچے کی عزت نفس ہوتی ہے اور ہماری کوئی عزت نہیں۔'' ندیم جھلا پڑے تھے۔ ''جانتی ہو تم اس کی وجہ سے کتنی ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہے مجھے۔''

''اس کا بھائی بھی تو ہے..... اسے دیکھ کر ہی سدھر جائے یہ.....'' گھر میں داخل ہوتے ہی ندیم نے اتنی زور سے اسے پھینکا تھا کہ وہ فرش پہ دور جا گرا تھا اور بلی کے بچے کی طرح بلبلانے لگا تھا۔

''کوئی ہمدردی نہیں ہے مجھے تم سے۔'' ربیعہ نے زبیر کو جھڑکا تھا۔

''نہیں..... کر و گر و تم اس سے ہمدردیاں، کہیں آنے جانے، منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑے گا یہ۔'' ندیم کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

''کیا اوقات ہے ایک کوک کی..... پانی کے ٹبوں میں بوتلیں ٹھنڈی ہوتی دیکھ کر موصوف ایسے ہو گئے جیسے میں نے انہیں کبھی کوئی بوتل نہیں پلائی۔ ابھی کھانا تک نہیں کھلا تھا اور اس نے واویلا کر ڈالا تھا کہ کوک پینی ہے۔ اس پہ چھو..... پیسے دیے اسے میں نے کہ باہر سے جا کر پی لے۔ یہاں معززین میں مجھے شرمندہ نہ کرے۔ ان پیسوں کے غبارے لے آیا اور پھر بوتل کی ضد.....''

''تایا ابا کی توجہ ہوئی تو انہوں نے بوتل کھلوا کر اسے دے دی۔ جانتی ہو، تایا ابا کے بڑے داماد میاں کیا کہہ رہے تھے۔ بچوں کو گھر میں ڈھنگ سے نہ ملے تو بچوں کی نیت یونہی خراب ہو جاتی ہے۔''

میری بے روزگاری کی وجہ سے وہ مجھے ایسی باتیں سنا رہا تھا۔ حالانکہ ان کی خواہشات کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا اور آج اس نے میرا جنازہ نکال ڈالا پھر محترم بھاگتے ہوئے آئے اور ساری کوک میرے اوپر انڈیل دی۔ لوگ ہنس رہے تھے مجھ پر۔''

ربیعہ کے لب سل گئے اور آنکھیں جھک گئیں۔

''اور یہ صرف تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے، جب اس پہ سختی کرتا ہوں، تب ڈھال بن جاتی ہو۔''

''اب ڈھال نہیں بنوں گی۔'' ربیعہ سختی سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ندیم نے اسے ساری رات اسٹور میں بند رکھا۔

ربیعہ آنکھیں میچے کروٹیں بدلتی رہی، پر لب سے کچھ نہ بولی۔ آدھی رات کو ندیم نے اسے ہلایا اور کہا۔ ''جا کر اسے دیکھو، کہیں مر ہی نہ گیا ہو۔'' ندیم کا لہجہ نڈھال تھا، وہ خود بھی کہاں چین سے سو سکا تھا۔

ربیعہ حکم پاتے ہی بجلی کی طرح اسٹور میں آئی تو وہ بستر پہ آڑا ترچھا پڑا سو رہا تھا، بالکل غافل۔ ربیعہ نے اس کے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا تو اس کا دل مٹھی میں آ گیا۔ زبیر کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ نجانے کتنی دیر روتا رہا ہوگا۔ ندیم بھی پیچھے پیچھے آ گیا تھا اور دروازے میں کھڑا تھا۔

''سارا دن بالکل نچلا نہیں بیٹھتا، پڑتے ہی غافل ہو گیا ہوگا۔'' ندیم اس کے بستر کے قریب آ کر بولا۔

ربیعہ رو رہی تھی۔ ''ہر وقت سمجھاتی ہوں، نجانے کیوں سمجھنا نہیں چاہتا۔''

''تم کیا سمجھتی ہو، مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔'' ندیم کی آواز رنجیدہ و بوجھل تھی۔

''اگر ہم نے اس کی بے وقوفیوں کو نہ سدھارا تو یہ اپنی زندگی تباہ کر لے گا۔'' ندیم، ربیعہ کو سمجھا رہا تھا۔

''جانتی ہوں..... اور..... اسی وجہ سے میں اسے زیادہ وقت اور توجہ دیتی ہوں تاکہ اسے غلطیوں کے کم مواقع ملیں لیکن آپ اور آپ کے گھر والے یہ سمجھتے ہیں کہ میں اسے بگاڑ رہی ہوں۔'' ربیعہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اس کی شرارتوں کی وجہ سے کوئی بھی اسے برداشت نہیں کرتا، سب ہی عمیر کا کلمہ پڑھتے ہیں، یہ اس چیز سے اور بھی چڑ چڑا ہو رہا ہے۔''

''یہ صرف چند دن کی بات ہے۔ میرا اپائنٹمنٹ لیٹر جیسے ہی آئے گا، میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور پھر تم بچوں کو لے کر اپنی ماں کی طرف چلی جانا۔''

''چھوٹی سی فیملی ہوگی، بچوں کی تعلیم و تربیت میں تمہیں پھر کوئی وقت نہیں ہوگی اور کوشش کرنا دونوں بچوں پر یکساں توجہ رہے۔'' ندیم نرمی سے ربیعہ کو سمجھا رہا تھا۔

''رات بہت ہو گئی ہے، میں اسے عمیر کے پاس سلا آتا ہوں۔ تم کمرے میں چلو۔ یہ کیا.....''

ندیم نے اسے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو کراہیت سے واپس ڈال دیا۔ ''اس کا تو

بستر گیلا ہے۔"

ربیعہ کو شاک لگا، ایسا پہلی بار ہوا تھا۔

"شاید خوف کی وجہ سے......" ربیعہ نے جھجکتے ہوئے کہا تو عدیم سوچ میں پڑ گیا۔ ربیعہ نے اسے جگایا۔ زبیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ماما......! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر...... کیسا ڈر......" ربیعہ نے نرمی سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں تمہارے پاس ہوں، سو جاؤ۔"

اور پھر چند منٹوں میں وہ غافل ہو گیا۔

"بھابھی!" بعد میں ندیم شرمندہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"اگر میں...... سب کے سامنے اسے سزا نہ دیتا تو جلیلہ اور ریاض بھائی کا غصہ بھی ٹھنڈا نہ ہوتا۔ آپ تو جانتی ہیں ان کی عادت کو، عاقلہ کی ہی ایک ہی تو بہن ہے۔ عمر بھر کا ناتا توڑ کر جا رہے تھے یہ لوگ......"

ربیعہ نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پہ سجائی تھی۔

"زبیر نے قصور کیا تھا اور اسے سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔ ہو سکتا ہے آج کی سزا کے بعد اسے عقل آ جائے۔" ربیعہ کی آواز رنجیدہ سی تھی۔ ندیم کو خود بھی ملال تھا۔ پھر بہت دیر کے بعد جب وہ کمرے میں آئی تھی تو زبیر واقعی بے سدھ سویا پڑا تھا۔ عمیر بھی منہ لٹکائے اس کے پیچھے آ گیا تھا۔

ربیعہ نے اس کے پاؤں دیکھے جو سرخ ہو کر سوج رہے تھے۔

اس کا چہرہ بھی لال ہو رہا تھا۔ "بہت دیر تک مرغا بنایا ہے چاچو نے اسے۔"

عمیر مری مری آواز میں کہہ رہا تھا۔ شاید اسے بھی بھائی کی حالت کا رنج تھا۔ ربیعہ نے بغور عمیر کی طرف دیکھا۔

"عمیر......! اگر تمہیں پتا تھا کہ رانی اوپر بند ہے تو تم چپکے سے مجھے بھی بتا سکتے تھے۔ سب کے سامنے ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت تھی۔" ربیعہ کے لہجے میں غصہ و شکوہ تھا۔

"ایم سوری ماما......!" عمیر نے سر جھکا لیا۔

"مگر ماما......! آپ ہی تو کہتی ہیں۔ سچ کبھی بھی اور کہیں نہیں چھپانا چاہیے۔" وہ معصومیت سے کہہ رہا تھا۔ ربیعہ نے گہری سرد آہ کھینچی پھر حسرت سے بولی۔

"کاش...... زبیر بھی تمہارے جیسا ہوتا تو میری زندگی میں ندامت کبھی نہ آتی۔" پھر یکدم ربیعہ کو اپنے کہے گئے لفظوں کا احساس ہوا۔

"مجھے تو دونوں سے پیار ہے اور دونوں کو ایک سا دیکھنا ہے۔" وہ سوئے ہوئے زبیر اور
کے بالوں کو سہلاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

"ڈاکٹر صاحب نو سال کا بچہ بستر گیلا کرے تو بہت عجیب فیل ہوتا ہے، اب یہ بچہ تو ہے پھر اسے صبح اسکول جانا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی نیند پوری نہیں ہوتی۔ آپ کوئی دوا ہی کر دیں تا کہ اس کا پرابلم حل ہو جائے۔"

ڈاکٹر شاہد عزیز، ربیعہ کی بات پہ تھوڑا سا مسکرائے تھے۔

"میڈیسن اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ آپ کوشش کریں کہ اسے رات کو جگا کر باتھ روم جایا کریں۔ سونے سے کم از کم دو گھنٹے قبل دودھ دیں۔ سونے سے قبل اسے پیشاب کرا کر یں تو وہ بستر گیلا نہیں کرے گا۔"

"آپ شاید یقین نہیں کریں گے ڈاکٹر صاحب! میں یہ سب کچھ کرتی ہوں مگر پھر بھی دو روز کے بعد وہ بستر گیلا کر دیتا ہے۔"

"ہونہہ......" ڈاکٹر شاہد سوچ میں ڈوب گئے۔ "آپ نے محسوس کیا ہو، بچہ ڈرتا تو نہیں۔"

"ہاں ڈاکٹر صاحب! اندھیرے سے بہت ڈرتا ہے، اس کے باوجود شرارتی بھی بہت اسکول سے آنے کے بعد ایک پل بھی سکون سے نہیں بیٹھتا۔ کھانے پینے میں بھی نکما ہے۔" نے تفصیلات سے آگاہ کیا تو ڈاکٹر شاہد بولے۔

"بچے شرارتی ہوتے ہی ہیں۔ جتنا انہیں شرارتوں سے روکا جاتا ہے، وہ اتنا ہی کرتے ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! ایک حد تک بچے شرارت کرتے ہیں، اب اس کا ہم عمر بھائی بھی تو وہ تو ایسا نہیں ہے۔"

"مسز عدیم! یہ بتائیں کہ باغ کے سارے پودے ایک سے ہوتے ہیں۔"

ربیعہ خجل سی ہو گئی۔

"زیادہ روک ٹوک یا ڈرانا دینا بچوں کے لیے صحیح نہیں ہوتا۔ بہت سے والدین بچوں کو پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس سے بچے کی شخصیت مسخ ہوتی ہے، تحت الشعور میں خوف تا ہے۔ ناخن چبانا، رات کو پیشاب کرنا، ان ہی وجوہات کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔ بچوں کی فس مجروح نہ ہونے دیں۔ کچھ بچے انتقاماً ایسا کرنے لگتے ہیں۔ بہر حال یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ ہے۔ معمولی احتیاطوں سے آپ اس پر قابو پا سکتی ہیں۔ بچے کی عمر کم ہے، کوئی بھی میڈیسن یفیکٹ پیدا کر سکتی ہے۔"

اور ربیعہ ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

"پاپا! میں کبھی فیل نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی ہوں گا مگر کیا یہ ضروری ہے میں بھی عمیر کی فرسٹ آؤں؟"

"کیا مطلب ہے اس کا..... ان سب باتوں سے۔" عدیم نے الجھتے ہوئے ربیعہ طرف دیکھا۔

"کوئی مطلب نہیں ہے، بس کھیل کود میں زیادہ دھیان ہے تمہارے لاڈلے کا۔" اما نے بیچ میں دخل اندازی کی تو زبیر ٹھٹک کر بولا۔

"کہاں کھیلنے دیتی ہیں ماما مجھے۔ ہر وقت تو ٹوکتی رہتی ہیں۔ میرے سب دوستوں سائیکل چلانا آتی ہے۔ ماما سائیکل بھی چلانے نہیں دیتیں، چوٹ لگ جائے گی، گر جاؤ گے، ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گی۔ نانی بھی یہی کہتی رہتی ہیں۔ میرے دوستوں کے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔"

"آج تک تمہارے بھلے کے لیے ہی کہتی تھی۔ میری بلا سے بھاڑ میں جاؤ۔ ایک بات تمہارا ہی دل ہے۔ وہ جو تمہارے ساتھ دنیا میں آیا تھا۔ اس کا تو من نہیں کرتا ایسی اوٹ پٹانگ حرکتوں کو۔" نانی نے حسب معمول عمیر کی تعریفیں شروع کر دیں۔ زبیر کی جلن اور زیادہ بڑھ گئی۔

ربیعہ زبیر کی اس فطرت سے واقف ہو گئی تھی جبکہ عدیم عجیب الجھن اور کشمکش کا شکار تھا حالانکہ دل تو عمیر کا بھی چاہتا تھا کہ زبیر کی طرح سائیکل چلائے لیکن اسے چلانی نہیں آتی تھی۔ بھی کوشش کرتا مگر جاتا پھر کوشش کا موقع بھی کہاں ملتا تھا۔ زبیر جو قبضہ کیے رکھتا تھا سائیکل پر۔ سائیکل اور وہ..... وہ چپ چاپ ہمیشہ کی طرح اس کھیل سے ہی دور ہو جاتا تھا جس پہ زبیر کا قبضہ تھا اور جب زبیر کو کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی، تب وہ دانستہ اس کے ساتھ شامل نہ ہو کر اپنے ہونے والی زیادتی کا بدلہ لے لیا کرتا۔ یوں دونوں میں دوریاں بڑھتی چلی گئیں۔

☆☆☆

"تمہارا بھائی سمجھتا کیا ہے خود کو۔" رانی غصے سے لال ہو رہی تھی۔

"کون..... زبیر..... ارے اس کی تو عادت ہے۔ وقت پر پہنچ تو گئے تھے ہم۔"

جب وہ موٹر بائیک کی ہوا نکال رہا تھا، تب میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

"مگر پھر بھی بے شرمی سے وہ یہی کہتا رہا کہ میرے بیٹھنے کی وجہ سے ٹائر پنکچر ہو گیا صبح صبح کا وقت نہ ہوتا نا تو اسے مزہ چکھا دیتی۔"

"چھوڑو یہ بتاؤ، پیپر کیسا ہوا؟"

عمیر نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"بس..... ہو گیا....." وہ جھولی میں رکھے امرود کھانے لگی۔

"بس ہو گیا؟ اتنی محنت کرائی میں نے تمہیں اور تم کہہ رہی ہو بس ہو گیا۔"

"ہاں، میں نے کون سا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا ہے۔ اگلے برس تو شادی ہو جائے فارغ ہی تھی اس لیے ایف اے کرنے کا ارادہ بھی کر لیا۔ اگر نہ بھی کرتی تب بھی سب سے پڑھی لکھی تھی میں اپنے خاندان کی۔ تمہیں پتا ہے ہمارے گاؤں میں میٹرک تک تو کسی لڑکے بھی نہیں پڑھا، لڑکیاں تو کیا پڑھیں گی۔"

"تو پھر تمہیں پڑھنے کا شوق کیسے ہوا؟"

رانی اس سوال پر شرما گئی۔

عمیر نے خاصی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ نا..... احمد نے بھی..... ایف اے..... کیا ہوا ہے، اس لیے میں نے بھی سوچا۔ فارغ ہوں ہی..... ایف اے کر ہی ڈالوں۔ ٹھیک کیا نا میں نے۔ آگے زندگی کا کیا پتا، خوامخواہ میرے پر رعب جماتا۔ اب بات کرے گا تو سوچ سمجھ کر کرے گا۔ کیوں، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔"

"بس..... اتنا سا فائدہ سوچا تم نے..... بے وقوف لڑکی..... دو کلاسیں اور پڑھ لو، عقل جائے گی تمہاری۔" عمیر اس کی چھوٹی سوچ پر سر جھٹک کر رہ گیا۔

"نا بابا پھر سب مجھے کہیں گے، اپنے شوہر سے بڑی ہوں۔ تمہیں نہیں پتا، وہاں کی خواتین ایسی سوچ رکھتی ہیں۔ زیادہ پڑھنے سے لڑکیوں کی عمر کے بھید کھل جاتے ہیں۔"

"ویری انٹرسٹنگ۔ پھر تو تم گاؤں کی لڑکیوں کی اماں کہلایا کرو گی۔ ایف اے جو کر لیا ہے تم نے۔"

رانی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ویسے بھی اس سے زیادہ پڑھ لکھ کر میں نے اس کی استانی تھوڑا ہی بننا ہے۔"

"لگتا ہے یہ بات تم نے اپنے وزن کے بارے میں کبھی نہیں سوچی۔ وہ ایک چھٹانک کا اور تم پورے دو من کی۔" عمیر نے کہہ تو دیا لیکن رانی کے جو تیور بگڑے دیکھے تو سٹپٹا گیا۔

"میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔"

"تم دونوں بھائیوں میں رتی برابر بھی فرق نہیں ہے۔ نجانے آنٹی اور تمہاری نانی کیوں کہتی ہیں، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" وہ عمیر کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"اصل میں سینس آف ہیومر تو سب کا ایک سا ہوتا ہے نا!" عمیر برا چھنسا تھا۔

وہ گھور کر چپ ہوگئی۔ ”میں نے اس زبیر کے بچے سے بدلہ لینا ہے۔“

”کیسے؟“ عمیر بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

”یہ ترکیب تم لڑاؤ گے۔ فی الحال میں آنٹی کے ساتھ جا رہی ہوں۔ شام کو مجھے ترکیب تیار ملنی چاہیے۔“ وہ دھونس دے کر جو نکلی تو عمیر کو غصہ آ گیا۔

”میرے کیا دماغ میں خلل ہے۔ زندگی میں، میں نے اس سے براہ راست کبھی پنگا نہیں لیا تو میں تمہیں ترکیبیں کہاں سے دوں گا۔ مجھ سے نہیں ہوتیں یہ محاذ آرائیاں۔ میں تو بہت سیدھا سا صلح جو بندہ ہوں۔ جو کرنا ہو، خود ہی کرنا۔“

”اس کا مطلب ہے تم اپنے بھائی سے ڈرتے ہو۔“ وہ عمیر کو اکسا رہی تھی۔

”میں کوئی نہیں ڈرتا اس سے مگر میرے پاس ان فضول باتوں کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔“

”فضول بکواس نہیں کرو، خوامخواہ سر پر چڑھا رکھا ہے تم نے اپنے بھائی کو۔ بچپن سے اس کی ہر شرارت کا جواب منہ توڑ دیتے تو وہ آج یوں حاوی نہ ہوتا۔“

”اطلاعاً عرض ہے وہ کسی پہ حاوی نہیں ہے۔ اسے بس ماما نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ باقی کوئی اسے کچھ نہیں سمجھتا۔“

”آئیڈیا، کیوں نہ ایسا کچھ کریں کہ وہ آنٹی کی نظروں میں گر جائے۔“

”وہ ماما..... کی نظروں میں رہے یا گرے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور تم بھی خوامخواہ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ وہ سدھرنے والی چیز نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ تم سے جلتا ہے۔ اب دیکھنا اسے اور کیسا جلاؤں گی۔“

”ہائے مر گیا، ایک بھی پسلی نہیں بچی ہوگی۔ بلڈوزر! دیکھ کر نہیں چل سکتی۔ کیا کچلنے کا ارادہ تھا۔“

زبیر نے اس قدر آہ و فغاں کی کہ رانی بوکھلا سی گئی پھر جیسے حواس قابو میں آئے تو کہنے لگی۔

”تم نے کیا آنکھیں خیرات کر رکھی ہیں، دیکھ کر نہیں چل سکتے۔“ عمیر کو بڑی ہنسی آئی۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور وہاں سے فرار ہو گیا۔

”کل بھی یہ لوگ کہیں گئے تھے اور آج پھر آخر یہ چکر کیا ہے؟“ وہ کچھ الجھ سا رہا تھا۔

ادھر رانی کیسی میں بیٹھتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

”آج جب ہم لوگ شاپنگ سے فارغ ہو کر گھر جائیں تو میں زبیر کو بتاؤں گی، ہم لوگ عمیر کے لیے لڑکی پسند کرتے پھر رہے ہیں پھر دیکھنا زبیر کا کیا حال ہوگا۔“

پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ رات کو جان بوجھ کر عمیر کے قریب بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرنے لگی۔ عمیر اس کی شرارت اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔

”سچ میں عمیر اتنے لمبے بال ہیں اس کے اور رنگ..... رنگت کسی گلاب کی طرح اور ن دیکھو نا تم..... تو بے ہوش ہی ہو جاؤ.....“

”اب بس بھی کرو رانی! زبیر ہماری طرف ہی دیکھ رہا ہے۔ اگر اس نے ماما سے پوچھ لیا نا ی آ جائے گی۔“

”سچ کہا تم نے، قیامت ہی ہے وہ۔ سچ عمیر! مجھے تو تمہاری زندگی پہ رشک آ رہا ہے۔“

”یہ تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو؟“

زبیر انہیں پراسرار طریقے سے باتیں کرتا دیکھ کر ان کے قریب آ گیا۔

”کچھ نہیں، میں تو عمیر کی تعریفیں کر رہی تھی۔ تم جاؤ نا، ٹی وی دیکھو۔ تمہارے مطلب کا لگا ہوا ہے۔“

زبیر جل گیا۔ ”یہ تو تمہارے سسرالی رشتہ دار ہیں۔ تمہیں اتنا بھی نہیں پتا۔“

”خاطر جمع رکھو، میں تمہارے کہنے میں نہیں آنے والی۔ اپنے اہل خانہ کو تم دیکھو۔“

”میرے اہل خانہ میں میرے پیرنٹس بھی شامل ہیں، بدتمیز لڑکی!“ وہ سچ مچ غصے میں آ گیا۔

”اوہ..... ایم سوری..... میں تو..... آج تک یہی سمجھتی رہی ہوں کہ آنٹی تمہیں کسی چڑیا گھر ں لی ہوں گی۔“

”چڑیا گھر سے میں نہیں تم آئی ہو، موٹی بھینس.....“

”بھینس کے کہا، ہاں.....“ رانی پھرتی سے جو اٹھی تو سامنے ٹیبل سے ٹکرا کر گر گئی۔

زبیر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ رانی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”زبیر! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔“ ربیعہ کی آواز آئی تو زبیر چھلانگ لگاتا باہر نکل گیا۔ رانی سے بددعائیں دیتی رہ گئی۔

☆☆☆

”سچ پوچھیں نا اماں.....! میں تو سخت بددل ہوئی۔ نجانے آپ نے کیوں زمین و آسمان ایک ملا رکھے تھے۔ ناصر کی بیٹی ایسی ہے، ناصر کی بیٹی ویسی ہے، سوائے شکل و صورت کے میں کچھ بھی نہیں ہے۔“

”اور مغرور..... کس قدر ہے، توبہ..... میں تو اس کا لباس دیکھ کر ہی پریشان ہو گئی تھی۔ رایا.....!“

”توبہ..... توبہ.....“ اماں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ پھر ندامت سے بولیں۔ ”بس اب ت کو دل سے منا دینا، شاید یہ ہماری بھول تھی جو ہم نے ایسا سوچا۔“

ربیعہ ہنس پڑی۔

"بھول نہ کہیں، نیکی کہیں اماں جو پہلے ہی سامنے آ گئی، بعد میں بھید کھلتا تو ہم ب
ہوتے اور وہ ہمارے سر پر۔" ربیعہ نے فٹ پاتھ کی طرف اشارہ کیا اور ٹیکسی والے کو پیسے دینے لگ
اماں کے چہرے پہ اور بھی گمبھیرتا پھیل گئی۔

"بس اب زیادہ افسوس نہ کریں، ہمارے بچوں کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔" ر
نے ہاتھ بڑھا کر اماں کو ٹیکسی سے اتارا اور انہیں لے کر گھر کی طرف بڑھی۔

"نہیں، مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ تم اس بات کا ذکر کبھی بھی کسی سے بھی مت کرنا کہ ہم
ایسا ارادہ بھی رکھتے تھے۔"

"کمال کرتی ہیں آپ اماں! بس یہ بات یہیں ختم سمجھیں۔"

دونوں یکے بعد دیگرے گھر میں داخل ہوئیں تو عمیر پتلون کے پائنچے چڑھائے اپن
بائیک دھو رہا تھا جبکہ زبیر اپنی کھوج میں نکلا ہوا تھا جس میں اسے سو فیصد کامیابی ہوئی تھی۔

"تو یہ معاملہ ہے اور ماما نے مجھے بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ضرور یہ فیصلہ
کے لیے ہو رہا ہے، تب ہی مجھے بے خبر رکھا جا رہا ہے۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے، شادی کروں
اریبہ سے، ورنہ کسی سے نہیں۔ اس نے نانی اور ماں کو ناصر انکل کے گھر کے سامنے ٹیکسی سے
دیکھ لیا تھا۔

"عمیر......! زبیر گھر نہیں آیا ابھی تک؟"

"نہیں ماما......! وہ کہہ کر گیا تھا، آج دیر سے آئے گا۔ اس کے یہاں چائنیز گیسٹ
ہیں۔" وہ اپنی بائیک کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔

ربیعہ بھی چادر اتار کر تخت پہ ماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ "رانی کے جانے کے بعد گھر یکدم
سونا سا ہو گیا ہے۔"

نانی نے بے ساختہ کہا تو ربیعہ چونک سی گئی جبکہ موٹر بائیک صاف کرتا عمیر بھی متوجہ ہوا تھا

"فکر نہ کریں نانی! اگلے ہفتے پھر آ جائے گی۔ ابھی پریکٹیکل باقی ہیں اس کے۔"

نانی ہنوز سنجیدہ و متفکر تھیں۔

"تمہاری بیٹی ہوتی تو گھر میں رونق ہی اور ہوتی۔"

ربیعہ ہنس پڑی۔

"زبیر اور عمیر کی دلہنیں جو آئیں گی، وہ بھی تو ہماری بیٹیاں ہوں گی جو مستقل یہیں رہیں گی

"نا جانے کب......" نانی نے ہنکارا بھرا اور یاسیت سے اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ عمیر

ں کی نگاہیں ٹکرائیں تو ربیعہ ہنس پڑی۔

"اماں کو اچانک تمہاری شادی کے ارمان ہو رہے ہیں۔"

"مجھے تو معاف رکھیں، مجھے تو ابھی پڑھنا ہے۔ زبیر کا البتہ ایسا کوئی ارادہ نہیں لگتا۔ آپ
نا شادی کا سوچیں۔" یہی الفاظ سنتے ہوئے زبیر گھر میں داخل ہوا تھا۔

"مجھے فی الحال کسی کی شادی نہیں کرنی، جب تک تم لوگ اپنا فیوچر اسٹرونگ نہیں کر لیتے۔"

(پھر آپ ناصر انکل کے گھر کیوں گئیں؟)

زبیر کی آنکھوں میں سخت شکوہ تھا مگر وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

چند روز وہ اسی کشمکش میں رہا کہ ماما سے بات کرے پھر یہ سوچ کر بد دل ہو جاتا کہ ماما
سے بات چھپا رکھی ہے۔

مگر اس نے سوچا کہ اسے کوئی بات نہیں چھپانا ہے، لہٰذا ربیعہ کے سامنے اپنی خواہش کا
ر دیا۔

ربیعہ دنگ رہ گئی پھر جھنجھلا کر بولی۔ "تم نے ایسا سوچا بھی کیوں۔ کیا تمہارے لیے
کا کال پڑ گیا تھا جو تمہاری نظر اریبہ پہ ٹھہر گئی۔"

"مجھے اریبہ پسند ہے۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

"مگر تمہاری شادی اریبہ سے نہیں ہو سکتی اور آئندہ ایسا سوچنا بھی مت۔" ربیعہ کا انداز
تھا۔

زبیر جھنجھلا گیا۔

"اس انکار کی آخر وجہ کیا ہے؟"

"میرے پاس تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔"

"ہاں البتہ اریبہ کے علاوہ کوئی اور لڑکی تمہیں پسند ہو تو مجھے بتا دینا۔" ربیعہ اس کے
سے نکل گئی۔

"اریبہ کے علاوہ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی، سن لیا آپ نے۔" اسے ہمیشہ والی
ٹ، غصہ اور ضد نے آن گھیرا تھا۔

ربیعہ نے اسے مڑ کر زودیدہ نگاہوں سے دیکھا اور چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔

"ہمیشہ میں تمہاری بات مانتی آئی ہوں مگر یہ نہیں مانوں گی کیونکہ میں جانتی ہوں تمہارے
ملا ہے اور کیا برا۔ اریبہ شکل و صورت کی حسین و جمیل ہے، کوئی بعید نہیں اسے دیکھ کر تمہارا دل
و اور مجھے تم سے ایسی نادانیوں کی توقع ہے کیونکہ جلد بازی تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھری

ہے مگر وہ سیرت کی کتنی بدصورت ہے، تم ہرگز اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اگر تمہارے اندر اتنی مر
ہوتی تو تم یہ پرپوزل مجھ تک پہنچاتے ہی کیوں؟ وہ سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"مے آئی کم ان سر!"

عمیر نے دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا تو آفس میں بیٹھے حضرات یکدم بلا کی خوش اخلاقی اور اپنائیت لہجے میں سمو کر کہنے لگے۔

"عمیر ربانی صاحب! آیئے آیئے، آپ کو بھلا اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا ہی آفس ہے۔"

اس قدر پذیرائی پہ عمیر کا سینہ فخر سے تن گیا اور وہ پراعتماد قدم اٹھاتا ہوا ان لوگو
نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔ اے سی کی کولنگ نے کمرے کو بہت آرام دہ بنا رکھا تھا۔

"بتائیں کیا لیں گے، چائے یا ٹھنڈا" اعجاز وارثی نے اخلاق سے پوچھا تو ع
کنفیوز سا ہو گیا۔

"نہیں سر! شکریہ۔ کچھ نہیں۔"

"مجھے پتا چلا تھا کہ اپروول او کے ہونے کے بعد آپ لوگوں نے ڈرامے کی
آغاز کر دیا ہے، اسی سلسلے میں آیا تھا۔ اسکرپٹ تو پسند آ گیا ہو گا آپ کو۔" عمیر کے لہجے اور
سے کامیابی کی خوشی جھلک رہی تھی۔

کتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے یہ کامیابی حاصل کی تھی۔ بڑے بڑے ڈرامہ نگار رائٹر کی موجودگی میں جگہ بنانا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ یہ واقعی اس کا ٹیلنٹ تھا جو پہلی ہی جست نے اتنی بڑی اڑان بھری تھی۔ عمیر کے سوال پہ یکدم اعجاز وارثی سنجیدہ ہو گیا پھر وہ گمبھیر اور
میں دوسرے شخص سے عمیر کا تعارف کرانے لگے۔

"یہ امیر احمد حجازی ہیں۔" یکدم وہ عمیر سے مخاطب ہوئے تو عمیر اپنی جگہ سے اچھ

"سر...... آپ...... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ سے اس طرح ملاقات
عمیر نے کھڑے ہو کر ان سے مصافحہ کیا۔

"بچپن میں آپ کے ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتا تھا۔ فیوڈل ازم پہ آپ نے
اور بہت اچھا لکھا ہے سر! لیکن...... چند سالوں سے آپ کچھ نہیں کر رہے۔" عمیر نے ایک
میں بہت سے سوال کر ڈالے تھے۔

امیر احمد صاحب ادھیڑ عمر شخص تھے۔ عمیر کے جوش کو دیکھ کر دھیما سا مسکرائے پھر

"ہمارے زمانے میں ڈرامے کی ڈیمانڈ اور تھیں، سابقہ دس بارہ سالوں سے ڈرامہ اپنی ہیئت و ساخت سب کچھ بدل چکا ہے۔ خصوصاً نجی چینلو نے معاف کیجئے گا وارثی صاحب...... سوائے تقلید کے خاص نمایاں کام نہیں کیا۔"

وارثی صاحب سہولت سے اپنی سگریٹ کو ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے مسکراتے رہے۔

جبکہ عمیر چاہتا تھا کہ وہ اپنی صفائی میں ضرور بولیں اور وہ کہے بنا نہ رہ سکا۔

"سر! آپ اس الزام پہ خاموشی اختیار کر کے ثابت کر رہے ہیں کہ واقعی ایسا ہے۔"

وارثی صاحب قہقہہ لگا کر بولے۔

"میں حجازی صاحب سے اس موضوع پر اتنی بحث کر چکا ہوں کہ میرے پاس اب بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"آنے والا وقت ہمیشہ سابقہ وقت سے مختلف ہوتا ہے اور یہ بات ہم سب ہی جانتے ہیں۔ حجازی صاحب کے زمانے میں صرف پی ٹی وی ہوا کرتا تھا۔ خصوصاً آٹھ بجے کا ڈرامہ پوری فیملی دیکھتی تھی۔ اس زمانے میں سوپ سیریل کا تصور تک نہیں تھا تو کام کی نوعیت تو مختلف ہونی ہی ہے نا پھر زمانہ بہت فاسٹ ہے۔ اب کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ پھر نیا ٹیلنٹ، نئے فنکار، نئے رائٹرز، نئی پروڈکشن...... پہلے کوئی لیتا تھا اتنا رسک...... اب ہمارے چینل کو دیکھ لیں، جتنا ڈرامہ ہمارے چینل سے آن ایئر جا رہا ہے، شاید ہی کسی چینل نے ٹیلنٹ کی اتنی پذیرائی کی ہو۔"

"وارثی صاحب! آپ نے میری تنقید کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میں نے صرف تقلید کی بات کی تھی، ترقی کی نہیں۔ چلتا ہوں، امید ہے اس پہلو پہ فرصت میں آپ ضرور سوچیں گے۔" حجازی صاحب کمرے سے نکل چکے تو وارثی نے فائل میز پر پٹخی۔

"یہ جو پرانے لوگ ہوتے ہیں نا، نئے زمانے سے آنکھ ملاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کیونکہ انہیں اپنی شناخت کھونے کا خوف بہت ہوتا ہے۔"

"اور یہ خوف انہیں...... نئے ٹیلنٹ کی پذیرائی سے روکتا ہے۔ اب کون دیکھنا چاہتا ہے حویلیوں کی کہانیاں۔ ہاں۔"

عمیر...... حیرت سے وارثی کا منہ دیکھ رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں وارثی صاحب جانے مانے ڈائریکٹر تھے اور اس وقت سب سے زیادہ نئے ٹیلنٹ کو وہی موقع دے رہے تھے۔ عمیر وہاں اپنے کام کے لیے آیا تھا، اس لیے اس بحث سے گریز کرتے ہوئے بولا۔

"چھوڑیں سر! اس بحث کو، میں جاننا چاہتا تھا۔ ڈرامے کو کتنی اقساط تک لے جانے کا

ارادہ ہے۔"

عمیر کے لہجے میں خوشی و ہچکچاہٹ دونوں ہی پنہاں تھیں۔

وارثی نے بغور عمیر کو دیکھا پھر نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے۔

"اسکرپٹ تمہارا بہت ڈھیلا ہے، اسٹوری بہرحال مضبوط تھی، اس لیے ہمیں اسکرپٹ رائٹر دوسرا لینا پڑا ہے۔" عمیر یکدم ڈھیلا پڑ گیا۔

"مگر..... سر.....! آپ تو کہہ رہے تھے اسکرپٹ بہتر طور پر وہی لکھ سکتا ہے جس نے اسٹوری لکھی ہو۔" عمیر کا جیسے دل ٹوٹ گیا تھا۔

"اسٹوری تمہاری بے شک اچھی ہے لیکن کہانی اسکرپٹ پہ کھلتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں جتنی اچھی تم کہانی لکھ سکتے ہو، اتنا اچھا اسکرپٹ نہیں لکھ سکتے۔"

عمیر کے پاس اب بولنے کو کچھ نہیں تھا۔

"اپنی وے۔ ڈرامے کی تیاری میں تو ابھی مرحلہ وار بہت سی الجھنیں ہیں۔ ان شاء اللہ بہترین اسکرپٹ رائٹر کی صلاحیتوں سے ہم آپ کی کہانی میں چار چاند لگا دیں گے۔"

(یعنی کہ میری صلاحیتوں کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں) اس نے سوچا۔

"پھر سر.....! آپ مجھے ایک قسط کا کتنا معاوضہ دیں گے۔"

وارثی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

عمیر کو یک دم احساس ہو گیا کہ اس سوال میں شاید اس نے ضرورت سے زیادہ عجلت سے کام لیا ہے۔

"میں شاید آپ کو بتا چکا ہوں، کہانی صرف آپ کی ہے، اسکرپٹ ہم نے بڑے مجھے ہوئے رائٹر سے لکھوایا ہے۔ آپ کی کہانی کا جو حق ہوگا، وہ ہم آپ کو ضرور دیں گے۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر دے جائیں، میں چیک بھجوا دوں گا۔"

عمیر نے اسی پہ اکتفا کیا اور اکاؤنٹ نمبر دے کر باہر آ گیا۔ اب وہ خود کو تسلیاں دے ر تھا۔ "پہلی بار ہے، کوئی بات نہیں۔ ایک بار ڈرامہ دیکھ لوں، ساری تکنیک سمجھ میں آ جائے گی۔"

"اوئی..... ماں....." اچانک اسے ٹھوکر لگی تو گرتے گرتے سنبھل گیا پھر خود پہ ہنسی آنے لگی۔

"یہ شہرت کا نشہ بھی انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔" وہ خود کو سرزنش کرتے ہوئے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"تمہارے بغیر گھر بالکل ہی سونا سونا ہو گیا تھا، حالانکہ تم چند دن ہی رہ کر گئی ہو مگر تمہاری عادت ایسے ہو گئی جیسے تم عرصہ سے ہمارے ساتھ رہا کرتی تھی۔"

"ہائے اللہ آنٹی! یہ تو آپ کا اپنا پن ہے، محبت ہے جو مجھے دوبارہ کھینچ لائی۔ سچ میں امی کہہ رہی تھیں، پریکٹیکل کو گولی مارو، روز روز تھوڑا ہی کسی کے یہاں اس طرح ٹھہرا جاتا ہے مگر میں امی کو بتایا۔ آپ اتنی اچھی ہیں، اتنی اچھی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ میرا تو دل کرتا ہے میں یہاں سے ہل ہی نا۔"

"تو پھر رہ جاؤ یہیں۔" ربیعہ کے لبوں پہ انجانی سے خواہش مچلی تو رانی جھینپ سی گئی اور ہنسی سے بولی۔

"ایک نہ ایک دن تو یہاں سے جانا ہی پڑے گا نا۔"

احمد کے خیال سے ہی وہ لال ہو جایا کرتی تھی۔ ربیعہ ہنس پڑی۔

"بڑی جلدی ہے تمہیں احمد کے پاس جانے کی۔"

"آپ بھی ناں!" رانی لپک دار شاخ کی طرح ربیعہ سے لپٹ گئی۔ ربیعہ کے دل سے دعا نکلی تھی۔

اسی وقت زبیر گھر میں داخل ہوا، وہ رانی کو دیکھ کر ٹھٹکا پھر چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ آج کل اس کا رویہ ربیعہ سے خاصا سرد ہو رہا تھا۔ ربیعہ کو بھی اس کی ناراضی کی کوئی پروا نہیں تھی۔

"خیر ہے، یہ زبیر ہی تھا نا آنٹی.....! اسے یک دم کیا ہوا۔ اس کی بولتی کیسے بند ہوئی؟"

"چھوڑو اسے، یہ تو ایسا ہی موڈی ہے۔ تم فریش ہو جاؤ، لمبے سفر سے آئی ہو، تھک گئی ہو کھانا تیار ہے، کھانا وانا کھا لو۔" ربیعہ نے مسکراتے ہوئے اس کی توجہ ہٹائی تھی۔

☆☆☆

کھانے کے بعد وہ عمیر سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن عمیر اپنی ہی ادھیڑ بن میں کھانا کھا کر جلد ہی سونے چلا گیا۔ ٹی وی والوں نے اگلے ہی روز دس ہزار کا چیک بھیجا تھا جس پہ دنگ رہ گیا تھا۔

"اتنا کم....."

وہ اعجاز وارثی سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن دو بار چکر لگانے پہ بھی وارثی صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

اس وقت وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

زبیر کی طرح وہ بچپن سے ہی مما سے ہر بات ڈسکس نہیں کرتا تھا، نہ ہی اس نے ایسے دوست بنائے تھے جن سے اپنا راز شیئر کر سکتا۔ نانی اس سے حد درجہ الفت رکھتی تھیں لیکن اس کے مسائل

کو نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ ہمیشہ اس نے کتابوں سے محبت کی تھی اور پھر رفتہ رفتہ قلب کو اپنا دوست بنالیا تو کیسے دوست تھے یہ جو اس کی مدد نہیں کر سکتے، وہ پژمردہ سا بستر پہ لیٹا تھا کہ نانی کمرے میں آگئیں

''ادھر زبیر کا منہ بنا ہوا ہے اور ادھر تمہارا۔ آخر اس گھر میں ہو کیا رہا ہے؟''

''کچھ نہیں نانی.....! آپ تو یونہی پریشان ہو جاتی ہیں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

نانی نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔

''بات تو ضرور کچھ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تم نہ بتاؤ۔ کہیں زبیر کا اور تمہارا جھگڑا تو نہیں ہوا؟'' عمیر ہنس پڑا۔

''جتنی لڑائیاں کرنی تھیں، ہم نے بچپن میں ہی کر لی تھیں۔ اب ہمارے درمیان تو اس بات چیت بھی نہیں ہوتی، جھگڑا تو کیونکر ہوگا۔''

''ہاں' یہی بات تو مجھے بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ بچپن میں تو سب ہی بچے لڑتے ہیں، بڑے ہو کر اس طرح ایک دوسرے سے دور دور نہیں ہوتے۔ ایک مشرق تو دوسرا مغرب۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

''مگر یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔'' رانی نے اچانک آکر مداخلت کی تو نانی اور عمیر دونوں چونک پڑے۔

''عادتیں سب ہی کی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں مگر عادتوں کی بنا پر ہم دوسرے سے دور تو نہیں ہو جاتے۔ عادت مختلف ہونے سے کیا محبت جنم نہیں لیتی مجھے ایسا لگتا ہے دونوں بھائیوں میں بالکل بھی محبت نہیں ہے۔''

''یہ آپ..... محترمہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' عمیر چڑ سا گیا تھا۔

''اس لیے کہ تمہارے رویے ایسے ہیں، تمہیں نانی سے محبت ہے اور زبیر کو اپنی ماما سے۔''

''بے فکر رہو، ایسا کچھ نہیں ہے اور تم ان فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ صبح تمہارا پریکٹیکل ہے، اس پر دھیان دو۔'' یہ کہہ کر عمیر نے دودھ کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

نانی اور رانی کے جانے کے بعد اسے اس چیز کا واقعی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ زبیر سے بہت دور ہے۔ وہی نہیں، زبیر بھی اس سے بہت دور اور الگ تھلگ سا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

اس میں صرف زبیر کا ہی نہیں اس کا اپنا بھی کردار تھا۔ ہمیشہ اسے زبیر سے مختلف اور الگ بن کر رہنے کا شوق تھا۔

تبھی تو تعریفیں اس کے حصے میں آتی تھیں۔ اگر وہ بھی زبیر کی طرح زندگی گزارتا تو پڑھائی میں اچھا ہوتا اور نہ ہی سب کا نور نظر۔ کیا ہوا' ایک فقط زبیر سے انڈر اسٹینڈنگ نہیں۔ باقی

خاندان اس پہ فریفتہ اور نہال ہے نا اور یہ بات اس کے لیے کس قدر تقویت کا باعث تھی۔ وہ سوچتے ہوئے گہری نیند سو گیا۔

☆☆☆

کروٹیں بدل بدل کر اس کا جسم بھی دکھنے لگا تھا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اتنا سخت رویہ تو اس سے ماما نے کبھی نہیں برتا تھا جتنا اب تھا۔

سوچ سوچ کر اس کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ پیاس کی شدت سے حلق سوکھنے لگا تو وہ پانی پینے کی غرض سے بستر سے اٹھ گیا۔ فریج سے پانی پینے کے لیے لاؤنج کی طرف گیا تو ربیعہ کے کمرے کی لائٹ جلی ہوئی تھی اور وہ شاید رو رہی تھی۔

یکدم زبیر کے قدم وہیں رک گئے۔

''عدیم! بس آپ آجائیے، میں تھک گئی ہوں۔ زبیر نے آج کل بہت پریشان کر رکھا ہے۔ نہ تو وہ مجھ سے بولتا ہے اور نہ ہی گھر پر کھانا کھاتا ہے۔ ایک بے وجہ کی ضد..... بتائیے، میں اس کا برا کیوں چاہوں گی۔ آپ اسے سمجھائیں' اس خواہش کے سبب کہیں وہ ہم سے بہت دور نہ ہو جائے۔''

عدیم نے ربیعہ سے کیا کہا، وہ نہیں سن سکا۔ البتہ چند ہی سیکنڈ بعد فون بند ہو گیا تو نانی کی کرخت آواز ابھری۔

''ساری زندگی اس خوف کو سینے سے چمٹائے رکھا اور اولاد سے بلیک میل ہوتی رہیں۔''

''اماں! آپ نہیں سمجھ سکتیں ان باتوں کو۔'' ربیعہ' ماں سے چھپانا چاہ رہی تھی، تب ہی نانی مستحکم لہجے میں کہنے لگیں۔

''میں نے تمہاری ساری گفتگو سن لی ہے۔''

''اور اب سمجھ میں آیا مجھے، تمہارے صاحبزادے کا منہ کیوں بنا ہوا ہے اور یہ سب تمہارے بوئے ہوئے بیج ہیں۔ اماں نے حسب معمول شکایت کی پٹاری کھولی تو ربیعہ نے شکوہ کناں نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

''ساری عمر ہو گئی، آپ مجھے ہی مورد الزام ٹھہراتی آئی ہیں۔ بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' ربیعہ پھٹ پڑی۔

''قصور تمہارا ہی ہے، ہمیشہ جو چیز عمیر کے لیے پسند کی جاتی تھی، زبیر وہی پسند کرتا، کبھی تم نے اپنے لاڈلے کو اس ضد پہ نہیں روکا۔ الٹا اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔''

''میں اپنے بچے کو دکھانا نہیں چاہتی تھی اماں! یہ بات میں آپ کو کیسے سمجھاؤں اب بھگت رہی ہوں نتیجہ۔ ضرور، اس کے کان میں بھنک پڑ گئی ہو گی کہ ہم نے ایسا سوچا تھا اور بس اس نے

بنا سوچے سمجھے یہ ضد باندھ لی جبکہ ہم اس رشتے کو سوچنا بھی نہیں چاہتے۔"

"اگر پھر بھی تمہارے بیٹے کی یہی ضد ہے تو لے آؤ، ایسی خود سر اور بدتمیز لڑکی جو گلے میں لٹکے گی تو دو دن میں اڑیل پنا بھول جائے گا اور میں تو کہتی ہوں، اس کی ایسی ہی سزا ہونی چاہیے۔

اپنے لاڈلے کو سمجھاؤ بی بی! یہ کوئی شرٹ یا کھلونا نہیں جس پہ عمیر ہاتھ رکھے گا اور تم وہی پہنو گے اور جو تمہیں پہلے دیا جائے گا، تم اسے کمتر سمجھ کر پھینک دو گے۔"

"اپنا لے وہ اریبہ کو، میں کل ہی سوال ڈال آؤں گی۔"

"زبیر، اریبہ کو چھوڑ دے گا اور اسی لڑکی کو پسند کرے گا جو عمیر کے لیے منتخب ہوگی اور آخر کب تک چلے گا ایسا۔ بی بی! ابھی فیصلے ہونے ہیں، اب وہ بچے نہیں ہیں، جنہیں بہلانے کے لیے ایک کا گھر توڑو گی اور دوسرے کا بساؤ گی۔"

اماں کی کڑوی کسیلی سے ربیعہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ رونا دھونا سب کچھ بھول گئی تھی، یاد رہا تھا تو صرف یہ کہ زبیر کی عادتیں پختہ کرنے میں کس کا ہاتھ ہے؟

اماں جوتیاں گھسیٹتی کمرے سے نکلنے لگیں تو زبیر جو ندامت و خفت سے دوچار، دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ فوراً دوسری طرف کھسک گیا۔

کوریڈور میں سامنے ہی دیوار گیر آئینہ لگا تھا جس میں زبیر کو اپنا سراپا نظر آ رہا تھا۔ کم روشنی میں دھندلا دھندلا سراپا۔ وہ ایسا کیوں کرتا رہا ہے؟ وہ خود سے سوال کر رہا تھا صرف عمیر کو نیچا دکھانے کے لیے مگر اس طرح سب کی نظروں میں اس کا کیا امیج بن رہا ہے۔ اس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں۔

"آخر کب تک ماما مجھے ان حرکتوں سے دل میں رکھتیں، بالآخر آج میں ماما کی نظروں سے بھی گر گیا ہوں۔"

وہ کمرے میں آ کر بے جان سا بستر پہ گر گیا۔ دھونس دھاندلی سے کوئی کسی کے لیے پیارا نہیں ہو سکتا اور آج مجھے سمجھ میں آ گیا۔ میں بہت برا ہوں، بہت ہی برا۔ سوچتے سوچتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

دن رات ٹی وی اسٹیشن کے چکر لگا لگا کر عمیر کی حالت پتلی ہو گئی تھی مگر اسے وارثی صاحب مل کر ہی نہیں دے رہے تھے۔ نجانے وہ جان بوجھ کر چھپ گئے تھے یا واقعی اپنے سیریل کی شوٹنگ کے سلسلے میں ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ دن بدن وہ بددل ہوتا جا رہا تھا پھر اس نے یہی ارادہ کیا کہ وہ چینل والوں سے اپنی کہانی واپس لے لے گا اور دس ہزار ان کے منہ پہ مار دے گا۔

مگر یہ کیا آج اچانک اس کی نگاہ ٹی وی اسکرین پہ پڑی تو ایسے لگا جیسے یہ کردار تو اس نے تخلیق کیے تھے۔ چہرے اور تھے مگر بول وہی کچھ رہے تھے جو اس نے لکھا تھا۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا مگر محویت سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شہریار ہی تھا اس کے ہیرو کا نام، ناجیہ اس کی ہیروئن تھی جو اندھی تھی مگر یہ کیا...... ناجیہ کو ڈھونڈنے سے قبل ہی کمرشل بریک نے اس کا ہیجان اور بڑھا دیا۔ پانچ منٹ قیامت بن کر گزرے۔ شہریار کسی اور کے ہیرو کا نام بھی تو ہو سکتا ہے مگر ایسے ہی جملے تو میں نے بھی لکھے تھے، وہ کشمکش سے دوچار تھا۔ کمرشل بریک ختم ہوا تو ڈرامہ شروع ہو گیا۔

"ناجیہ...... ناجیہ...... بیٹی کہاں ہو تم؟" عمیر کا رواں رواں آنکھ بن گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا یہ اس کی تخلیق ہے۔ اچانک اندھی لڑکی ہاتھوں سے فاصلے ناپتی ہوئی ٹی وی اسکرین پر براجمان ہوئی۔ عمیر کا خوشی سے برا حال تھا۔

"دادی...... آپ بھی ہر وقت شور مچائے رکھتی ہیں۔" ناجیہ سے پہلے عمیر نے جملہ ادا کیا تو کھانا کھاتے ہوئے سب کی توجہ عمیر اور پھر ٹی وی پہ ٹھہر گئی۔

پھر ناجیہ نے وہی جملہ ادا کیا۔

"اب تم ہی بتاؤ، تمہارے بغیر کیسے جی پاؤں گی؟"

دادی سے پہلے عمیر نے جملے بولے پھر فنکارہ نے وہی جملے دوہرائے تو عمیر خوشی سے کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"نانی...... ماما...... زبیر...... دیکھو یہ میرا پلے ہے۔ یہ ڈرامہ...... میں نے لکھا ہے...... ہو بہو اور وہ ڈائریکٹر کہہ رہا تھا کہ اسکرپٹ کسی اور سے لکھوایا ہے لیکن ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہیں ہوا۔"

"ہائے عمیر...... یہ پلے تم نے لکھا ہے۔" ربیعہ کھانا چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ربیعہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

نانی بھی عمیر کے قریب آ گئیں، اس سے قبل زبیر بھی بے توجہی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا، اس اطلاع پر وہ بھی ٹی وی اسکرین کے قریب آ گیا۔ واقعی یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ عمیر کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ وہ بھی اشتیاق سے دیکھنے لگا تھا۔ سب بے ساختہ ٹی وی کے سامنے ایسے کھڑے ہو گئے تھے جیسے ون ڈے میچ کا آخری فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ ڈرامے کا نام گو مختلف تھا مگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جیسے خوشی سے ناچنے کو تھا اور ٹی وی کے اور نزدیک آ گیا۔ وہ سب عمیر ربانی کا نام دیکھنے کے مشتاق تھے۔

لیکن یہ کیا رائٹر کوئی اور۔ اسکرپٹ رائٹر کوئی اور...... ہاں البتہ ڈائریکٹر اعجاز وارثی ہی

تھے۔ عمیر کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا اس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ بھی ہو سکتا ہے۔

یکدم جو اس کا چہرہ خوشی سے سرخ پڑا تھا، زرد پڑ گیا تھا۔ ٹانگوں سے جان نکلنے لگی تھی۔

''یہ تو کوئی اور رائٹر ہے عمیر!'' ربیعہ نے حیرانی سے عمیر کی طرف دیکھا جس کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔ ہونٹ باہم سِل گئے تھے۔

''ماما! یہ میرا ہی پلے ہے۔'' عمیر بہ وقت تمام بولا تھا۔

''مگر...... اتنا بڑا دھوکہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔'' زبیر ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''میں آپ لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں کہ یہ میرا ہی پلے ہے۔'' وہ روہانسا ہو گیا اور ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

''تم نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔''

''مجھے اندازہ ہی نہیں تھا ماما......!'' بے حد دلگرفتہ تھا۔

''ستیاناس ہو ایسے لوگوں کا۔ کیسا میرے معصوم بچے کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔'' وہ کوسنے دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھیں۔

البتہ زبیر چپ تھا اور سوچ رہا تھا، اگر آج دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے تو عمیر خود کو اتنا کمزور اور اکیلا محسوس کر کے دکھی نہ ہوتا۔

آج عمیر کو بھی اس خود پسندی کا احساس بہت شدت سے ہو رہا تھا، وہ ذہانت میں اول تھا لیکن طاقت میں ادھورا۔

اور انسان کی طاقت اس کے گھر سے مکمل ہوتی ہے۔ دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے گھر کی طاقت درکار تھی۔

زبیر نے بہت دیر کے بعد مداخلت کی پھر عمیر کے قریب بیٹھ گیا۔

''افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم فوراً چینل کے ڈی پی او کو آگاہ کرو۔ اگر وہ لوگ نوٹس نہیں لیتے تو ہم دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔''

''مگر اس کے لیے مجھے خود وہاں جانا پڑے گا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ وہاں جاؤں۔''

''کیوں؟ تمہاری ہمت کہاں چلی گئی؟'' زبیر نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا تو عمیر نے چہرہ اٹھایا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں، دیکھتا ہوں کون تمہارے حق پہ ڈاکہ ڈالتا ہے۔''

دونوں ٹی وی چینل پہنچے تو راستے میں ہی اعجاز وارثی سے ملاقات ہو گئی۔ ڈی پی او تک کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اعجاز وارثی بہت جلدی میں دکھائی دے رہے تھے۔ عمیر ان کے سامنے ٹھہر گیا۔

''سر! میں نے ابھی ابھی ڈرامہ دیکھا ہے۔ آپ تو کہہ رہے تھے اسکرپٹ رائٹر چینج ہوا بلکہ آپ نے تو کہانی نویس کا نام بھی بدل ڈالا ہے۔ سر......! وہ کہانی تو من و عن میری ہے۔''

''کیا نام ہے آپ کا؟'' اعجاز وارثی کے سوال پر عمیر ہی کیا زبیر بھی دنگ رہ گیا۔

''سر......! عمیر ربانی......''

''اوہ...... اچھا...... آپ میرے آفس میں آئیے۔''

دونوں پیچھے پیچھے چلتے ہوئے آفس میں آ گئے۔

''آپ نے ہمیں کہانی کے حقوق دے دیے تھے نا!'' اعجاز وارثی کا انداز خاصا لاپروا تھا۔

''ہاں دیے تو تھے لیکن......'' ابھی عمیر کچھ بولتا کہ وارثی نے بولا۔

''پھر اب کیا مسئلہ ہے۔'' وارثی بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

''مگر...... سر......!'' عمیر کے الفاظ گلے میں ہی گھٹنے لگے۔

وارثی اس کے کاندھے پہ تھپکی دیتے ہوئے بولا۔

''پہلی بار میں ہی انسان کو سب کچھ نہیں مل جاتا، کوشش کرو آئندہ ہم لوگ تمہارا نام بھی لیں گے۔'' عمیر سے سر اٹھایا ہی نہ گیا۔ اب زبیر کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

''فنکار تخلیق کے حقوق اپنے نام کے بنا نہیں دیتا۔ آپ نے کیسے عمیر ربانی کی جگہ کہانی کسی اور کو ظاہر کیا۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ آپ کو نہ صرف اس کا ہرجانہ ادا کرنا ہوگا بلکہ چینل معافی بھی مانگنا پڑے گی۔''

''یہ کون ہے؟'' وارثی کی بھنویں اچک گئیں۔

''میرا بھائی ہے سر!''

''دیکھو نوجوان، یہاں کھڑے ہو کر مجھے دھمکیاں دینے کے بجائے اپنے بھائی کو حوصلہ دو ہانے کیا کیا خواب دیکھ رہا ہے۔''

''خواب آپ دیکھ رہے ہیں سر!'' زبیر گھوم کر سامنے آ گیا۔ ''ابھی اور اسی وقت آپ اپنی مطلع کر دیجیے کہ اس غلطی کو درست کر لیں، ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' وارثی کو بھی غصہ آ گیا۔

زبیر آگے کی طرف بڑھا، عمیر نہ پکڑتا تو دونوں گتھم گتھا ہو جاتے۔ عمیر کھینچ کھانچ کر زبیر کو

باہر لے آیا۔

''یہاں ٹی وی چینل پر لڑو گے تم...... دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔'' وہ جلد از جلد اسے سے نکال کر لے جانا چاہتا تھا۔

زبیر کا دماغ گھوم چکا تھا، وہ باہر نکل تو آیا مگر دل میں ٹھان کر نکلا تھا کہ اس شخص سے عمیر کا حق نکلوا کر ہی رہے گا۔ کل تک تو اس کی سوچ صرف عمیر پہ احسان کرنے کی تھی مگر آج اسے شدت سے احساس ہوا تھا عمیر اور وہ دو نہیں ہیں۔ یہ عمیر کا ہی نہیں اس کا ذاتی انا کا بھی معاملہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

ابھی وہ اس معاملے کو حل بھی نہیں کر پائے تھے کہ درمیان میں ایک قیامت خیز حادثہ رونما ہو گیا۔ خبر ٹی وی چینل پر نشر ہوئی تھی اور دن بھر تمام چینلز اس خبر کو دکھاتے رہے تھے۔ احمد کی اچانک موت نے ان سب کو دم بخود کر دیا تھا۔ نماز جمعہ میں ایک خودکش بم دھماکے میں جہاں بہت سے بے گناہ معصوم مسلمان شہید ہوئے تھے، انہیں میں احمد بھی موجود تھا جو چپ چاپ ظالموں کے ظلم نشانہ بن کر ان کی کو زندگی کو بیابان کر گیا تھا۔

رانی سہاگن بننے سے قبل ہی اجڑ گئی تھی۔

گاؤں والوں کی توہم پرستی سے کون واقف نہیں تھا۔

ربیعہ، عمیر اور زبیر کے ہمراہ عاقلہ کے گھر پہنچی تو وہاں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ عاقلہ ندیم جوان بیٹے کی اچانک موت پہ پاگل ہوئے جا رہے تھے اور یہ واقعی غم کا مقام تھا۔ بھلا وہ تسلیاں دیتی، عاقلہ کے نزدیک ہی بیٹھ گئی کہ اچانک اس کی نگاہ رانی پہ پڑی جو سکتے کی سی کیفیت میں ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ جاہل عورتیں طرح طرح کی باتیں بنا رہی تھیں جو رانی کا غم کم کرنے کے بجائے اس کی روح کو لہولہان کر رہی تھیں۔

بجیلہ نے علیحدہ تماشا کر رکھا تھا، وہ اپنی بیٹی کے نزدیک ہی بیٹھی تھی اور رو رو کر اپنی کی قسمت کو کوس رہی تھی۔ ربیعہ پہلے ہی غم سے نڈھال تھی، اوپر سے یہ تماشا دیکھ کر اس کا دل سے بھر گیا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو بجیلہ کو روکتا، اسے سمجھاتا۔ بجائے اپنی بیٹی کا غم بانٹنے کے وہ اسے مورد الزام ٹھہرا رہی تھی۔

ربیعہ احتجاجاً آگے بڑھی لیکن رانی نے جیسے ہی ربیعہ کو دیکھا، چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ رانی پاگلوں کی طرح رو رہی تھی۔ خواتین کی آنکھوں میں رانی کے لیے ہمدردی بھی تھی اور آنسو بھی۔

لیکن زبان رانی کو ہی بدبخت کہہ رہی تھی۔ ربیعہ، رانی کو لے کر اندر کمرے میں آ گئی۔

تین دن ربیعہ کے وہاں بے حد اذیت میں گزرے تھے۔

احمد کی تدفین کے بعد سے ہی عاقلہ کا رویہ بہن اور بھانجی سے اکھڑا اکھڑا سا ہو گیا تھا۔

سوئم کے بعد جہاں سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوئے، وہیں ربیعہ نے بھی اجازت چاہی۔ ربیعہ سے پہلے بجیلہ، رانی کو لے کر عاقلہ سے ملنے کے لیے اٹھی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

''اس بدبخت کو اپنے سینے سے لگا لے عاقلہ......! تین دن سے یہ غیروں کی طرح تیرے گھر میں بیٹھی ہے، شاید تیرے پیار سے اسے صبر آ جائے۔'' بجیلہ نے رانی کو عاقلہ کی طرف بڑھایا تو عاقلہ نے اسے دھتکار دیا اور چلا کر بولی۔

''لے جا اس منحوس کو یہاں سے۔ ہاں تیری بیٹی منحوس ہے آپا! یہ اپنے باپ کو بھی کھا گئی اور اس کی وجہ سے تیرے ہاں کوئی بیٹا بھی پیدا نہ ہوا۔ ہائے مجھے کیا پتا تھا، گاؤں والے جو کہتے ہیں، وہ سچ ہی ہو گا۔ میرے بیٹے کو بھی کھا گئی۔ ہائے میرا احمد...... ہائے میرا احمد......''

ربیعہ آگے بڑھی اور عاقلہ کو سمجھانے لگی۔ بجیلہ مبہوت کھڑی تھی۔

پھر غصے میں بیٹی کو لے کر گھر سے نکل گئی۔ عمیر اور زبیر کو بھی سخت غصے اور کوفت نے آن گھیرا تھا۔

زبیر اور عمیر کو بھی چاچا چاچی کے خیالات جان کر بڑا گہرا رنج پہنچا تھا۔

مگر سب کا خیال تھا وقت کے ساتھ ساتھ عاقلہ سنبھل جائے گی لیکن ایسی صورت حال سامنے نہیں آئی۔ چہلم تک ربیعہ آتی جاتی رہی، وہاں سب ہی آتے تھے لیکن اس کے بعد سے ربیعہ نے بجیلہ اور رانی کو نہ دیکھا۔

☆☆☆

ربیعہ بہت دن سے چکلالہ جانے کا سوچ رہی تھی۔ مگر طبیعت ساتھ ہی نہ دیتی تھی۔ اسی دوران عمیر کا اپائنٹمنٹ لیٹر آ گیا۔ عمیر کے جانے کے بعد گھر میں ویرانی اور بھی بڑھ گئی۔ زبیر کی بھی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔

ربیعہ جانے کا سوچتی اور پھر رہ جاتی۔ سوئے اتفاق، بجیلہ خود ہی رانی کو لے کر آ گئی۔

ربیعہ نے رانی کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ رانی وہ گل رانی ہی نہیں لگ رہی تھی۔ تین ماہ میں گل بجھ کر رہ گئی تھی۔ نہ وہ صحت رہی تھی اور نہ ہی رنگ و روپ۔ ہر وقت کھلکھلاتی ہوئی رانی۔ ہنستا تو رکنا اب تو بولتی بھی نہیں تھی۔

''آپ نے اسے غم کی مورت کیوں بنا دیا ہے بجیلہ آپا!'' ربیعہ تڑپ اٹھی تھی۔

بجیلہ خود بھی جیسے ٹوٹ چکی تھی۔ ''کہاں چھپاؤں اسے میں؟'' بجیلہ رونے لگی تھی۔

''تم خود ہی بتاؤ ربیعہ...... تنگ آ گئی ہوں میں لوگوں کے طعنوں سے۔ سب جانتے ہیں

اکلوتی ہونے کی وجہ سے کتنے ناز و نعم میں پلی تھی میری بچی مگر بڑے ہوتے ہوتے اس کی قسمت اتنی خراب ہو جائے گی، مجھے کیا پتا تھا۔"

"کیں کہتی ہیں آپ کہ اس کی قسمت خراب ہے۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے اور اس میں رانی کا کیا قصور ہے۔ آئے دن اس ملک میں ایسے ہی واقعات ہو رہے ہیں۔ کوئی اصلی مجرموں تک کو مجرم نہیں کہتا اور یہاں آپ لوگوں نے معصوم، بے گناہ رانی کو مجرم بنا کر رکھ دیا ہے۔"

رہیجہ نے رانی کو گلے سے لگا لیا۔ رہیجہ کو رانی سے عجیب سی انسیت و محبت سی ہو گئی تھی۔

"لوگ کون ہوتے ہیں اسے طعنے دینے والے۔ وہ جاہل لوگ ہیں۔ وہ اللہ کو نہیں جانتے، اس لیے ایسا کرتے ہیں اور اس میں سب سے بڑھ کر قصور تو آپ کا ہے، آپ خود ہی اپنی بیٹی کی قسمت کو کوس رہی ہیں پھر عاقلہ بھابھی نے جو کچھ بھی کیا، وہ بھی اچھا نہیں کیا اس طرح تو یہ جیتے جی مر جائے گی۔ آپ سب کو..... صرف احمد سے محبت تھی، اس سے نہیں۔" رہیجہ جذباتی ہو گئی تھی۔ رانی گم صم سی بیٹھی تھی۔

رہیجہ نے رانی کی طرف دیکھا۔

"اور تمہیں صرف احمد کی محبت نے زندہ رکھا ہوا تھا؟ کیا ہم لوگ تم سے محبت نہیں کرتے؟" رانی کچھ نہیں بولی۔ "کیا صرف احمد ہی تمہارا اپنا تھا۔" رہیجہ کا اتنا کہنا تھا کہ رانی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ رہیجہ خود بھی رو رہی تھی اور بجیلہ بھی۔

"آپ اسے کچھ دن کے لیے میرے ہاں چھوڑ دیں بلکہ میں تو کہتی ہوں، آپ بھی یہیں رک جائیں۔ احمد کا غم بھلا دینے والا تو نہیں ہے لیکن وقت سب سے بڑا مرہم ہے، وقت کے ساتھ ساتھ اللہ حوصلہ دے ہی دیتا ہے۔"

رہیجہ کی یہ بات صحیح تھی۔ بجیلہ کچھ دن رکی پھر اسے جانا پڑا جبکہ رانی کو رہیجہ اور نانی نے زبردستی روک لیا تھا۔ رانی کچھ دن تو رکی پھر جلد ہی بجیلہ اسے لے گئی۔ گو کہ رانی کے انداز و اب چہکار نہیں تھی مگر اس کے جانے کے بعد گھر میں ویرانی سی پھیل گئی تھی۔

عمیر کا فون آیا تھا، وہ بہت خوش تھا۔ رہیجہ کو مبارک باد دے رہا تھا۔

"بھلا کس چیز کی؟" رہیجہ کچھ نہیں سمجھی تھی۔

"ماما! زبیر نے اخبار میں خبر اس طرح لگوائی ہے کہ ڈرامے سے زیادہ شہرت مل گئی ہے مجھے۔ دھڑا دھڑ دوسرے ٹی وی پروڈیوسرز کے فون آ رہے ہیں۔"

"اور وہ ڈرامہ..... جو تم بتا رہے تھے کہ تم نے لکھا تھا۔"

"ہاں ماما..... وہ بھی بن ہو گیا ہے۔"

"اور یہ سب زبیر کی وجہ سے ہوا ہے، ورنہ..... میں اکیلا تو کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ سچ زندگی میں پہلی بار شدت سے احساس ہوا ہے۔ اگر ہم دونوں مل کر ساتھ چلتے تو شاید اور بھی کامیاب ہوتے۔ اس کامیابی پر تو میں کھلے دل سے اعتراف کر سکتا ہوں کہ میری اس کامیابی کا سہرا زبیر کے سر پر ہے۔" عمیر ہنس رہا تھا۔

"اچھا..... اور سنائیں، رانی کا کیا حال ہے؟" عمیر نے موضوع بدل دیا تھا۔ رہیجہ اُلجھی چپ رہی۔

"کیا بات ہے ماما! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"آں..... ہاں..... میں ٹھیک ہوں اور رانی پچھلے ہفتے ہی چلی گئی تھی۔"

"یہ کیا..... آپ نے اسے جانے کیوں دیا، کچھ دن اور تو روکتیں۔"

"بس..... وہ بجیلہ آپا نہیں مانیں۔ کہہ رہی تھیں رانی کو یہاں چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔"

"لو بھلا یہ کیا بات ہوئی؟"

"اس بحث کو چھوڑو، یہ بتاؤ کب آ رہے ہو؟"

"کچھ پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے اگلے ماہ یا پھر اس سے بھی زیادہ۔" رہیجہ یکدم بے چین ہو گئی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ہفتے میں ہی آ جاؤ۔"

"خیر ہے ماما..... ایسی کون سی ایمرجنسی آ گئی؟"

نانی نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا تو رہیجہ چونک گئی۔

پھر نانی نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا اور عمیر کا حال احوال لے کر فون بند کر دیا۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں تم عمیر کا انتظار اس قدر بے چینی سے کیوں کر رہی ہو؟"

"کیا میں غلط سوچ رہی ہوں۔" رہیجہ نے ماں کی طرف دیکھا تو انہوں نے اثبات میں ہلا دی۔

"دراصل یہ عدیم ہی کا مشورہ ہے۔ گو کہ میری نیت پوری تھی لیکن عدیم کے مشورے نے پورا تقویت دی ہے۔"

"یہ تو سب سے اچھی بات ہے پھر پریشانی کس چیز کی؟"

"مگر اماں! میں عمیر سے پوچھ تو لوں..... کہیں وہ....."

"کیسی باتیں کر رہی ہو رہیجہ! عمیر نے کبھی تمہاری یا میری مرضی کے سامنے کچھ کہا ہے۔ اری مرضی میں راضی رہا ہے۔ یہ گن تو تمہارے لاڈلے میں ہی ہیں۔"

ربیعہ چپ سی ہو گئی۔

''رانی بہت اچھی لڑکی ہے، نصیب جاگ جائیں گے ہمارے۔ عمیر زندگی بھر سکھ رہے گا۔'' اماں پر یقین تھیں۔

پاکستان آنے کے بعد سب سے پہلے عدیم بھائی کے گھر بھتیجے کی تعزیت کے لیے تھے۔ اس کے بعد ربیعہ اور عدیم، بجیلہ کے ہاں بھی ہو کر آئے۔

''مجھے ڈر ہے عدیم! جس قسم کے حالات میں رانی رہ رہی ہے، کہیں وہ نفسیاتی مریضہ بن جائے۔'' عدیم کو بھی دونوں طرف کے حالات دیکھ کر گہرا رنج ہوا تھا۔

''عمیر کی تعلیم ابھی ادھوری ہے۔ عمیر کے کیریئر کا سوال نہ ہوتا تو میں احمد کے چہلم کے بعد ہی رانی کا نکاح عمیر سے کرا دیتی مگر عمیر تو یہاں سوئم تک بھی نہ رک سکا۔''

''تو زبیر بھی تو تھا، بہت قریب تھا زبیر تمہارے۔ تم نے زبیر سے بات کیوں نہیں کی۔ اس کی وہ فضول سی ضد اب بھی باقی ہے؟''

''آپ زبیر کی بات نہ کریں، اس نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ نہ صرف دل دکھایا۔ بلکہ میرے بھروسے اور مان کو بھی ٹھیس پہنچائی ہے۔ اماں ٹھیک ہی کہا کرتی تھیں۔ میرے لاڈ سے بگڑ رہا ہے مگر عدیم! میں تو سوچتی تھی عمیر اپنی خوبیوں کی وجہ سے سب کے دل میں جگہ بنا رہا ہے۔ لاپروا بھی ہے اور شرارتی بھی۔ کوئی بھی اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ اگر میں بھی اسے نظر انداز کروں گی تو اور بھی بگڑ جائے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا میری توجہ اور چاہت نے اس کی عادتیں پختہ کر دیں گی۔ عادتوں سے ہم سب چڑتے تھے، اس کی شخصیت کا حصہ بن جائیں گی۔''

زبیر کے لیے ماں کے یہ الفاظ کسی زہر سے کم نہیں تھے۔ پشیمانی کے احساس نے اندر تک گھائل کر دیا تھا۔

وہ کمرے کے باہر سے ہی مڑ گیا تھا، اس نے باپ کی بات نہیں سنی تھی۔ عدیم، ربیعہ کی بات پہ ہنس پڑے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''بچوں کو یکساں ماحول نہ ملے تو بچے نہ صرف ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں بلکہ آپس میں کدورتیں بھی پال لیتے ہیں۔ یہ بچوں کا قصور نہیں ہوتا، بڑے قصوروار ہوتے ہیں۔''

''مگر میں تو محبت دے رہی تھی نا اسے، کیا کافی نہیں تھا۔''

''اسے تمہاری محبت سب لوگوں کے سامنے کب لگتی ہو گی، تب ہی وہ نہ سنبھل سکا۔''

''مگر عدیم! اب تو وہ بڑا ہو چکا ہے۔''

''بچے بڑے ہو جاتے ہیں لیکن عادتیں بڑی نہیں ہوتیں۔ ہمہ وقت دونوں کے مواز

ایک دوسرے کو ضدی بنا دیا ہے۔'' عدیم کا اندازہ بالکل درست تھا۔

☆☆☆

ربیعہ، رانی کا رشتہ لینے کے بعد بہت مطمئن اور مسرور نظر آنے لگی تھی۔

''چلو یہ بھی اچھا ہوا تمہارے لاڈلے نے پہلے ہی لڑکی کا انتخاب کر لیا، ورنہ ہمیشہ کی وہ اس معاملے میں بھی ٹانگ اڑاتا۔'' اماں نے ناگواری کا اظہار کیا تو ربیعہ چپ سی ہو گئی۔

''چھوڑیں اماں! آپ بھی کیا فضول سی بات لے کر بیٹھ گئیں۔''

''پھر دوبارہ ذکر نہیں کیا تمہارے لاڈلے نے محترمہ کا۔'' اماں کو پھر خلجان ہونے لگا۔

''میں خود ہی نہیں کرنا چاہتی اس سے اس موضوع پر بات اور اب تو عدیم بھی آ گئے ہیں، خود ہی ہینڈل کر لیں گے اس معاملے کو آپ یہ دیکھیں، میں نے یہ انگوٹھی پسند کی ہے رانی کے ے۔ عدیم کہہ رہے تھے اسی جمعہ کو ہم یہ انگوٹھی پہنا آئیں گے تاکہ رانی کے متعلق چاروں طرف سے اڑآرائیاں ہو رہی ہیں، وہ بند ہو جائیں۔''

اور پھر ربیعہ اور عدیم یہ کام بھی کر آئے۔

☆☆☆

عمیر کو کسی بھی بات کا علم نہیں تھا، وہ بہت خوش خوش آیا تھا۔ وہ زبیر کو کچھ بدلا بدلا سا بھی زبیر کو خود اس فیصلے پر نہ تو اعتراض تھا اور نہ ہی کڑھن بلکہ اس نے ربیعہ کو بڑھ چڑھ کر شاپنگ تی۔ ربیعہ اس کی پسند پہ ہمیشہ مطمئن رہتی تھی۔

''یہ تو سچ ہے عدیم! زبیر ہمیشہ سے بہترین شاپنگ کروا رہا ہے۔ یہی شاپنگ اگر میں عمیر کرتی تو دماغ الٹا دیتا میرا اور پھر بھی کچھ نہ خرید پاتا۔'' ربیعہ ہنس رہی تھی۔

عمیر جو کافی دن کے بعد گھر کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہا تھا، ماں کی رائے سے لرتے ہوئے مسکرائے جا رہا تھا۔

''کیوں بھئی برخوردار...... یہ بھلا کیا بات ہوئی۔''

''یہ جواب آپ نانی سے لیں یا ماما سے جو پہلے ہی میرے لیے منتخب کرتی آئی ہیں۔ مجھے تجربے کا انہوں نے موقع ہی نہیں دیا۔''

''ہاں' تم تو یہی کہو گے، خود جو بائیکاٹ کر دیتے تھے۔'' زبیر نے جتایا۔

''اسی وجہ سے تمہیں شاپنگ کا سلیقہ آ گیا۔ ہائی وا دے ماما......! یہ کیا اتنی ڈھیر ساری پ نے اپنے لیے کی ہے۔ میں نے تو عرصہ ہوا آپ کو ایسے کپڑے پہنتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' بولین پہ نانی سب سے زیادہ واری صدقے ہوئی تھیں جبکہ زبیر منہ نیچے کر کے ہنسنے لگا تھا۔

"آج کے زمانے میں کوئی اتنا سیدھا نہیں ہوتا جتنا تو ہے، اسی لیے ہم نے تیرے سیدھی سادی لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔" عمیر کو گہرا شاک لگا تھا۔

"ہاں بھئی عمیر! ہم نے تمہاری بات پکی کردی ہے گل رانی کے ساتھ۔" عدیم نے آ لقمہ نگلتے ہوئے پانی کا گلاس منہ سے لگایا تو عمیر کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ گیا۔ ربیعہ اپنی ترنگ بول رہی تھی۔

"بس جلدی سے تمہاری پریکٹس مکمل ہوجائے تو ہم شادی کردیں گے۔"

"مگر..... ماما..... آپ سب نے..... مجھ سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا۔" عمیر یکدم ا ہوا تو سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

"اب تم سے بھی پوچھنا پڑتا۔ ہمیشہ ہماری مرضی میں خوش رہے ہو تم۔" نانی نے تو کر کہا تو عمیر کو سخت برا لگا۔

مگر نانی! یہ میرے لیے کوئی شرٹ یا کھلونا خریدنے جیسا نہیں تھا، یہ میری زندگی کا سے اہم فیصلہ تھا۔"

"ہاں، ہم جانتے ہیں اور ہم نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ تمہیں ہماری خوش ہونا چاہیے۔ الٹا تم ہم سے شکوہ کر رہے ہو۔" عدیم نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے رہے تھے۔ عمیر کرسی دھکیل کر کھڑا ہوگیا۔

"مگر پاپا..... مجھے شادی ہی نہیں کرنی۔"

اس کے بعد عمیر وہاں نہیں رکا، ربیعہ کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ زبیر کو بھی حیرا تھی۔ نانی تو آنکشت بدنداں رہ گئیں جبکہ عدیم پرسکون تھے۔

"یہ عمیر کیا کہہ گیا ہے عدیم! ہم نے تو رانی کو انگوٹھی بھی پہنا دی ہے۔"

ربیعہ نے شوہر کی طرف پریشانی سے دیکھا، عدیم چپ رہے پھر پرسوچ لہجے میں بو

"ہوسکتا ہے، فی الوقت شادی اسے اپنے کیریر میں رکاوٹ لگ رہی ہو تو ہم منگنی ہی ہیں۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔" عدیم خود ہی مطمئن ہوئے تھے مگر باقیوں کی الجھن دور نہ ہ

☆☆☆

"شادی..... نہ منگنی..... میں کچھ نہیں کروں گا۔" عمیر کا انداز دوٹوک تھا۔

"مگر عمیر.....! ہم تمہاری منگنی کر چکے ہیں۔"

"مجھ سے پوچھے بغیر۔" عمیر بھڑک اٹھا۔

"میں آپ کا بیٹا تھا، بیٹی نہیں۔" ربیعہ کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔

نانی غصے میں آگئیں۔ "تو گویا تمہیں بھی کوئی لڑکی پسند ہے؟"

"فار گاڈ سیک..... ایسا کچھ بھی نہیں ہے نانی! آپ میرا یقین کریں میں شادی آپ لوگوں کی مرضی سے ہی کروں گا مگر دس سال تک میں کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔ شہرت میرے دروازے پر آگئی ہے، آپ لوگ جان بھی نہیں سکتے شہرت کا کیا لطف ہوتا ہے۔ یہ شادی وادی..... بے کار کی رکاوٹیں ہیں۔"

"مگر..... عمیر..... ہم زبان دے چکے ہیں۔" ربیعہ اٹل لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"یہ آپ کی غلطی ہے ماما۔ اپنی دے..... آپ انکار کردیں، ویسے بھی گھر ہی کی تو بات ہے۔" عمیر کی خودغرضی عروج پر تھی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو عمیر! تم..... پہلے ہی تو ہم پرستی کی وجہ سے اس کی زندگی اجیرن کی ہے۔ ہمارے اس اقدام سے تو وہ جیتے جی مر جائے گی۔"

"تو ماما.....! قربانی کے لیے کیا میں ہی ملا تھا آپ کو، زبیر بھی تو تھا۔ آپ نے اس کے لیے ایسا کیوں نہیں سوچا۔"

ربیعہ اس سوال کا جواب دینا چاہتی تھی، دزدیدہ نگاہوں سے دونوں بیٹوں کو دیکھ کر رہ گئی۔ جبکہ نانی سے چپ نہ رہا گیا تو ترش لہجے میں کہنے لگیں۔

"اس لیے کہ اس پہ پہلے ہی کسی اور لڑکی کا بھوت سوار ہے۔"

"ہم نے تو تم پہ مان ہی کیا تھا عمیر..... جسے تم قربانی کہہ رہے ہو۔ ٹھیک ہے اگر تمہیں یہ ہی لگتا ہے تو تم بھی اپنی زندگی جیو۔ ہم نے تو اپنی زندگی تم دونوں کے لاڈ اٹھانے میں رائیگاں ہی کی۔" نانی جذباتی ہوئیں تو عمیر الجھن کا شکار ہوگیا۔

"پلیز ماما! آپ تو سمجھ سکتی ہیں۔ نانی کو سمجھائیں۔" ربیعہ چپ رہی تو عمیر، زبیر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"پلیز زبیر! تم ہی ان لوگوں کو سمجھاؤ، یہ مجھ پہ فی الحال کچھ بھی مسلط نہ کریں، ورنہ میرے دماغ کا ٹیلنٹ مر جائے گا۔"

زبیر چپ چاپ اٹھ کر ان کے درمیان سے نکل گیا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا ایک حد تک عمیر درست کہہ رہا تھا۔

"ٹیلنٹ تو تمہارا اسی دن مر چکا تھا جس دن تمہارا ڈرامہ کسی اور کے نام سے ٹی وی آن ہوا اور تب تم افسردہ ہوئے تھے، یاد ہے تمہیں۔"

عدیم غصے میں بول رہے تھے۔

"اور تب تمہیں ایسا لگا تھا جیسے اس گورکھ دھندے میں تم کبھی راستہ نہیں نکال پاؤ گے لیکن تم نے اپنی جگہ بنانا تھی، تب ہی زبیر تمہارے لیے معاون ثابت ہوا۔ تمہاری قسمت میں اگر شہرت ہے تو کوئی بھی چیز تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ یہ بات تم کیوں نہیں سمجھتے۔"

عدیم غصے میں بولے تو عمیر کو خاموش ہونا پڑا، البتہ ایک بات ذہن میں چٹ گئی تھی۔

"میری کامیابی کا دارومدار زبیر کے سر ہے۔"

☆☆☆

"پلیز عمیر! مجھ سے اس موضوع پہ بات ہی نہ کرو تو اچھا ہے۔" دو گھنٹے کی بک بک کے بعد بھی اسے یہی سننے کو ملے گا عمیر کو امید نہیں تھی۔ "تم ماما کو سمجھاؤ تو سہی..... وہ تمہاری بات، آئی مین۔"

"مجھے اس موضوع سے تو دلچسپی ہے اور نہ ہی ذاتی مفاد۔ جو میں سر کھپاؤں۔"

"ہاں، تم تو یہی کہو گے۔ اموشنل بلیک میلنگ تو میرے ساتھ ہو رہی ہے۔ مجھے کیا تھا یہاں پہ سب کچھ ہو رہا ہوگا تو ہرگز نہ آتا۔"

"تو اب چلے جاؤ، کس نے پاؤں پکڑے ہیں تمہارے۔"

"ماما اور نانی کی محبت نے....." عمیر نے زور و رخ ہوتے ہوئے اعتراف کیا تو زبیر ہنسی آ گئی۔

"تو پھر بات مان لو۔"

"مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا آخر سب کو رانی سے بلاوجہ کی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟"

"ہمدردی بلاوجہ نہیں ہے، تمہارے ہی کزن کی منگیتر تھی وہ۔" زبیر نے یاد دہانی کرائی۔

"تو میرے ہی سر پر مصیبت کیوں؟" عمیر جھنجلا گیا۔

"تمہاری ہمدردیاں اور خدمات ہمیشہ جو اس کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔" زبیر نے یاد دہانی کرائی تو عمیر چڑ گیا۔

"جی نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ تم جو پہلے ہی بک ہو کر بیٹھ گئے تھے، اسی لیے یہ مصیبت میرے سر پر پڑی۔ بائی دا وے، وہ محترمہ ہیں کون؟"

زبیر اپنے پاگل پن کا کیا جواب دیتا، چپ رہا۔ "بہرحال جو کوئی بھی ہیں، نہایت ہی خونخوار فیملی سے وابستہ لگتی ہیں، تب ہی تو بھولے سے بھی کسی نے تمہارا نام نہیں لیا۔"

"تم فضول بکواس کر رہے ہو۔"

"یہ فضول بکواس نہیں ہے زبیر!"

"کیا واقعی تم کسی کو پسند کرتے ہو؟"

زبیر چپ رہا۔

"کیا تم شادی بھی اسی سے کرو گے۔"

"فار گاڈ سیک" اس کے زچ کرنے پہ زبیر چڑ گیا۔

"میں نہ تو اریبہ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی رانی سے شادی کروں گا، یہ بات کان لرن لو۔"

"اریبہ....." عمیر کو شاک لگا۔ "کیا کہا تم نے، تم اریبہ سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔" عدیم کی آواز پہ دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

زبیر اس اچانک سوال پہ چکرا ہی گیا۔ اعتراف کے معنی تذلیل تھی۔

"پلیز پاپا! آپ مجھ سے اس موضوع پہ بات نہ کریں۔ میں رانی سے شادی ہرگز نہیں کروں گا۔" زبیر کا لہجہ اٹل تھا۔

"مگر میں تو تم سے اریبہ کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔ تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے تو نے اس کا نام اپنی ماما کے سامنے کیوں لیا کہ تم اسی سے شادی کرو گے۔" زبیر دل ہی دل میں خجل ہو رہا تھا۔ پشیمانی سے بولا۔

"وہ میری زندگی کی آخری غلطی تھی پاپا! اب میں کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔" زبیر کا لہجہ ندامت کے احساس سے بوجھل ہو رہا تھا۔

عمیر کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں زبیر کی طرف دیکھنے لگا پھر اس نے باپ کی طرف تماشہ نگاہ ڈالی۔

عدیم ہلکا سا مسکرائے اور زبیر کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

"اس غلطی سے تائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ماں کے حکم پہ سر جھکانا پڑے گا۔"

"مگر پاپا.....!" زبیر نے احتجاج کیا۔

عدیم نے روکنے والے انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ "اکثر ماؤں کے لاڈلوں کو ہی ایسی قربانیاں دینا ہوتی ہیں۔" وہ عمیر کی طرف شرارت سے دیکھ کر مسکرائے تھے۔ عمیر کے مردہ وجود میں جان آ گئی تھی۔

☆☆☆

تیز اورنج اور ریڈ بھاری دوپٹے کے لہنگا کرتی میں رانی نکاح سے بھی زیادہ ولیمے کے دن لگ رہی تھی۔

زبیر کے چہرے سے خوشی چھلکی جا رہی تھی جبکہ رانی جھینپی جھینپی..... سی تھی۔ کتنا لڑا کرتی

تھی وہ زبیر سے، کیا پتا تھا ایک دن وہ پوری زندگی کا مالک بن جائے گا۔

"تو پھر آ گیا اندر، تجھ سے تو میں رانی کا پکا پکا پردہ کراؤں گی۔"

نانی نے بڑھ کر رانی کا گھونگھٹ جو کھینچا تو عمیر چیخ اٹھا۔

"نانی......! میں عمیر......آپ کا لاڈلا...... چہیتا...... پیارا...... واللہ......اس طرح آنکھ تو نہ بدلیں۔"

"اب تو ہمارا لاڈلا...... چہیتا......زبیر ہے......" نانی نے زبیر کی بلائیں لیں۔

عمیر کو اپنی آنکھوں پہ یقین ہی نہیں آیا۔

"مجھے کیا پتا تھا رانی واقعی رانی ثابت ہو گی جس کے فلیٹ میں جائے گی اسے راجہ بنا دے گی۔" عمیر نے ربیعہ کے کان میں کھسر پھسر کی۔ ربیعہ ہنس رہی تھی۔

زبیر، رانی کی حالت پہ محظوظ ہو رہا تھا، جواباً بولا۔

"اصل میں مجھے کسی نے بددعا دی تھی کہ میری شادی موٹی لڑکی سے ہو۔ بڑی ہی زبان تھی اس کی۔" زبیر کے یاد دلانے پہ رانی شرم سے پانی پانی ہو گئی جبکہ عمیر نے دل کھول قہقہہ لگایا تھا۔

ولیمے کی رونق عروج پر تھی اور زبیر کی ذومعنی چھیڑ چھاڑ رانی کو گھائل کر رہی تھی۔

......✿......

طلب کی تتلی

جب نبیل اماں سے لڑ کر گھر سے نکلا تو وہ رو رہی تھیں۔ آنسو صاف کرتے ہوئے اچانک ان کی نگاہ جھاڑو پہ پڑی، جو سیدھی کھڑی تھی۔ بس پھر کیا تھا، اماں کی توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔

"کم بخت کو ہزار بار کہا ہے جھاڑو کو سیدھا نہ کھڑا کیا کر اس سے گھر میں جھگڑا ہوتا ہے۔ مگر باز ہی نہیں آتی۔ نجانے کیا کروا کر رہے گی یہ لڑکی۔"

اماں کے ایمان و اعتقاد پہ حسب معمول مجھے ہنسی آنے لگی۔

"اس میں جھاڑو کا کیا قصور ہے؟ قصور تو آپ کی سوچ کا ہے نہ بیٹے کو سر پر چڑھاتیں نہ آج یہ نتیجہ بھگتنا پڑتا۔" میں سوچ کر رہ گئی۔ اماں سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں جانتی تھی اماں ان توہمات پہ دل سے کاربند ہیں اسی لیے میں کچھ الٹا سیدھا ضرور کرتی رہتی۔ یہ سب کچھ کر کے میں دراصل ان محرومیوں کا بدلہ لیتی تھی جو مجھے بچپن سے ملی تھیں۔ بچپن سے ہی میں سب بہن بھائیوں سے مختلف تھی۔

بقول اماں کے میں ددھیال والوں پہ چلی گئی تھی اور ددھیال والے اماں کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ اس لیے اماں مجھ سے بھی محبت نہیں کرتی تھیں۔ رہی سہی کسر اس طرح پوری ہو گئی کہ میری پیدائش کے بعد ابا فوت ہو گئے۔

اماں کا بس نہ چلتا تھا کہ مجھ منحوس کو اٹھا کر باہر پھینک دیتیں۔ انہوں نے مجھے ایک طرف ڈال دیا اور یوں بڑی بہنوں نے مجھے پالا۔

اماں کی ناانصافیوں نے میرے اندر جارحیت اور ہٹ دھرمی پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی

کہ میں کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اور اماں ان سے تو میرا ہمیشہ معرکہ رہتا۔ نتیجتاً وہ میری خوب ٹھکائی کرتیں۔ تب میں بہت چھوٹی تھی اور باآسانی اماں کے ہاتھ لگ جایا کرتی لیکن ذرا سی بڑی ہوئی تو جیسے ہی اماں جوتی اٹھاتیں میں گھر سے بھاگ جاتی اور گلی محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتی۔ نبیل میرے ساتھ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ گلی کے سارے لڑکوں سے میری ٹھیک ٹھاک دوستی تھی۔

نبیل مجھ سے ڈیڑھ برس ہی چھوٹا تھا۔ لیکن اماں کی بے پناہ توجہ اور باقی بہنوں کی محبت کی وجہ سے وہ بالکل چھوئی موئی اور ڈرپوک سا تھا۔

میری وجہ سے اسے بھی گلی میں کھیلنے کا حوصلہ ہو جاتا۔

پھر جب شام ڈھلے ہم دونوں گھر آتے۔ تو نبیل کو نہلا دھلا کر اسے صاف ستھرے کپڑے پہنا کر اماں اپنے ہاتھ سے دیسی گھی کی چوریاں کھلاتیں اور مجھے وہی لعن طعن کی جاتی جس سے بچ کر میں گھر سے بھاگتی تھی۔ مجھے اماں کا یہ دوہرا رویہ سخت برا لگتا تھا اور اپنی ان دونوں بہنیں کا بھی، جو ہمہ وقت اماں کی چمچیاں بننے کی کوشش کرتی رہتیں۔ مجھے اماں، صدف اور انیلا پہ ہی غصہ آتا تھا نبیل سے میری کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ ڈرپوک اور بدھو سا تھا۔ اور اماں جو اسے چوریاں کھلاتی تھیں۔ وہ مجھے بچا کر چھپا کر دے دیا کرتا۔ اس لالچ میں کہ میں اسے باہر لے کر جاؤں گی۔

اماں نے جب ہمارے درمیان اتنی دوستی دیکھی تو انہیں کوئی خیال آیا کہ ہم دونوں کو ایک ہی اسکول میں داخلہ دلوایا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کا اکلوتا لخت جگر محفوظ رہ سکے۔

اسکول جاتے ہوئے اماں مجھے خوب سمجھاتیں۔

”بھائی کا خیال رکھنا۔ دیکھنا دوسرے بچے اسے نہ ماریں۔ اسے پیاس لگے تو اس تھرموس سے پانی پلا دینا۔ یہ پکڑو یہ بھائی کا پراٹھا ہے اور یہ تمہاری روٹی۔ یہ پکڑو لنچ باکس۔ بھائی کا بستہ لے کر تم آیا جایا کرو۔ بھائی ابھی چھوٹا ہے اور کمزور بھی بہت ہے۔“

یہ نصیحتیں میں گھر کے دروازے تک سنتی۔

باہر نکلتے ہی سب کچھ نبیل کو تھما دیتی اور اسے ڈنڈے سے ہانکتی ہوئی چلتی۔

بریک میں پراٹھا خود کھاتی۔ روٹی اسے کھلانے کی کوشش کرتی۔ وہ کھا لیتا تو ٹھیک۔ ورنہ روٹی بھی خود ہی کھا لیتی۔ وہ بازار کی چیزیں کھانے کا شوقین تھا۔ اماں جو پیسے دیتی تھی۔ اس کی چیز دلوا دیتی اور وہ بدھو بندر اسی میں خوش ہو جاتا۔

اس نے کبھی گھر آ کر اماں سے میری شکایت نہیں کی۔ کیونکہ اسے اچھی طرح پتا تھا جب بچے اسکول میں اسے مارتے تھے۔ تو میں بنا لحاظ کیے ان کی ایسی ٹھکائی کرتی کہ وہ آئندہ کے لیے توبہ

کر لیتے تھے۔ دوسرے مجھ سے جھگڑے کا مطلب تھا۔ اسے گھر میں قیدی بن کر رہنا پڑتا۔

”نبیل یہ کھالو، نبیل وہ کھالو، نبیل اوپر نہ چڑھو، تیز نہ دوڑو، یہاں لیٹ جاؤ، چپ کیوں بیٹھے ہو۔“

تین عورتوں کی ان ہدایات کی وجہ سے نبیل بھی دل ہی دل میں فرار کے راستے تلاش کرتا تھا اور وہ فرار میں ہی اسے دلوا سکتی تھی۔ پرائمری دور تو گزر گیا۔ مڈل میں ہم دونوں علیحدہ ہو گئے۔ اماں تو نہیں چاہتی تھیں کہ ہمیں علیحدہ کریں لیکن میری اٹھان دیکھ کر انہیں اپنے دل پہ پتھر رکھنا پڑا۔

میرا قد یکدم ہی نکلتا چلا گیا اور ایسا قد نکلا کہ میں نے صدف اور انیلا دونوں کو ہی پیچھے چھوڑ دیا۔ میں سمجھتی ہوں اللہ کے ہر کام میں ضرور انسان کے لیے بھلائی ہوتی ہے۔ اگر میرا قد کاٹھ نہ نکلتا تو مجھے اب بھی انیلا اور صدف کی اترن پہننا پڑتی۔ لیکن اب معاملہ الٹ تھا۔ ہر گرمی سردی کے آغاز میں اماں کو سب سے پہلے میرے کپڑوں کی فکر ہوتی اور میں قدرت کے اس احسان پر دل و جان سے شکر گزار تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں اپنی تمام کلاس فیلوز سے لمبی اور علیحدہ لگتی ہوں۔ میری آواز بھی کچھ بھاری سی تھی۔

اپنی ہم عمر لڑکیوں کو چھوئی موئی سا پا کر مجھے اندر ہی اندر احساس کمتری نے آ گھیرا۔ میرے اندر شدت سے خواہش ابھرتی کہ میں بھی ان تمام لڑکیوں کی طرح عام سی لڑکی ہوتی لیکن یہ احساس زیادہ دیر تک باقی نہ رہ سکا۔

پھر کالج میں داخل ہوتے ہی میری دوستی منی سے ہوئی۔ منی چھوئی موئی سی خوبصورت ترین لڑکی تھی۔ میں اس کی تعریف کیا کرتی لیکن وہ تو خود میرے قد کی دیوانی نکلی اور پھر مجھے معلوم ہوا فقط وہی نہیں بہت سی لڑکیاں، بہت سی ٹیچرز میری ہائٹ کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور یہ میری پہچان بن گئی ہے۔ قد میرا لمبا ضرور تھا لیکن نسوانیت کا میں مکمل پیکر تھی۔

اور اسی پرکشش شخصیت کا نتیجہ تھا کہ ٹیچرز نے مجھے کالج کے سالانہ فنکشن ڈراموں میں ہیرو کے رول کرنے کا موقع دیا اور اس طرح میں پورے کالج میں مقبول ہو گئی۔

کالج کے ان چار سالوں نے میرے اندر کی اس لڑکی کو ختم کر دیا جو اپنے قد اور آواز کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کب اور کیسے میری فطری جارحیت، ہٹ دھرمی نرم اور حساس سی طبیعت میں ڈھل گئی۔

بالآخر کالج کے چار سال بھی گزر گئے اور مجھے پھر گھر کی چار دیواری میں بیٹھنا پڑا۔ صدف کی شادی کے بعد انیلا کی شادی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اماں نے ساتھ ہی مجھے بھی ٹھکانے لگانے کا سوچا اور میرے رشتے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگیں۔ لیکن اگر رشتے اس طرح آسانی سے ملنے لگیں تو

کیا ہی بات ہے۔

یوں انیلا گھر سے اکیلی ہی رخصت ہوئی۔ اماں کو اس بات کا قلق تو بہت ہوا۔ پھر انہوں نے شاید یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ مجھے ابھی تربیت کی ضرورت ہے۔

''یہ تم کالر والی قمیص کیوں پہنتی ہو۔ جب دیکھو نبیل کی ٹراؤزر اور شرٹ پہنے پھرتی رہتی ہو۔ محلے کی عورتیں میرے پاس آتی ہیں، کیا کہتی ہوں گی کہ ساجدہ کی تیسری بیٹی لونڈا بنی پھرتی ہے۔''

''تو آپ کہہ دیں ناں ان سے کہ یہ بھی میرا بیٹا ہی ہے۔''

''توبہ، توبہ، توبہ۔'' اماں نے ناگواری سے گال پیٹے۔

''اللہ کی پناہ، میرے لیے تو ایک بیٹا بہت ہے۔ اللہ اس کو زندگی دے۔'' اماں کی بات پہ میں نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اور نبیل کی موٹر سائیکل پائپ لگا کر دھونے لگی۔

''ایسا بیٹا ہونے سے تو بہتر تھا کہ چوتھی بھی بیٹی ہی ہو جاتی۔''

میری بات پہ اماں کے دل پہ گھونسہ تو لگا لیکن دل ہی دل میں انہوں نے تائید ضرور کی ہوگی۔

ان کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے نبیل بگڑتا چلا گیا تھا۔ نہ تو وہ میٹرک کے بعد آگے تعلیم حاصل کر سکا۔ اور نہ ہی اس کے اندر یہ احساس ذمہ داری پیدا ہوا کہ وہ اس گھر کا واحد چشم و چراغ ہے اور اس پہ کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ الٹا وہ لماں سے نت نئے مطالبات کرتا رہتا جنہیں اماں کو ماننا ہی پڑتا کیونکہ اگر نہ مانتیں تو دو دو دن وہ اپنی شکل ہی نہ دکھاتا جس سے مجھے تو کبھی ٹینشن نہ ہوتی البتہ اماں کی چارپائی کے نیچے آگ لگ جاتی اور انہیں ایک پل چین نہ آتا۔ اس میں اکیلی اماں ہی قصوروار نہیں تھیں۔ صدف اور انیلا کا بھی بڑا ہاتھ تھا جنہیں وہ اب کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ جبکہ میں میرا معاملہ ذرا کچھ اور تھا۔ میں اسے گھاس ہی نہیں ڈالتی تھی۔ انیلا اور صدف کی طرح اس کی خدمتیں بھی کبھی نہیں کیں۔ کبھی اسے کھانا نکال کر نہیں دیا اور ناشتہ بنانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں صبح کبھی جلدی اٹھی ہی نہیں تھی۔ اماں جز بز ہوتیں لیکن میں سنی ان سنی کر دیتی۔

''کچھ کمانے دھمانے کے لائق تو ہے نہیں، الٹا بوجھ ہے ہمارے لیے۔''

اماں سے ایسی باتیں کہاں برداشت ہوتی تھیں۔ فوراً بول پڑتیں۔

''وہ بوجھ کیوں بننے لگا۔ جیسے اپنے باپ کی جائیداد کا کرایہ تم کھاتی ہو ایسے ہی کھا رہا ہے۔''

''میں تو کہتی ہوں۔ اس کی شادی کر دیں۔ کم از کم ایک بہو تو گھر میں آئے گی۔ محترم کے بھی پاؤں بندھیں گے اور گھر میں کام کاج کا مسئلہ بھی حل ہوگا۔''

''تم کو تو کہیں نپٹا دوں۔ پھر اس کے بارے میں بھی سوچ لوں گی۔'' اماں بھڑک کر کہتیں اور میں پھر ہنسنے لگتی۔

''اچھا لائیں اپنی دوا کا پرچہ دیں۔ آپ کی دوا لے کر آؤں اور انیلا اور صدف کے سوٹ لے ہیں تو اس کے بھی پیسے دے دیں۔ ابھی کے ابھی نمٹا آؤں گی۔''

اماں نے ہمیشہ کی طرح بلا چوں چرا دوا کا پرچہ اور پیسے میرے ہاتھ پہ رکھ دیے۔ انیلا اور کی طرح میں کبھی نبیل کی منتیں نہیں کرتی تھی۔

جو کچھ کرنا ہوتا کر گزرتی...... نبیل کی عدم توجہی کی وجہ سے اماں لاشعوری طور پر مجھ پہ کرنے لگی تھیں۔ اماں کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانا، گھر کا سودا سلف، یہاں تک کہ بجلی اور گیس کے میں خود ہی بھر آیا کرتی اور اماں کو پتا بھی نہ چلتا۔ کم از کم روز کی چخ چخ سے تو جان چھوٹ گئی ہر کام کے عوض نبیل کا کوئی نہ کوئی مطالبہ اور اماں کی مجبوریاں میری برداشت سے باہر تھیں۔

میں نے جب باہر کی ساری ذمے داریاں اٹھا لیں تو اماں کی ٹینشن اور نبیل کی اہمیت ختم ہو گئی۔ دہی دل میں اعتراف کرنے لگی تھیں کہ میں ان کے بیٹے سے زیادہ ان کا خیال رکھتی ہوں۔

لیکن جب اماں یہ غور کرتیں کہ گھریلو معاملات، چال ڈھال، کھانے پینے سونے جاگنے لے سے میرے معاملات ایسے نہیں کہ میں اگلے گھر جا کر ان کا نام روشن کر سکوں گی تو وہ بے چین اور میری تربیت کے لیے کمر کس لیتیں۔ میرا دس بجے سو کر اٹھنا انہیں کھٹکنے لگتا۔

''کم بخت اگلے گھر جائے گی تو کون اتنی دیر تک سونے دے گا۔ دن چڑھ رہا ہے اور ابھی اینٹھ رہی ہے۔'' اماں نے میری کمر پر دھموکا جڑا۔

صبح صبح میں ایسی ناگہانی کے لیے تیار نہ تھی۔ سو بلبلا کر بولی۔

''دیکھیں اماں! یہ مارنے پیٹنے والے کام نہ کیا کریں۔ اب میں بڑی ہو چکی ہوں اور گریجوایٹ ہوں۔''

''سب کچھ یہیں دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ جب آگے جا کر ''کھلّے'' لگیں گے۔'' اماں یا۔

''کون لگائے گا کھلّے؟'' میں نے کان پہ سے مکھی اڑائی۔

''جس کے تو پلّے بندھے گی۔'' میں نے ہنسی میں بات کو اڑا دیا۔ ''انیلا اور صدف کو بھی ہی کہا کرتی تھیں بھول گئیں۔ صدف کے سسرال میں صبح صبح اٹھ کر ساس صاحبہ کے کمرے میں پہ کیسا اعتراض ہوا تھا۔ بہو صاحبہ چین سے اپنے کمرے میں کیوں نہیں ٹکتیں صبح ہی صبح نیند کرنے آ جاتی ہے اور انیلا۔ انیلا پہ تو باقاعدہ الزام لگ گیا تھا کہ وہ صبح اٹھ کر ہی ناشتہ مانگنے پہنچ ہے۔ حالانکہ آپ کے پڑھائے ہوئے سبق کے مطابق وہ تو تابعدار سگھڑ بہو کی طرح سے سب نے کی خبر گیری کرتی تھی۔ لیکن چہ، چہ منہ کی کھانی پڑی۔ میری پیاری اور بھولی اماں۔ یہ

ایڈوانس دور ہے۔ آج کے دور میں کوئی کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ سسرال والے بھی دیر سوتے ہیں اور بہو بھی ایسی پسند کرتے ہیں جو سویرے سویرے آ کر تلاشیاں نہ لے اور چلے پیر کی طرح نہ پھرے۔ وہ دور گئے جب میاں منہ اندھیرے ہی کمرے سے بھاگ جایا کرتے تھے بہویں چپکے چپکے کمرے سے نکل کر ساس یا چھوٹے نندیوروں کے کمرے میں جا کے بیٹھ جاتیں ایک کونے میں بیٹھ کر اونگھنے لگتیں۔ بچے سو کر اٹھتے تو سمجھتے بھابھی حضور رات بھر اسی کرنے میں مشغول فرماتی رہی ہیں۔"

اماں نے میری لتر لتر چلتی زبان پر سر پکڑ لیا اور میں ہنستے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئی

☆☆☆

صدف اور انیلا کا روز روز کا آنا اور روزانہ اماں کی ان سے کھسر پھسر کا نتیجہ آئے روز نئے مہمانوں کی آمد کی صورت میں سامنے آ گیا۔

میں نے ان کاموں میں ذرا بھی کن سوئیاں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی وجہ گزیہ نہیں کہ مجھے شادی سے دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے شادی سے سو فیصد دلچسپی تھی۔ میرا ایک آئیڈیل تو ایک خوبرو ضدی ہٹ دھرم اور اپنی ہی بات منوانے والے شخص کا پیکر۔

بظاہر یہ پیکر میری ہی شخصیت کا عکس تھا۔ وہ پیکر جس میں میں نے خود کو صنف مخالف روپ میں دھارا تھا۔

اس روز میں بہت خوش تھی۔ میری تمام سہیلیاں مجھے گھیرے بیٹھی تھیں۔ اماں نے بڑے داماد بھی اچھے ہی ڈھونڈے تھے۔ سو میرے لیے بھی اچھا ہی بر دیکھا ہوگا۔ میں اندر تک شاد تھی۔ تب ہی میری سہیلیوں نے صدف اور انیلا سے پوچھا کہ موصوف کا نام تو بتا دیں۔ اماں کو لیتا ہی نہیں آتا تھا۔

"مضراب محمود۔" صدف نے بتایا۔

"مضراب!" مجھے کچھ زنانہ سا نام لگا۔ لیکن میری ساری سہیلیاں نام سن کر چلا اٹھیں نام مختلف اور اچھا ہے۔

باقی کے دن خواب دیکھتے ہوئے پر لگا کر اڑنے لگے۔

انیلا اور صدف رہنے کے لیے آ گئی تھیں اور شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اپنی شادی کی زیادہ تر تیاریاں میں نے خود کیں۔

انیلا اور صدف کی نہ تو چوائس اتنی اچھی تھی اور نہ ہی ان میں اتنا اعتماد تھا جتنا مجھ میں تھا کیونکہ تعلیمی قابلیت میں بھی اور بچپن سے باہر کی ہوا لگنے کی بدولت میں زیادہ پُراعتماد تھی۔ سو ان

سے جو بھی بازار جاتا مجھے ساتھ ضرور گھسیٹتا۔ اماں بھی میری خریداری سے مطمئن رہتیں۔

حیرت انگیز طور پہ نبیل نے بھی میری شادی کی تیاریوں میں حصہ لیا۔ بلکہ اچھی خاصی ذمے داری اٹھائی۔

اللہ اللہ کر کے میری زندگی میں وہ دن بھی آ گیا جس کا ہر لڑکی کو ارمان ہوتا ہے۔

میں نے سوچا اداس ہونے کی کوشش کروں۔ مگر میں خوش اتنی تھی کہ اداسی نامراد میرے قریب ہی نہ پھٹکی تھی۔ اس خوشی کی سب سے اہم وجہ کہ میں کسی کے لیے خاص بننے جا رہی تھی۔ میں اپنی ہمجولیوں کے درمیان دلہن بنی بیٹھی تھی اور ان کی چھیڑ چھاڑ پہ میرے دانت نکل رہے تھے۔ تب ہی میری بہنیں منہ بسورتے ہوئے نظر آ گئیں۔ پھر اماں نے آ کر مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

اور تب میں نے محسوس کیا جو ماؤں میں اماں کے ساتھ قائم رکھتی ہوں۔ وہ دراصل ہماری محبت تھی۔ یا محبت کا کوئی انداز تھا۔ میں اماں کے دھان پان سے وجود سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ یہ خیال ہی روح کو نوچ رہا تھا کہ اب اماں بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔ نبیل کی طبیعت میں جو لاپروائی تھی وہ تو نہیں بدلنا تھی۔ میں نے جو رونا شروع کیا تو چپ کرانا ہی مشکل ہو گیا۔ ادھر اماں بھی رو رہی تھیں۔

"میں نے آپ کو بہت ستایا ہے اماں مجھے معاف کر دینا۔"

"تو میرے گھر کی رونق تھی۔ آج وہ رونق میرے آنگن سے رخصت ہو کر کسی دوسرے گھر میں جا رہی ہے۔ اللہ تجھے اس گھر میں ہمیشہ خوش رکھے۔" اماں مجھے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"ہم جلد ہی نبیل کی شادی کر دیں گے۔ اماں کے گھر میں پھر سے رونقیں آ جائیں گی۔" صدف نے اماں کو اور مجھے بیک وقت دلاسا دیا۔

"نبیل کی شادی تو کرنا ہی ہے۔ مگر نمرہ کی کمی پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ میری بیٹی ہی نہیں بیٹا بھی تھی۔"

اماں کے منہ سے اتنی تعریف سن کر میں پھولی نہ سمائی اور اماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ جب آپ حکم کریں گی۔ آپ کا بیٹا آپ کی خدمت میں حاضر جایا کرے گا۔"

"کون سا والا بیٹا؟" میری سکھیوں نے مجھے چھیڑا۔

میں ذرا شرمندہ سی ہوئی۔

"یعنی ابھی گئی بھی نہیں بنو اور ابھی سے اتنا مان موصوف پہ۔"

اب میں کیا کہتی۔ کمرہ لمحوں میں زعفران زار بن گیا تھا۔ اماں بھی مسکرانے لگی تھیں۔

☆☆☆

تمام روایتی رسوم کے بعد میری سسرالی خواتین نے مجھے میرے بیڈروم میں پہنچا دیا۔ جو میرے جہیز کے سامان سے سجا ہوا تھا۔ درمیانے سائز کا کمرہ۔ فرنیچر کی سادہ سی آرائش سے دلکش لگ رہا تھا۔ میں نے اچٹتی نگاہوں سے ہی کمرے کا جائزہ لے ڈالا تھا پھر میں نے خود پہ غور کیا تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔

یوں بے وقوفوں کی طرح بیٹھ کر میں کیوں وقت ضائع کر رہی تھی۔ کیا نئی زندگی کی ابتداء کے لیے میرا ذہن اوسط درجے کی ان روایتی حرکتوں کے لیے تیار تھا۔ میرے اندر سے جواب آیا۔ ”نہیں۔“

جس شخص کو میں جانتی تک نہیں اس کے حوالے خود کو چپ چاپ کر دینا کتنا عجیب لگتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی میری ساری شرم و حیا رفو چکر ہوگئی اور میں نے بڑے اطمینان سے میک اپ اور زیور اتار کر کپڑے تبدیل کیے اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

یہ تو میں جانتی تھی کہ مضراب محمود پڑھا لکھا ہے اور اس کی اسپیئر پارٹس کی بہت بڑی دکان ہے جو شخص بڑے صنعتی اداروں سے ڈیلنگ کرتا ہے کیسے ممکن ہے کہ اسے گفتگو کا سلیقہ نہ آتا ہو۔ وقت کی سوئیاں رک رک کر چل رہی تھیں۔ اور نت نئے خیالات دبے پاؤں میرے نزدیک آ رہے تھے۔

تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور محترم اندر تشریف لے آئے۔ چہرہ پہ عجیب کھسیانی سی ہنسی سجائے، سفید اچکن اور پاجامے میں ملبوس وہ شخص میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے سلام کیا اور میرے نزدیک آ گیا۔

”دراصل میں اپنی بہنوں کو نیگ دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے دیر ہوگئی۔ میری بہنوں کو میری شادی کا بہت ارمان تھا۔ مگر میں شادی پہ آمادہ نہیں تھا۔ (یہ مجھ سے کس قسم کی گفتگو کر رہا ہے) سوچتا تھا نجانے آنے والی کیسی ہو۔ کہیں وہ ہم بہن بھائیوں کو ایک دوسرے سے دور نہ کر دے۔ مگر اب یہ بھی ممکن نہیں تھا وہ مجھے کنوارہ ہی رکھتیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور میرے سر پہ سہرا سجا ہی دیا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ پھر کھسیانے سے انداز میں ہنسا۔

”اب یہ آپ پر منحصر ہے کیسے ان رشتوں کو نبھاتی ہیں۔ میری پانچ بہنیں ہیں اور میں ان کا اکلوتا بھائی ہوں۔ دو بہنیں مجھ سے بڑی ہے اور تین مجھ سے چھوٹی ہیں۔ امی نے آپ کا انتخاب کیا ہے ضرور آپ میں کچھ صلاحیتیں دیکھی ہوں گی۔ میں نے تو آپ کے متعلق کچھ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ سب کچھ گھر والوں پہ چھوڑ دیا تھا۔ اگر آپ میرے گھر والوں کو خوش رکھیں گی تو مجھے بہت

ہوگی۔“

(یعنی کہ میں بلاواسطہ نہیں بالواسطہ تم تک رسائی حاصل کروں گی) میں اس کی گفتگو پہ ی اندر تلملا رہی تھی۔

”ارے میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔“ اس کی کھسیانی سی ہنسی جس سے مجھے اب چڑ ہونے لگی تھی۔

”میرا نام مضراب محمود ہے۔“ میں سیدھا سادہ سا شریف بندہ ہوں۔ آپ سے پہلے میری میں کوئی عورت نہیں آئی۔“

”عورت!“ میں چلا کر احتجاج بھی نہ کر سکی۔

”آپ پہلی خاتون ہیں اور شاید آخری بھی۔“ اس نے اسی کھسیانی ہنسی سے کہا تو میرا دل ان ہوگیا۔ اگر وہ یہی جملے کسی اور طرح سے کہتا تو میں ہواؤں میں اڑنے لگتی۔ پھر اس نے جیب اتھ ڈالا اور ایک سرخ مخمل کی ڈبیا نکالی اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ میری طرف سے آپ کی رونمائی ہے۔ بس جلدی میں تو یہی بن سکی تھی۔ اگر آپ کو ور پسند ہوگا تو میں لا دوں گا۔“

اور میں نے ذہن پہ زور ڈالنے کی کوشش کی کہ جو مرد اپنی بیوی کو رونمائی میں انگوٹھی دیتا کن خصوصیات کا مالک ہوتا ہے۔ مگر لاکھ کوشش کے میں یاد نہ کر پائی۔ اس کا تحفہ دیے ہ انداز نا نرالا تھا کہ میری سوچ جامد ہو کر رہ گئی۔

اس نے شاید میرے پٹخنے کے انداز کو نوٹ کر لیا تھا۔

”اگر آپ کہیں تو میں خود پہنا دیتا ہوں۔“

اف اتنی عاجزی میری برداشت سے باہر تھی۔

”آپ کچھ بول نہیں رہیں۔ بولتا تو میں بھی زیادہ نہیں ہوں۔ بس آپ کی وجہ سے بول ۔ آخر اس خاموشی کو کسی ایک نے تو توڑنا ہی ہے۔“

وہ یہ کہہ کر ہلکا سا مسکرایا تھا میں ٹس سی بیٹھ رہی اور سوچتی رہی۔

کیا کوئی شخص اتنا بدھو بھی ہو سکتا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ میں سنگھار سے کیوں ہوں؟ آخر وہ کچھ تو احتجاج کرتا۔ لعن طعن کرتا ناراض ہوتا۔ یا پھر سراہتا کچھ تو کہتا۔

”لگتا ہے آپ بہت تھک گئی ہیں۔“

میں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

”ارے، یہ سب سامان کون رکھ گیا تھا؟“ اس کی نگاہ میز پہ رکھی اشیاء کی طرف اب گئی تھی۔

"لگتا ہے یہ میری بہنوں کی کارگزاری ہے۔ شاید یہ بھی کچھ رسم ہوتی ہو۔" اس کی لاعلمی تھی یا جان بوجھ کر بن رہا تھا۔ دونوں میں سے جو بھی وجہ تھی، مجھے سخت زہر لگ رہی تھیں اس کی باتیں۔

"لڑکیوں کو تو ویسے بھی بہت پڑیاں پڑھانے والی مل جاتی ہیں۔ مگر میرا تو کوئی قریبی دوست نہیں ہے جو مجھے یہ سب کچھ بتاتا۔ آپ کو تو ان سب رسومات کا علم ہوگا۔"

اس نے مٹھائی کا ڈبہ اٹھاتے ہوئے کہا تو میں جل کر خاک ہوگئی اور میرا دل چاہا، ہاں جی ہاں میں تو دس بھگتا کر آئی ہوں۔

"مٹھائی میں کون سی چیز آپ کی فیورٹ ہے؟"

بجائے کچھ اٹھا کر میرے منہ میں ڈالنے کے اس نے سارا ڈبہ ہی میرے آگے کر دیا۔

مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ میری قسمت پھوٹ چکی ہے اور میرے خواب ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔ یا تو یہ شخص بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یا واقعی ایسا ہے۔ اگر واقعی مسٹر عاجز دماغ ہیں تو زندگی تو ہوگئی فلاپ۔"

میں تنک کر اس کے نزدیک سے اٹھ گئی۔

"مجھے کچھ نہیں کھانا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اس نے مٹھائی کا ڈبہ رکھ کر فوراً میری کلائی پکڑ لی۔

اس کی گرفت اتنی کمزور تھی کہ میں ہلکے سے جھٹکے سے چھڑا سکتی تھی۔ لیکن دانستہ میں نے ایسا نہیں کیا۔

"اگر آپ کی طبیعت خراب ہے تو آرام کر لیجیے۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔"

مجھے تو پہلے ہی ایسے حالات دکھائی دے رہے تھے۔

اس کی اتنی بے اعتنائی پہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

اور میں خود بھی سمجھ نہ پائی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں جو مضراب کے آنے سے سوچ رہی تھی کہ پہلے انڈر اسٹینڈنگ ہوگی پھر۔ اب نہ جانے کیوں اس کی سرد مہری مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"ارے آپ رو رہی ہیں؟" وہ سچ مچ پریشان ہوگیا۔

اور اس کا پریشان ہونا مجھے پہلی بار کچھ اچھا لگا۔ کم از کم اس کی پریشانی کا محور صرف صرف میں تھی۔ وہ میرے نزدیک آگیا۔

"اگر آپ آرام کرنا چاہتی ہیں تو آرام کر لیجیے۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔"

اس نے نہایت سادگی سے یہ جملے کہے اور اپنی اچکن وغیرہ اتارتے میں مصروف ہوگیا

پھر وہ کمرے سے ملحقہ واش روم میں چلا گیا۔

میں تکیے میں منہ گھسیڑ کر لیٹ گئی اور چپکے چپکے اپنی قسمت پہ آنسو بہانے لگی۔

پھر جیسے ہی اس نے لائٹ آف کی میری ساری حسیات بیدار ہوگئیں۔ ظاہر ہے کمرے آرام کرنے کے لیے فقط ایک ہی بستر تھا اور جب اس نے یہ پوچھا۔

"اگر آپ پسند کریں تو میں یہاں لیٹ جاؤں؟" تو میرے سارے ہی اندازے غلط ہو گئے۔ اور میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر رو دوں۔

"چلو ٹھیک ہے۔ اگر آپ کو پریشانی ہوتی ہے تو میں ادھر صوفے پہ لیٹ جاتا ہوں۔ ویسے بھی دن تو نکل ہی چکا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ دوسری طرف جانے لگا تو میں تنک کر بستر سے اٹھ گئی۔

"اگر میری وجہ سے آپ یہ ڈرامہ کر رہے ہیں تو میں ادھر صوفے پہ لیٹ جاتی ہوں۔"

رونے کی وجہ سے میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور لہجے میں ترشی تھی۔ وہ ہق دق میرا چہرہ دیکھنے لگا۔

یہ کہتے ہوئے میں صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ نیند تو مجھے کیا آنی تھی۔ بس کروٹیں ہی بدلنا تھیں چاہے بیڈ ہو یا صوفہ۔ میں نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ میں اس فلاپ منظر سے غائب ہو جانا چاہتی تھی۔ مگر آنکھوں میں جو ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں تھیں وہ نیند کو کوسوں دور بھگا رہی تھیں۔

کچھ دیر تک تو کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر وہ کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد جو میں اتنی دیر سے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ دل کھول کر روئی پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ ظاہر ہے کھلا ہوا تھا۔ اس لیے میری شادی شدہ نندیں کمرے میں آگئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے بچے بھی آگئے اور کنواری نندیں بھی۔ شور سے میری آنکھ کھلی تو نندیں بچوں کو شور کرنے اور چیزوں کو چھیڑنے سے روک رہی تھیں۔

اتنے سارے افراد کو اپنے سر پہ دیکھ کر پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کیونکہ ماشاء اللہ روز بجے سو کر اٹھتی تھی۔ وہ بھی فقط اماں کی ڈانٹ پھٹکار کے بعد۔

پھر یکدم ہی میرا ذہن بیدار ہوگیا۔ اب میں اماں کے گھر میں نہیں تھی۔

"ہم لوگوں کی وجہ سے آپ کی نیند خراب ہوگئی۔ گیارہ بج رہے ہیں ناشتہ کر لیں پھر سو جائیے گا۔" یہ میری بڑی نند تھی۔ جو خواہ مخواہ ہی خوش مزاجی کا ڈرامہ کر رہی تھی۔ میں خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

"تم لوگ بچوں کو لے کر باہر جاؤ۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" دوسری والی نند میرے قریب بیٹھ گئی۔

میں اپنے حنائی ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ میرے ہاتھوں پہ مہندی رچ کر رچی تھی۔ اس وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے زندگی میں پہلی بار مہندی لگائی تھی۔ مہندی کی وجہ سے میرے ہاتھ بے خوب صورت لگ رہے تھے۔ اس سے قبل میں عام لڑکیوں کی نسبت اپنے ہاتھوں کو بڑے اور مر ہی سمجھتی تھی۔ لیکن آج اپنے ہاتھوں کا حسن دیکھ کر میں خود بھی حیران تھی۔ یہ چوڑیوں اور مہندی کا تھا یا واقعی مجھ پر بہت روپ چڑھا تھا۔

"ہم نے آپ سے چند باتیں کرنی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ ہمیں فریش ملیں گی۔ لیکن ابھی تو آپ......" جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے وہ ذومعنی انداز میں مسکرائی۔

میں کچھ خجل سی ہوتے ہوئے واش روم میں چلی گئی۔ واش روم میں جانے کے بعد میر ذہن میں رات کی باتیں تازہ ہوگئیں اور میں مضراب کی شخصیت میں الجھنے لگی۔ رات اس نے مجھ ذرا بھی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا آخر وہ مجھ سے ہر بات پوچھ پوچھ کر کیوں کر رہا تھا۔ کیا دنیا میں ا مرد بھی ہوتے ہیں؟۔

وہ شخصی لحاظ سے مجھے کتنا کمزور دبو اور بے وقوف لگا تھا۔ میں نے شاور لیے لیا تھا۔ کھونٹی پہ میرا سادہ لباس اور ایک عدد نائٹی بھی لٹک رہی تھی۔ میں نے وہ سادہ کاٹن کا سوٹ پہن جب واش روم سے باہر نکلی سینٹرل ٹیبل پہ ناشتے کے انواع و اقسام کے لوازمات ر تھے۔ رات کا تمام کھانے پینے کا سامان وہاں سے غائب تھا۔ مضراب صاحب صوفے پر ا تھے۔ گرے کلر کے قمیص شلوار میں ملبوس وہ رات کی نسبت نکھرا ستھرا سا اچھا لگ رہا تھا۔

اسے سامنے دیکھ کر مجھے یک دم حیا سی آگئی اور میں جو تولیہ بالوں میں لپیٹے بنا دوپٹے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ جلدی سے دوپٹہ اٹھا کر اوڑھ لیا۔ یہ میری اچانک لاشعوری حرکت تھ میرا ارادہ تھا کہ بال کھول کر سکھاؤں۔ لیکن میرا ارادہ بھانپتے ہوئے اس نے کہا۔

"ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پہلے ناشتہ کرلو۔ پھر بال بنالینا۔"

مجھے اس کے اس خشک رویے پہ تپ چڑھ گئی۔

اس کی رات والی ساری زیادتیاں تازہ ہوگئیں۔

"مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔" میں نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔

"مجھے پتا ہے کہ تم مجھ سے جس بات پہ ناراض ہو۔ مگر تم فکر نہ کرو۔"

میں جو آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ شرمندہ ہو کر رہ گئی مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ ہو کہ پلٹ کر اسے دیکھوں۔ آئینے میں میں نے اسے دیکھا۔ وہ یہ کہہ کر سنجیدگی سے ناشتہ کرنے لگا۔ ا کی نسبت اس وقت وہ خاصا پُر اعتماد لگ رہا تھا۔

وہ ناشتہ کر کے کمرے سے چلا گیا۔ میں ناشتے کی ٹیبل پہ آ گئی۔

اس وقت میں ایک پیالی چائے ہی پی سکی تھی۔ وہ بھی ٹھنڈی اور بدذائقہ۔ اس کے لفظوں کی بازگشت مجھے اب بھی شرم سار کر رہی تھی۔ اتنی بڑی بات کو اس نے کس قدر معمولی انداز میں کہہ دیا تھا۔ اس پہ میرا کیا تاثر پڑا ہے؟ میں جانے کب تک اس بات پہ غور و فکر کرتی۔ مگر میری وہی دونوں نندیں پھر سے میرے کمرے میں آگئیں۔ ان کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔

"ہمارا بھائی آپ کو کیسا لگا ہے؟" ہما نے مجھ سے پوچھا۔

میں اس بات کا کیا جواب دیتی۔ میں تو خود الجھی ہوئی تھی۔

"لو بھلا یہ بھی کوئی بات ہے پوچھنے کی۔" امبرین نے ہنس کر کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ "یہ تو وقت کے ساتھ ساتھ ہی تم دونوں ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرو گے۔ لیکن اپنے بھائی کے بارے میں اتنا ضرور بتا دوں کہ وہ ہم پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ہمارے ساتھ کھیلا کودا ہے اسی وجہ سے فطرتاً شرمیلے مزاج کا ہے اور نہایت ہی سادہ ہے۔ تم اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو اس لیے مضراب تمہیں عام لوگوں سے مختلف لگے گا۔ وہ ہم سب سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس نے باہر کی دوستیاں نہیں پالیں۔ ہم سب بہن بھائی ہی ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں۔ مگر لحاظ اور ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ ہم بہنیں تو پھر بھی ایک دوسرے سے فری ہو جاتی ہیں۔ لیکن مضراب ہم سے بھی لحاظ ہی رہا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے تھے کہ خاندانی اور نیک سیرت لڑکی لائیں تاکہ ہمارے گھر کا سکون اسی طرح برقرار رہے۔ تمہاری بڑی دونوں بہنوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں ایک تو میرے سسرالی رشتہ داروں میں ہی آئی ہے۔ ان ہی کے کردار کو دیکھتے ہوئے ہمارا دھیان تمہاری طرف آیا تھا۔ ہمیں امید ہے تم ہمارے گھر کا سکون قائم رکھو گی اور امی ابو کا مضراب کی طرح ہی خیال رکھو گی۔"

میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی۔

دوپہر تک میری بہنیں مجھے لینے آگئیں۔ مجھے دو تین گھنٹے کے لیے جانا تھا۔ کیونکہ رات کو ولیمہ تھا۔

صبح سے میری ساس کمرے میں نہیں آئی تھی۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب تب لگا۔ جب جاتے ہوئے میں نے انہیں سلام کیا تو وہ ذرا جھینپ کر بولیں۔

"ہما اور امبرین کو میں نے تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔ نئی نویلی دلہنوں کے کمرے میں جاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اس لیے میں تمہارے پاس نہیں آئی۔"

اپنی ساس کی شرم پہ مجھے شرم سے ڈوب مرنا چاہیے تھا۔ وہ بے چاری بڑھاپے میں اتنی دب لحاظ والی تھیں۔ جبکہ میں...... مجھے تو ایک بار بھی شرم نہیں آئی تھی۔

لیکن خیر جو کچھ بھی تھا گھر کا ماحول میری ساس کے زیر اثر تھا۔ اسی وجہ سے مضراب محمود بھی شرمیلے مزاج کے تھے۔ میں راستے بھر مختلف نتائج نکالتی رہی۔

"کیا بات ہے تمہاری بالکل بولتی بند ہوگئی؟" منال نے مجھے چھیڑا۔

میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ بات کا کوئی سرا ہی نہ نکال سکی۔ اماں نے میری خوب آؤ بھگت کی۔ انیلا، صدف اور منال کی چھیڑ چھاڑ میں وقت گزر گیا۔ شام کو مجھے مضراب کی بہن لینے آ گئی۔ وہ مجھے سیدھا بیوٹی پارلر لے گئی۔ پھر وہیں سے ہم میرج ہال چلے گئے۔

ولیمہ کا فنکشن بالکل سادہ تھا۔ مختصر سے مہمان تھے۔ مرد حضرات کا علیحدہ انتظام تھا اور خواتین کا علیحدہ۔ حالانکہ ہمارے یہاں تو لڑکا لڑکی ولیمہ کے روز اکٹھے بیٹھتے تھے۔ میری سہیلیاں مضراب سے ملنا چاہتی تھیں۔ لیکن ایسا موقع ہی نہ بن سکا اور وہ تشنہ خواہش لیے چلی گئیں۔ رات گئے ہم لوگ بھی گھر آ گئے۔ میں مضراب کے ہمراہ گاڑی میں تھی۔ ساتھ ہی ساس سسر اور ایک نند بھی تھی۔ اسی وجہ سے راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ گھر آنے کے بعد سب ہی تھکے ہوئے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابھی مضراب اندر نہیں آیا تھا۔ میں چاہتی تو چینج کر لیتی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں مضراب کی نظروں سے اپنی ستائش چاہتی تھی۔

آج سب ہی نے میری بہت تعریف کی تھی۔ بقول منال کے نکاح والے دن سے زیادہ میں آج اچھی لگ رہی تھی۔ فالسئی رنگ کا کامدار غرارہ واقعی مجھ پہ بہت اٹھ رہا تھا۔ میں نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ تھوڑا سا لپ کیا۔ میرا میک اپ ابھی تک تر و تازہ تھا۔ میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ جب ہی مضراب اندر آیا۔ اس نے بلیک ٹو پیس پہن رکھا تھا۔ اس نے آہستہ سے مجھے سلام کیا۔

آج وہ بہت مختلف اور اچھا لگ رہا تھا۔ اسے اچانک دیکھ کر میرے دل میں کچھ ہوا۔ میں سیدھی ہو بیٹھی۔ پھر وہ میرے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔

میرے من میں ہلچل ہونے لگی۔ میرا خیال تھا وہ میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گا۔ لیکن اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے اسی سادگی سے کہا۔

"نہ جانے خواتین اتنا میک اپ کیوں تھوپتی ہیں مجھے تو سادہ چہرے اچھے لگتے ہیں حالانکہ اس کے انداز میں طنز نہیں تھا مگر مجھے اچھا نہیں لگا جبکہ میرے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جنہیں میک اپ پسند نہیں ہوتا۔ لیکن جب میں کل بنا میک اپ تھی تب اس نے اس قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"کوئی بھی دلہن بنا میک اپ کے تیار نہیں ہوتی۔" میں نے قدرے روکھا سا جواب دیا۔

تو یہ بھی جتا دیا کہ میں دو دن کی دلہن ہوں۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"اگر آپ کو میک اپ پسند ہے تو میں کبھی اعتراض نہیں کروں گا۔" اس کی مفاہمت مجھے آنکھ نہ بھائی۔

"بندے میں کچھ تو کوالٹی ہونا چاہیے۔ پسند ناپسند۔ مرضی یا نامرضی۔ یہ کیا کاٹھ کے الو کی بیوی کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

"دو بجنے والے ہیں۔ رات کافی ہو رہی ہے۔ آپ چینج کر لیں۔ میں بھی چینج کرنے جا رہا ہوں۔"

اور میں بھی جوں کی توں بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سادہ سی قمیص شلوار میں واش روم سے نکلا تو مجھے یونہی بیٹھا دیکھ کر بولا۔

"کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

"کیا مطلب؟" میں انجان بنی۔

"ظاہر ہے، آپ نادان تو نہیں ہیں اور نہ ہی بچی ہیں۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے ساتھ ہی کمرے کی لائٹس آف کر کے زیرو پاور کا بلب جلا دیا۔

وہ میرے نزدیک آ گیا اور آہستگی سے میرے کان کا آویزہ چھیڑتے ہوئے بولا۔

"اگر تھکی ہوئی ہو تو میں ہیلپ کرا دوں؟"

"کل تو آپ کو اس بات کا خیال نہیں آیا۔" میری زبان بھلا کب تک رک سکتی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

"کل آپ نے سب کچھ خود ہی اتار پھینکا تھا۔ میں بھلا کیا ہیلپ کراتا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے خود سے قریب کر لیا۔

"آپ نے تو کل اس قابل ہمیں سمجھا ہی نہیں۔ اب میرے لیے کیا حیثیت ہے ان باتوں کی۔"

میرے دماغ میں چھناکا سا ہوا۔ میں تو اسے بدھو سمجھ رہی تھی لیکن وہ تو گھنا میسنا نکلا۔

وہ آہستہ سے ہنسا۔ "پہلے اپنے متعلق کچھ غلط فہمیاں دور کر دوں۔"

"مجھے تو کوئی غلط فہمی نہیں ہے آپ کے متعلق۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اچھا..... پھر آپ کا رویہ اتنا اکھڑا اکھڑا کیوں ہے مجھ سے؟"

مجھے بے حد سبکی محسوس ہوئی۔

"میرا خیال ہے وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے۔ آپ بھی سو جائیے اور میں بھی سو رہی

ہوں۔'' میں نے یکدم اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔

یہ کہہ کر میں لیٹ گئی۔ میں نے آنکھیں میچ لیں۔ میری کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور مجھے خوامخواہ خود پہ غصہ آ رہا تھا۔

''کیا ضرورت تھی نخرے دکھانے کی۔ اتنا دبو اور کمزور مرد۔ تب ہی تو وہ ہر معاملے میرے سر تھوپ رہا ہے۔ اتنا صبر واستقلال آج سے پہلے میں نے کسی مرد میں نہیں سنا۔ نہ جانے یہ آزمائش میرے پلے کیوں بندھ گئی۔''

میں نے آنکھیں کھول کر یونہی جائزہ لینا چاہا۔ مضراب محمود سے آنکھیں چار ہوئیں وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا میں نے غور کیا اس کے چہرے پر الجھن تھی۔

میں سمجھ چکی تھی۔ اس کا سارا مسئلہ حوصلے کی کمی ہی ہے۔ اس چیز نے مجھے بے حد دل شکستہ کیا تھا۔ میں تو زندگی میں اس سے کبھی نخرہ بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔ نخرے کا مطلب تھا اس چیز سے ہاتھ دھو لینا۔

ابھی میں خیالوں کی رو میں بہہ رہی تھی کہ کسی نے میرے بازو پہ ہاتھ رکھا تو میں چونک گئی اور یکدم آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور مضراب میرے بالکل نزدیک۔ اتنا کہ میں کچھ بول نہ پائی۔

☆☆☆

صبح مجھے کوئی اٹھا رہا تھا۔ مجھ پہ اس وقت نیند کا اتنا غلبہ تھا کہ باوجود چاہنے کے میری آنکھیں کھل کر نہ دیتی تھیں۔ کسی بھاری سے ہاتھ نے میرا گال تھپتھپایا تب مجھے جھنجلا کر آنکھیں کھولنی پڑیں۔ یہ میرے شوہر نامدار تھے۔ میرا جی چاہا کہوں۔ ایک نئی نویلی دلہن کو ایسے جگایا جاتا ہے۔ ادھر وہ چہرے پہ بے زاری لیے کہہ رہے تھے۔

''وقت دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔ ابھی کوئی کمرے میں آ جائے گا۔ کم از کم اپنا حلیہ درست کر لیں۔''

یہ کہہ کر وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال سنوارنے لگا۔ میں شرمندہ ہوتے ہوئے چپ چاپ واش روم میں چلی گئی۔ میں باہر آئی تو مضراب کمرے میں نہیں تھا۔ میں نے بیڈ کی چادر درست کی۔ اپنا زیور ڈبوں میں رکھا۔ رات کے کپڑے ہینگر میں لٹکائے تب ہی میری نند اندر آ گئی۔

''آپ ناشتہ یہیں کریں گی یا ہم سب کے ساتھ؟''

''سب کون؟'' میں پوچھ تو نہ سکی لیکن شاید اس نے میرے چہرے پر یہ سوال پڑھ لیا تھا

''امی اور ہم بہنوں کے ساتھ، کیونکہ مضراب اور ابو تو جا چکے ہیں۔''

''میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی ناشتہ کرلوں گی۔'' میں نے دوپٹہ درست کیا اور اس کے

ساتھ باہر آ گئی۔

پہلی بار میں گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔

چار کمروں پہ مشتمل یہ گھر کوئی سات آٹھ مرلے کا ہوگا۔ دو کمروں کے آگے درمیانہ سا برآمدہ تھا اور اس کے بعد چھوٹا سا صحن، صحن کے ایک طرف کچن اور باتھ روم تھا۔ دوسری طرف میرا کمرہ تھا بمع اٹیچڈ باتھ۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم تھا۔ سامنے گھر میں داخل ہونے کے لیے بڈاری تھی جہاں میں نے موٹر سائیکل کھڑی دیکھی تھی۔ جو اس وقت نہیں تھی۔ یقیناً وہ مضراب کے استعمال میں ہوگی۔ گھر کی کنڈیشن اور ساز وسامان ان کی اچھی حیثیت کا پتا دیتا تھا۔ میں سلام کرتے ہوئے ان لوگوں کے درمیان میں بیٹھ گئی۔ وہ سب برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ میرے بیٹھتے ہی دستر خوان بچھ گیا۔

''کل سے ناشتے پہ امی ابو تم اور مضراب ہوں گے۔''

میں نے اپنی بڑی نند کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں خود بھی اپنی اس حرکت پہ حیران تھی۔ میں جو تڑاخ سے جواب دے دیتی تھی اب بنا بولے کیسے رہ رہی تھی۔

''ارے بھئی، ہم تینوں تو آج شام کو اپنے اپنے گھر چلی جائیں گی پھر تو تم ہوگی اور امی ابو۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ناشتے پہ گپ شپ ہوتی رہی میں چپ چاپ صرف مسکراتی رہی۔

دن ایسے ہی مصروفیات میں پر لگا کر گزر گیا۔ شام کو نبیل کھانا لے کر آیا تو میں حیران رہ گئی۔

''کس نے بنایا ہے یہ سب کچھ؟''

''بریانی، شامی کباب، کڑاہی گوشت، سلاد، رائتہ۔ یہ سب اماں کے ہاتھ کا تو نہیں تھا۔''

صدف آئی ہوئی تھی۔ اس نے بنایا ہے سب کچھ۔'' نبیل نے بتایا۔ ''وہ ادھر ہی رکے گی۔ شاید میں صبح کا ناشتہ بھی لے آؤں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے فالتو خرچ کرنے کی۔'' میں نے نبیل کو ڈپٹا۔

وہ ہنسنے لگا۔ ''ابھی تک ویسی کی ویسی ہی ہو۔'' میں نے نبیل کو گھورا نبیل اور مضراب کے درمیان بس دعا سلام ہی ہو سکی۔ نبیل چلا گیا تو مضراب نے اس سارے کھانے کو دیکھا جو میں کچن میں رکھنے جا رہی تھی۔

''کیا ضرورت تھی اس تکلیف کی۔ یہ سب کچھ تو یہاں بھی بنتا رہتا ہے۔''

''یہ سب کچھ میں نے کہہ کر تو نہیں منگوایا۔'' میرے لہجے میں تلخی سی تھی۔ مضراب خاموش ہو گیا۔ اسے شاید زیادہ تو تو میں میں کی عادت نہیں تھی۔

میں بھی خاموشی سے برتن کچن میں لے آئی۔

رات کو سب نے یہی کھایا اور ہمارے گھر کے کھانے کی تعریف کی، کھانا کھا کر نندیں چلی گئیں۔

مضراب اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور میں جویریہ، ماریہ کے ہمراہ اپنے ساس سسر کے پاس بیٹھی رہی۔ گپ شپ ہوتی رہی۔ درمیان میں میں نے دو بار چائے بھی بنائی۔

"رات کافی ہو رہی ہے۔ جویریہ، ماریہ تم لوگوں نے صبح اسکول بھی جانا ہے اور نمرہ بیٹا! تم بھی جا کر آرام کرو۔ مجھے بھی ابھی عشاء کی نماز پڑھنی ہے۔"

امی کے کہنے پہ ہم سب باری باری اٹھ گئے۔

میں کمرے میں آئی تو وقت دیکھ کر مجھے بھی حیرانی ہوئی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ مضراب ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے ضرور پوچھے گا کہ اتنی دیر سے تم کہاں تھیں۔ ظاہر ہے وہ میرے انتظار میں ہی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ مگر میری یہ خوش فہمی فوراً ہی دور ہو گئی۔

جب میں بستر کی طرف بڑھی تو اس نے عام سے انداز میں کہا۔

"لائٹ آف کر دو۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا اور لیٹ گیا۔

"اتنی دیر سے کیوں جاگ رہے تھے۔ سو جاتے۔" میں نے لیٹتے ہی کہا تو مضراب نے میری طرف کروٹ لے لیا اور مجھے خود سے قریب کر لیا۔

"تمہارے بغیر اب نیند نہیں آتی۔" اس کی یہ سرگوشی میرے من کے تار ہلانے لگی۔

"کیوں! ایسی کیا خاص بات ہے مجھ میں؟" میں نے اترا کر پوچھا۔ شاید میں اپنی تعریف سننا چاہ رہی تھی۔

"پتا نہیں۔" مضراب کا لہجہ بوجھل اور نشیلا تھا۔

میں اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ گفتگو کے موڈ میں نہیں تھا۔ رات خاموشی سے سرکتی چلی گئی۔

☆☆☆

آج صبح پہلے میری آنکھ کھلی تھی۔ مضراب بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے لگی۔ اس کے خدوخال جاذب نظر تھے۔

"بندہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ میں مسکرائی اور بال سمیٹتے ہوئے واش روم میں چلی گئی۔

"کیوں نہ آج موصوف کو اس طرح جگایا جائے کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ یعنی کوئی

دھنک سا انداز یا کوئی شرارتی انداز۔"

مگر واش روم سے نکلتے سارا رومنک اور شرارتی انداز دھرا کا دھرا رہ گیا۔ جب میں نے کمرہ خالی پایا۔

یکدم ہی میرا موڈ آف ہو گیا۔ میں نے بال جھٹک کے پیچھے کیے تب ہی میرے بالوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔

میں ڈر کر جو اچھلی تو کسی سے ٹکرا گئی۔ پیچھے ہی مضراب کھڑا تھا۔

"صبح بخیر.....؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ابھی تو وہ کمرے میں نہیں تھا اچانک کہاں سے آ گیا۔

"کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"یونہی بس۔" میں نے سر جھٹکا اور خفیف سا مسکرا دی۔

"ڈر گئی تھیں مجھ سے؟"

مجھے ہنسی آ گئی "اتنے بھی ڈراؤنے نہیں ہیں آپ۔"

"یعنی کچھ کچھ ڈراؤنا ہوں۔" یہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ میں نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اچھا لگ رہا تھا۔

میرا دل چاہا لمحے یونہی تھم جائیں۔

"بتاؤ نا۔ کیا تمہیں پتا تھا کہ میں کمرے میں ہوں؟" میں جو اس سے کسی پیار بھری بات کی توقع کر رہی تھی، یک دم بیزار ہو گئی۔

"کیا ان لمحات میں ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟"

"مثلاً....." وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"یعنی اب یہ بھی مجھے ہی بتانا پڑے گا۔" میں نے سر آہ کھینچی تو وہ ہنس پڑا۔

"ظاہر ہے، بات تم نے شروع کی ہے۔"

اور میں نے سوچا۔ اگر میں جل کٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی تو مضراب کی مجھ سے دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت میں اس کی توجہ کا محور ہوں اس لیے اپنی بے زاری پہ قابو پا کر بولی۔

"یہ بتائیں، میں آپ کو کیسی لگی؟"

"کیا مطلب؟ جیسی تم ہو ویسی ہی لگیں۔ ظاہر ہے تمہیں یہاں مشترکہ پسند سے ہی لایا گیا ہے۔"

"افوہ!" میں اس کے جواب پہ جھنجھلا گئی۔

"میرا مطلب ہے پہلے دن سے اور اب تک۔"

"پہلے دن مغروری، دوسرے دن روکھی ہوئی۔ تیسرے دن گم صم اور آج چوتھا دن ہے کچھ کچھ بے وقوف سی۔"

"کیا مطلب؟" میں چلا پڑی۔ مجھے سخت غصہ آیا۔

"ایک بھی دن آپ نے میری شخصی کی صحیح ترجمانی نہیں کی اور یہ بتائیں میں نے آج کون سی بے وقوفی کی ہے؟"

"یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ خوامخواہ وقت ضائع کر رہی ہو۔ تمہیں ناشتے کی فکر ہو نہیں۔ مجھے ساڑھے سات بجے جانا ہوتا ہے۔"

"وقت میں نہیں آپ ضائع کر رہے ہیں۔" میں نے اس کے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ میں اپنے اصل موڈ میں آ چکی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔ "ایک ہی بات ہے۔" میرے بالوں کو چھیڑتا ہوا وہ واش روم میں چلا گیا۔

میں بالوں کی چوٹی بنا کر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کچن میں آ گئی اور ناشتہ بنانے لگی۔ میرا ذہن عجیب سی سمت پرواز کر رہا تھا۔ وہ سمت میرے لیے کچھ نامانوس بھی نہیں تھی۔ وہ سارے ڈرامے جن میں، میں نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ مگر میں مرد ہوتا تو کتنا انجوائے کرتا ان لمحوں کو۔ اور اس لڑکی کو اپنے پیار بھرے جذبات کا کتنی خوبصورتی سے یقین دلاتا کہ وہ میری جیون ساتھی ہونے پہ فخر کرتی۔ مگر یہ قسمت کی ستم ظریفی نہیں تو کیا تھی۔ ہمیشہ میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ مجھے کیا خاص سا مرد ملا تھا۔

☆☆☆

جویریہ اور ماریہ اسکول چلی جاتی تھیں۔ گھر پر میں اور امی ہوتے تھے۔ امی کو زیادہ بولنے کی عادت نہیں تھی۔ میرا زیادہ وقت کمرے میں گزرتا۔ مضراب صبح کا گیا رات کو آتا۔ رات کا معمول سے گزرتی اگر میں کسی روز مضراب کا ہاتھ جھٹک دیتی یا کروٹ بدلتی تو وہ چپ چاپ سو جاتا نہ کوئی شوق، نہ دلچسپی نہ لگاوٹ کیسی روکھی پھیکی سی زندگی گزر رہی تھی۔ ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ نبیل مجھے لینے آ گیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اماں کو بخار ہو گیا تھا۔ میں نبیل کے ساتھ گھر آ گئی۔ اماں کی حالت دیکھ کر میں تڑپ اٹھی اور جو بے دلی اور بے زاری مجھ پر طاری تھی سب بھول گئی۔

میرے آنے کے بعد مضراب بھی اماں کی طبیعت پوچھنے آیا تھا۔ دو دن بعد وہ دوبارہ پہلے کی نسبت اماں کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ اماں کا اور نبیل کا خیال تھا کہ مضراب مجھے آ ضرور ساتھ لے جائے گا۔ لیکن وہ مجھے ساتھ لے کر نہیں گیا۔ جس سے اماں اور نبیل کو تو بہت خو

ئی لیکن مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔

مجھے پورے سات دن ہو گئے تھے یہاں آئے ہوئے۔ ایک بھی دن اس نے نہ تو مجھے نا کیا تھا۔ نہ ہی مجھ سے کوئی بات کی تھی۔ بس اماں کے سامنے ہی جو دعا سلام ہو جاتی بس وہی وتی تھی۔ پھر اماں مضراب کے بیٹھتے ہی مجھے اس کی خاطر تواضع کے لیے دوڑائے رکھتیں۔ کیا میں ں کے لیے اتنی ہی غیر اہم تھی۔ مضراب کا رویہ اکثر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس کی ذات میں کتنا ٹھہراؤ اور سکون تھا۔ مجھے مضراب سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

نجانے یہ افسردگی کب تک قائم رہتی کہ اچانک موسم نے پلٹا کھایا۔ آسمان پہ امنڈتی کالی دلیاں اور تیز ہوائیں اور پھر چھاجوں چھاج برستا مینہ ساون کا جیسے آغاز ہو گیا تھا۔

بارش بھی ایسی ایسی ہوئی تھی کہ ہر شے نکھر گئی تھی۔ ہوا کی ٹھنڈک سے کپکپی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میں دوڑ دوڑ کر اماں کے گملے اٹھا کر صحن میں رکھ رہی تھی۔ اس وقت اماں اور میں ہی گھر میں کیلے تھے۔ اماں برآمدے میں بیٹھی مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

"پگلی! ٹھنڈ لگ جائے گی تجھے۔ دو گھنٹے سے بارش میں نہا رہی ہے۔ ہوا بھی تیز ہے۔"

"اماں! میں تمہارے گملوں کو نہلا رہی ہوں۔ دیکھنا کیسی کونپلیں پھوٹیں گی۔ سارے گملے بھر جائیں گے۔"

"اچھا بس کر۔ نبیل آتا ہی ہو گا۔ تلی ہوئی مچھلی لے کر آ رہا ہے وہ۔ تو جلدی سے نہا کر کپڑے بدل لے۔ شاید آج مضراب بھی تجھے لینے آ جائے۔"

میں نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ اماں اپنی دھن میں مگن چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔

میں نہانے چلی گئی۔ بسنتی رنگ کا شیفون دوپٹے کا لان کا یہ جوڑا میں نے اسی خیال کے ت پہنا تھا کہ مضراب مجھے لینے آئے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا بارش تھم گئی۔ پھر شام سے رات ہو گئی۔ اور رات سے پچھلا پہر مجھے روٹیں بدلتے بدلتے بیت گیا۔

"کیا وہ مجھے یاد آ رہا ہے؟ نہیں۔ پھر میں کیوں شام ڈھلے سے اس کا انتظار کر رہی کیا ساون کی پہلی بارش نے اس کے من کو نہیں جھنجوڑا ہو گا۔ کیا اسے میری یاد نہیں آئی ہو گی؟ یا مجھ میں ایسا کچھ نہیں جو مضراب محمود کو جھنجھوڑ سکتا۔" اپنی کم مائیگی کے احساس سے میری آنکھوں آنسو نکل پڑے۔

نبیل باہر برآمدے میں سو رہا تھا اور اماں مجھ سے کچھ فاصلے پر خراٹے لے رہی تھیں۔

پپن کی محرومیاں پھر سے میرا احاطہ کرنے لگی تھیں۔ اس وقت مجھے منال بہت یاد آئی۔ اور میرا

دل چاہا کہ میں اس سے اپنا دکھ شیئر کردوں۔ لیکن رات کے گیارہ بجے اسے ڈسٹرب کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا اور یونہی کروٹیں بدلتے بدلتے میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح نہایت ہی خوشگوار تھی ہلکی ہلکی دھوپ ہر سو پھیلی تھی اور ہوائیں پرشور تھیں۔ گھر بـ غیر معمولی چہل پہل سے میری آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اماں نے مجھے جگایا ہی نہ تھا۔ میں اٹھی تو دنگ رہ گئی۔ سامنے ہی منال اماں سے باتیں کررہی تھی اور پھر مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ سے لپٹ گئی۔

"رات ہی میں تمہیں یاد کررہی تھی اور تم صبح آن بھی ٹپکیں۔" میری خوشی بھی دیدنی تھی۔

"اسے ہی تو کہتے ہیں دل کو دل سے راہ دو روپے کا ایس ایم ایس کرنے کی بھی فرصـ نہیں تھی تمہیں۔ یاد ہے، کوئی بھی بارش ہم نے اکیلے انجوائے نہیں کی۔ ہمیشہ تمہارا فون پہلے آجاتا اور میں سوچتی رہ جاتی تھی۔ اور اب رات بارش تھمنے تک تمہارا انتظار کرتی رہی۔"

منال کی بات نے مجھے رنجیدہ کردیا۔

"پھر دل کو یہ سوچ کر سمجھا لیا کہ اس وقت تم اپنے پیا کے ساتھ بارش میں نہارہی ہوگی لیکن جب صبح آنٹی سے بات ہوئی تو پتا چلا تم یہاں ہو بلکہ کئی روز سے۔ بس پھر رکا ہی نہیں گیا۔ بتاؤ چکر کیا ہے؟ اتنے دن سے یہاں کیوں پڑاؤ ڈالا ہوا ہے؟"

"اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے آئی تھی۔ تم بیٹھو میں ابھی فریش ہوکر آتی ہوں۔"

اس کے بعد ہم نے اکٹھے ہی ناشتہ کیا۔ منال کے پاس اپنے منگیتر کی بے شمار باتـ تھیں۔ اس کے والہانہ جذبات تھے جو وہ مجھ سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ اسی وجہ سے آئی تھی۔

"فیضی کی تو شادی کی بہت جلدی ہورہی ہے۔ پر ابو کہتے ہیں پہلے راحیل کی شادی ہوگ تب منال کی شادی کریں گے۔ مگر راحیل صاحب کو کوئی لڑکی ہی پسند آکر نہیں دیتی۔ یار تم ہی کوئی لڑکی بتادو۔"

"بہت جلدی ہورہی ہے تمہیں شادی کی۔"

میری بات پہ منال جھینپ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"فیضان مجھے خودکشی کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ کہتا ہے۔ اگر اس سال کے اینڈ تک نے ہمارا نکاح نہ پڑھایا تو میں اپنی جان دے دوں گا۔"

"اور تم اس کی دھمکیوں میں آگئیں؟"

"یار...... سچ پوچھو ناں تو وہ ایسا ہی پاگل ہے۔ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اب یہ دیکھو زبردـ

اس نے مجھے یہ رنگ پہنائی تھی۔ حالانکہ ہمارے ہاں یہ رواج بھی نہیں ہے اور امی ابو نے بھی بہت برا مانا تھا۔ مگر موصوف نے فرمایا "اپنی چیز پہ مہر لگا رہا ہوں" یقین کرو کوئی اور ہوتا ناں تو جوتوں سے پٹتا مگر ابو کا اکلوتا بھتیجا تھا سو ابو کو برداشت کرنا ہی پڑا۔"

"اور تم بھی بے شرموں کی طرح انگوٹھی پہن کر پھر رہی ہو۔"

"تو کیا کروں...... فون کر کر کے ناک میں دم کیے رکھتا ہے، کل رات بھی دو گھنٹے بات کی ہے۔"

"خوش نصیب ہو تم۔ زندگی کے ہر دور میں تمہیں چاہنے والے ہی ملے۔ یہاں تو بچپن سے اب تک ہر چیز چھین کر ہی لینا پڑی ہے۔"

"کیا مطلب؟" منال مجھے دیکھ کر چونک گئی۔

"نمرہ...... ادھر دیکھو میری طرف۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم خوش نہیں ہو۔"

"نہیں، ٹھیک ہی ہے سب کچھ۔"

میرے لہجے کی تھکن منال کی رگ دپے میں اتر گئی۔ "نہیں تم جھوٹ بول رہی ہو۔ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔"

"یار تم اتنی زبردست رومنٹک لڑکی اور...... نہیں یہ ہو نہیں سکتا۔ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ معاملہ کیا ہے۔ کوئی بھی شخص تمہاری سنگت پہ ناز کرسکتا ہے۔ تم کہیں بھی ہوتی تھیں اپنا آپ منوالیتی تھیں۔ پر آج ٹوٹی بکھری کیوں لگ رہی ہو۔"

میں نے منال کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "سچ بتاؤں اب میں اپنا آپ منوانا نہیں چاہتی۔ کیوں ہمیشہ ہی کوششوں سے خوشیاں میرے حصے میں آتی ہیں۔ قدرتی طور پہ سب کچھ کیوں نہیں ہوتا۔ فیضان بھی تو تم سے محبت کرتا ہے۔ کیا یہ محبت پانے کے لیے تم نے کوششیں کی تھیں۔ نہیں ناں ایسا میرے ساتھ کیوں نہیں ہوا؟"

"شاید اس لیے کہ تمہیں محبت کا اظہار کرنے کا زیادہ سلیقہ ہے۔ پتا ہے کیا۔ جب فیضان نے پہلی بار تمہارے وہ لولیٹرز اور وشز کارڈز دیکھے تھے تو سخت جذباتی ہوگیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کسی لڑکی کے ہیں۔ اب اتنا ہنر تو ہر ایک میں نہیں ہوتا ناں۔"

میری بات پہ منال نے مجھ سے نظریں چرالیں۔

فیضان تو اسے سیراب کررہا تھا جبکہ میں پھر پیاسی کی پیاسی تھی۔

"یار! بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جنہیں چاہنے سے زیادہ چاہے جانا پسند ہوتا ہے۔" منال اپنی انگلی میں رنگ ہلاتے ہوئے سر جھکا کر ایسے کہہ رہی تھی جیسے اعتراف جرم کررہی

ہو۔''ہوسکتا ہے مضراب بھائی کی بھی ایسی ہی طبیعت ہو۔''

میں اس کی بات پہ ہنس پڑی ایک کھوکھلی اور بے جان ہنسی۔

''چاہنا یا چاہے جانا چاہت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔اور چاہت کبھی چھپی نہیں رہتی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ہر احساس سے عاری ہے اور اس میں کسی چیز کی چاہت ہی نہیں۔''

''ایسا نہیں ہوتا۔'' منال نے سختی سے تردید کی۔

''میں نے حیرت سے منال کی طرف دیکھا تم خوامخواہ ایک اجنبی شخص کی حمایت کر رہی ہو۔''

''بے شک مضراب بھائی میرے لیے اجنبی ہیں۔لیکن ...ت کے جذبے ہر ایک کے لیے آشنا ہوتے ہیں۔تم اگر اسے پیار اور توجہ دو تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ تمہاری طرف متوجہ نہ ہو۔اسے وش کرنے کے ایسے مواقع ڈھونڈو کہ وہ چونک جائے۔''

''یعنی ایک مرد کو محبت کرنا میں سکھاؤں گی۔'' میں خود پہ ہنسی۔

مجھے غیر سنجیدہ دیکھ کر منال خاصی جذباتی ہو گئی۔

''یا تو یہ چیلنج تم خود قبول کر لو۔ ورنہ میں یہ کر کے دکھا سکتی ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔اور اس کی سنجیدگی نے مجھے چونکنے اور سوچنے پہ مجبور کر دیا۔اتفاق سے منال کے جاتے ہی میری ساس کا فون آ گیا۔انہوں نے پہلے اماں کی خیریت دریافت کی۔جب میں نے بتا کہ الحمدللہ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں تو انہوں نے الٹا شکوہ کیا۔

''اگر تمہاری اماں کی طبیعت سنبھل گئی تھی تو تمہیں گھر آ جانا چاہیے تھا۔دو روز سے مضراب کو سخت بخار ہے اور وہ گھر میں پڑا ہوا ہے۔''

''اگر دو روز پہلے ہی مجھے اس بات کی اطلاع مل جاتی تو میں یہاں رکتی ہی کیوں۔'' مگر میں یہ بات اپنی ساس سے کہہ نہ سکی اور جی جی کر کے فون بند کر دیا۔

میں اسی وقت نبیل کے ہمراہ گھر آ گئی۔مضراب ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا تھا۔گھر میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔مضراب کی بڑی بہنیں آئی ہوئی تھیں۔میں سلام دعا کر کے بیٹھی ہی تھی کہ ا... شروع ہو گئیں۔

''میاں کی طبیعت خراب ہے اور تم ہو کہ اماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔''

''لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔اتنے دن جا کر بیٹھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

''ہم تو اتنا حیران ہوئے کہ نو دن سے مسلسل تم اپنے میکے میں ہو۔آج کل کے دور میں تو کوئی نو گھنٹے بھی نہیں چھوڑتا۔اکلوتی ایک بہو۔وہ بھی اتنا میکے میں رہے گی تو مضراب کی شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

اب وہ اپنی ماں سے مخاطب تھی۔میں اس اچانک پیشی کے لیے تیار نہیں تھی کہ ساس کی طرف سے بیان آیا۔

''بھئی میں تو ان میاں بیوی کے معاملے میں مداخلت نہیں کرتی ہوں نہ کروں گی۔ان دونوں کے درمیان کیا طے پایا تھا،یہ انہیں ہی پتا ہو گا۔''

ان سب باتوں کا میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔

''مجھے کوئی اطلاع کرتا یا لینے آتا تو میں کیوں رکتی فوراً آ جاتی لیکن کسی نے بھی میری بات پہ توجہ نہ دی۔سب کا زور اسی بات پہ تھا کہ مجھے دو تین روز بعد خود ہی آ جانا چاہیے تھا۔

☆☆☆

مضراب ڈاکٹر سے دوا لے کر آ چکا تھا۔اس کی بہنیں اس کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔سو مجھے بھی اپنی اہلیت دکھانی چاہیے تھی لیکن پانچ بہنوں کے ہوتے ہوئے مجھے یہ موقع نہ مل سکا اور میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی۔مضراب کے آنے تک میں نے کمرے کی حالت درست کر لی تھی۔

کمرے میں کاغذ کے پھولوں کی آرائش اور بے وجہ کے دل وغیرہ میں نے سب نوچ کھسوٹ کر پھینک دیے سادگی سے کمرے کی دلکشی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

تب ہی مضراب کمرے میں داخل ہوا۔اس نے حیرت سے کمرے کی دیواروں کو دیکھا پھر میری طرف'اور چپ چاپ بستر پہ لیٹ گیا۔پتا نہیں اسے اچھا لگا تھا یا برا۔

میں بھی منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے واش روم میں چلی گئی۔تولیے سے ہاتھ منہ پونچھ کر میں نے ایک طرف لٹکایا۔اور مضراب کے قریب آ گئی۔

اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بخار نے اسے جھنک ڈالا ہے۔شیو اچھی خاصی بڑھی ہوئی تھی۔اور یہ دو دن کی شیو نہیں تھی۔قریباً آٹھ دن کی ضرور ہو گی۔تو کیا اس نے میرے ہجر میں یہ حال کر لیا تھا۔

ہائے رے خوش فہمی۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' یہ سوال کرتے ہوئے من ہی من میں'میں سوچ رہی تھی اگر مجھ سے اس سچویشن میں میرا محبوب پوچھتا تو میں کہتی۔

''ان کے دیکھنے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق''

پھر ہاتھ تھام کر اپنی شدتوں کا اظہار کرتی۔مگر وہاں سے تو وہی بوسیدہ سا جواب آیا۔

''ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک تو نہیں ہے۔یہ حالت کیا مجنونانہ سی بنا رکھی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے مضراب کا ہاتھ تھاما اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"دروازہ کھلا ہے۔ کوئی اچانک آ بھی سکتا ہے۔" اس نے تنبیہہ کی۔ تو میرا منہ ایک دم کڑوا ہو گیا۔ پھر بھی میں ڈھٹائی سے بیٹھی رہی۔

"تو آ جائے میں کوئی جرم کر رہی ہوں۔" مضراب نے مجھے چونک کر دیکھا۔

"تو دن میں خاصا چینج آ گیا تم میں۔"

ایک اور دل جلانے والا جملہ۔ میں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور مسکرا کر بولی۔

"آپ نے مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ میری خوش اخلاقی تو آپ سے چھپی نہ رہتی۔"

"خوش اخلاقی!" وہ طنزیہ مسکرایا۔

"آج سے قبل تو میں نے تمہیں کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ہی مجھ سے لڑتی ناراض ہی رہی ہو۔ بلکہ میں تو خود حیران ہوں کہ مجھے بیمار پا کر تمہیں کاہے کی خوشی ہو رہی ہے۔"

میری برداشت جواب دے گئی۔ میں مضراب کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"درست سمجھا آپ نے۔ آپ کو بیمار پا کر میرا کروڑوں کا فائدہ ہو رہا ہے۔ مجھے تو خوب جشن منانا چاہیے۔"

وہ چپ چاپ میرا منہ دیکھتا رہا۔ پھر مجھے خود ہی خیال آیا۔ اور میں نے خود کو نارمل کیا۔

"اگر آپ کی طبیعت اتنی ہی خراب تھی تو مجھے فون کیوں نہیں کیا؟"

"میری دیکھ بھال کرنے کے لیے یہاں بہت سے لوگ تھے۔" وہی روٹھا سا جواب۔

"تو کیا ان بہت سے لوگوں میں میری کوئی اہمیت نہیں؟" میرے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔

"دن ہی کتنے ہوئے ہیں تمہیں میری زندگی میں آئے ہوئے۔ فقط بیس دن اور ان بیس دن میں سے نو دن تو تم اپنے میکے میں رہی ہو۔"

"میں اپنی مرضی سے تو جا کر نہیں بیٹھی تھی۔ ضرورت تھی تو بلا لیتے۔" میں نے تنک کر کہا۔

"الحمدللہ میری سب ضرورتیں ہمیشہ بغیر کہے پوری ہو جاتی ہیں۔" لہجے کی ٹھنڈک مجھے اندر تک بھڑکا دیا۔

"آخر آپ کی ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟" میں اس کے سر پہ جا پہنچی۔

"میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں نے دوا لی ہوئی ہے اور مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس۔ اسی سرد انداز میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پہ وہی سرد مہری تھی۔ جس نے مجھے ا تک جھلسا کر رکھ دیا تھا بہت دیر تک میں صوفے پہ یونہی بیٹھی رہی۔ جب کہ وہ سو چکا تھا۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹس آف کیں اور بیڈ کے دوسرے کنارے پڑ گئی۔ اس شدید گرمی میں اے سی کی کولنگ نے کمرے کو ٹھیک ٹھاک جنت بنا رکھا تھا۔ مضراب کا

سردی لگ رہی تھی۔ اس نے کمبل ٹانگوں پہ پھیلا رکھا تھا۔ یونہی لیٹے لیٹے مجھے خیال آیا تو میں نے اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ جو اس کے مزاج کی طرح بالکل سرد ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کولنگ تھوڑی سی کم کر دی اور واپس آ کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں بستر پہ اکیلی تھی۔ بیمار غائب تھا۔ میں ہڑبڑا کر تیزی سے باتھ مضراب کو الماری میں کچھ تلاش کرتا پایا وہ بہت عجلت میں تھا۔ اور اپنی دکان پہ جانے کے لیے نکل تیار تھا۔

"اگر آج کی بھی چھٹی کر لیتے تو کیا ہو جاتا۔" میں نے اس کی طبیعت کے خیال سے ہی تو کہا تھا۔

مگر اسے اس بات کا کیوں احساس ہوتا۔ وہی سرد جوابات کا نزول شروع ہو گیا۔

"پہلے ہی دو چھٹیاں ہو چکی ہیں اور پھر گھر میں پڑ کر ملتا بھی کیا ہے۔"

یہ دوسرا جملہ جو ذرا آہستگی سے کہا تھا میں نے با آسانی سن لیا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کھڑی ہو گئی۔

"ایک بیمار انسان کو گھر میں رہ کر سکون ہی چاہیے ہوتا ہے اور وہ آپ کو با آسانی مل جاتا ہے۔"

"سکون انسان کے اندر ہوتا ہے اگر وہاں نہ ہو تو پھر کہیں نہیں ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ چلا گیا اور میں اس کے اس چھوٹے سے جملے میں جو فلسفیانہ بھی تھا اور معنی خیز بھی کھو سی گئی۔

زندگی پھر معمول پہ آ گئی۔

میں دوپہر کا کھانا پکا کر ابھی فارغ ہو کر لیٹی ہی تھی کہ منال کا فون آ گیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے سن گن لینے کے لیے بے چین ہو گی۔ مگر میرے پاس تو کوئی خبر نہ تھی۔ میں نے بے دلی سے فون اٹینڈ کیا۔ وہ مجھے سالگرہ کی مبارک باد دے رہی تھی۔ لطف دور ہونے لگی۔ میں کسی کے لیے تو اہم تھی۔

"صبح سے اب خیال آیا ہے۔" میں نے شکوہ کر ڈالا۔

"ذرا اپنے فون پہ میسج دیکھو کتنے ہیں۔" وہ الٹا ڈپٹ کر بولی تو میں خاموش ہو گئی۔ اب یہ دیکھنے کی فرصت کہاں تھی۔

"اچھا سنو۔ رات کھانے پہ ہماری طرف آ جاؤ۔ مضراب بھائی کے ساتھ۔"

"پتا نہیں وہ کیا محسوس کریں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا بوریت ہے یار۔ میں کیا تمہیں کسی کلب یا ہوٹل میں انوائٹ کر رہی ہوں۔"

"اچھا!" میں نے ہار مان لی۔ "شام کو آئیں گے تو پوچھ لوں گی۔"

"شام کو کیوں۔ ابھی فون کر کے پوچھ لو نا۔ کیا فون نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟"

چلو ٹھیک ہے۔ میں ابھی کال بیک کرتی ہوں۔"

میں نے معراب کا نمبر ملایا۔ دوسری ہی بیل پہ اس نے فون اٹھا لیا۔ میں پہلی بار معراب سے فون پہ بات کر رہی تھی۔

ماؤتھ پیس سے اس کے سلام کی آواز ابھری اور تب ہی میرے دل میں اچانک شرارت جاگی۔ کیوں نہ اسے ستاؤں۔ رانگ نمبر بن کر.....

"ہیلو!" میں نے آواز بدل کر کہا۔

"جی!" لہجے میں وہی ٹھہراؤ آ گیا جو میرے لیے مخصوص تھا۔ اور جس سے مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ میری آواز پہچان گیا ہے۔ میں خاموش ہو گئی۔

"کیسے فون کیا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا اور میری خوش فہمیاں مجھ پہ ہنس رہی تھیں۔ جتنا بدھو میں اسے سمجھتی تھی وہ اتنا بدھو نہیں تھا۔

"میں یہ پوچھ رہی تھی کہ شام کو آپ مصروف ہیں یا....."

"کیا مطلب کوئی کام ہے کیا" ابھی میرا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے سوال جڑ دیا۔

"ہاں کہیں جانا تھا۔ ہم لوگ ڈنر پہ انوائٹ ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں گھر آؤں گا تو پھر بات کریں گے۔" اس نے کہتے ہی فون بند کر دیا۔

اور میں سوچنے لگی۔ دو نئے نویلے میاں بیوی کے درمیان ایسی گفتگو بھی ہو سکتی ہے۔ اکہ بے ربط اور بے رس..... خیر میں نے رات کی ساری تیاریاں مکمل کر لیں۔

رات کو آتے ہی اس نے پوچھا تھا "کہاں جانا ہے؟"

"میری دوست ہے منی اس نے انوائیٹ کیا ہے۔" میں نے بتایا۔

"کس قسم کا ڈنر ہے؟"

"وہ یہ ڈنر میری ہی خوشی میں دے رہی ہے۔ تمام کزنز اور دوست وہیں اکٹھی ہوں گی۔"

"کیسی خوشی؟" معراب کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

"آج میرا جنم دن ہے۔" میں نے آہستگی سے بتایا۔ میرا خیال تھا شائد وہ بھی مجھے کرے اور کہے کہ "تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔"

"تو تم ہر سال اپنی سالگرہ پہ کیک کاٹتی ہو۔" اس کے چہرے پہ استہزائیہ مسکراہٹ تھی

"اگر ایسی ہی بات تھی تو مجھے بتا دیتیں میں کیک وغیرہ یہیں لا دیتا۔ اب یہ سب تکلیف کرنے تم

کے گھر جاؤ گی۔ مجھے تو بہر حال یہ سب اچھا نہیں لگا۔ اگر تمہیں یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے تو میں روکوں گا بھی نہیں۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

اپنی بے قدری اور اس کے خشک رویے پہ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے منال کو تو فون پہ انکار کر دیا پر اپنی آنکھوں میں آتی نمی کو نہ روک سکی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب میں بستر میں لیٹی تو میرا تکیہ بھیگتا چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ معراب کمرے میں کب آیا۔ جب وہ لائٹ آف کر کے میرے قریب لیٹا تو اسے محسوس ہو گیا کہ میں رو رہی ہوں۔

اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے اس نے لائٹ جلا دی اور میرے سامنے آ گیا۔

"تم رو رہی ہو؟" اس کے لہجے میں محبت نہیں حیرت تھی۔

میں نے انگلیوں سے آنسو جذب کرتے ہوئے آنکھیں میچ لیں۔

"اگر تم اپنی سالگرہ منانا چاہتی ہو۔ تو میں ابھی تمہیں کیک اور دیگر اشیاء لا دیتا ہوں۔ مگر میں رونے والی کون سی بات ہے۔ تم اب بھی اپنی سالگرہ منا سکتی ہو۔ اور یہ بات تمہیں مجھے پہلے ادینی چاہیے تھی کہ تم سالگرہ مناتی ہو۔"

اس کی گفتگو پہ میں اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ اور اس سے زیادہ خود پہ کیوں نہ خود پہ ضبط رکھی، کیوں خوامخواہ تماشا بن رہی ہوں۔

جو شخص صرف کیک کاٹنے کو ہی سالگرہ سمجھتا ہو، اس کے سامنے جذبوں کی کیا تشریح کی سکتی تھی۔

"دیکھو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ پلیز اٹھو، میں ابھی تمہیں یک لا دیتا ہوں۔ تم اب بھی سالگرہ منا سکتی ہو۔"

"فار گاڈ سیک....." میں چلا پڑی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا آپ کچھ دیر مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے؟" میں گھٹی گھٹی آواز میں اتنا ہی کہہ سکی۔ پھر کہ واش روم میں چلی گئی۔ قسمت پتھر سے پھوٹ جاتی یا معراب سے ایک ہی بات تھی۔ وہ شخص یوں سے عاری تھا۔

میں کئی دن سے نوٹ کر رہی تھی۔ معراب اپنے موبائل پہ زیادہ ہی مصروف رہنے لگا ۔اور یہ سب میں جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔

ہر ماہ کی دوسری تاریخ پہ وہ مجھے معمول کے مطابق جیب خرچ دیتا تھا جس کی مجھے خاص ورت نہیں ہوتی تھی اور وہ میں ایسے ہی دراز میں ڈال دیا کرتی۔ آج بھی جب وہ مجھے جیب خرچ

دے رہا تھا تب ہی اس کا سیل فون بج اٹھا میرے سامنے ہی اس نے تین بار لائن کاٹی مگر کرنے والا مستقل مزاج ہی تھا۔ بالآخر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے پیسے دراز میں ڈال دیے۔

چھ ماہ میں ٹھیک ٹھاک رقم جمع ہوگئی تھی۔ اگر میں انہیں تحائف میں اڑاتی تو آج یہاں ایک روپیہ بھی نہ ہوتا۔ مگر اب میں تحفہ دیتی بھی تو کسے؟ مضراب کو.....آہ مجھے اپنی انسلٹ اچھی طرح یاد تھی۔

شادی کے دو ماہ بعد جب میں نے مضراب کے لیے ایک شرٹ اور ایک پرفیوم خریدا اور اسے اچھی طرح پیک کر کے مضراب کو دیا تو اس نے بڑی بے دلی سے اسے دیکھا اور کہنے لگا۔

"تم نے خوامخواہ ایسا تکلف کیا۔ میرے ہی پیسوں سے مجھے ہی گفٹ دے دیا۔ یہ پیسے تو میں تمہیں تمہارے خرچ کے لیے دیتا ہوں۔ اگر ان کو مجھ پر خرچ کر دو گی تو اپنی ضرورتیں کہاں سے پوری کرو گی۔"

اف میں بیان نہیں کر سکتی۔ مضراب کے یہ خیالات جب مجھ پہ آشکار ہوئے تو میری کیا حالت تھی غم و غصے سے میرا جی چاہا کہ اپنا سر پھاڑ لوں یا اس بندے کا پھاڑ دوں۔ تحفے تحائف تو محبت بڑھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ مانا کہ حقیقت پسندی کچھ لوگوں کی طبیعت کا خاصہ ہوتی ہے۔ مگر ایسی بھی کیا حقیقت پسندی کہ کسی کے دل کا بھی خیال نہ رکھا جائے۔

☆☆☆

ایک تتلی تو میں بھی پکڑ ہی لیتا
ہاتھ میں پھول اگر لے نکلتا میں بھی

جب میں نے یہ شعر پڑھا تو صوفیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور میں اس کی ہنسی کے ترنم میں کھونے لگا۔ نمرہ کی نسبت صوفیہ میں کتنی سادگی اور معصومیت تھی یہ اندازہ مجھے صوفیہ سے مل کر ہوا تھا۔

صوفیہ میری زندگی میں آنے والی دوسری عورت تھی۔ حالانکہ جب میں نے شادی کے بعد نمرہ کو دیکھا تھا تو یہ کہا تھا کہ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت ہے۔ تب میں نے نمرہ سے جھوٹ بھی نہیں بولا تھا۔ واقعی میری زندگی میں آنے والی وہ پہلی عورت تھی۔ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ جلد ہی ایک اور لڑکی میری زندگی میں داخل ہو جائے گی۔ نمرہ میری زندگی میں باقاعدہ داخل ہوئی تھی۔ جبکہ صوفیہ بالکل اچانک۔

وہ مجھے بڑے عجیب عجیب سے ایس ایم ایس بھیجا کرتی تھی۔ اور یہ سلسلہ شادی کے ٹھیک تین ماہ بعد سے شروع ہوا تھا۔ پہلے پہل تو میں سب کچھ نظر انداز کرتا رہا۔ لیکن اس کی مستقل مزاجی ؟ تھی کہ میں جواب دینے پہ مجبور ہو گیا۔

پھر یہ سلسلہ فون کالز تک آ گیا۔ میں ان خرافات کا فطری طور پہ قائل نہیں تھا۔

لیکن نمرہ کی بہت سی باتوں نے مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ نمرہ کے اندر ہٹ دھرمی ارجارحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جبکہ میں صلح جو انسان تھا۔ میں نے اپنے اردگرد ایسی خواتین ہیں دیکھی تھیں جیسی نمرہ تھی۔ مرد مار قسم کی خاتون۔

حالانکہ وہ غیر معمولی حسن کی مالک تھی۔ اور اس سے کسی بھی شخص کو محبت ہو سکتی تھی۔ بلمن.....لیکن پتا نہیں وہ پہلے ہی دن سے مجھ پہ کیا جتانا چاہتی تھی۔

صوفیہ کی بے تکلفی کی حوصلہ شکنی میں نے اس لیے نہیں کی تھی کہ میں عورت کو جاننا چاہتا ۔نمرہ کی شخصیت نے مجھے یہ قدم اٹھانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

یہ سب کچھ ایک طرف اور نمرہ کا رویہ دوسری طرف تھا۔

میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ نمرہ نے میرے ساتھ ایسا رویہ کیوں رکھا تھا۔

"جب میں شادی کی پہلی رات پہ اپنے کمرے میں پہنچا تو نمرہ سادہ لباس میں ملبوس صوفے پہ ایستادہ تھی۔ میں خلوت میں پہلی بار ایک لڑکی سے ملنے جا رہا تھا۔ ظاہر ہے میں کچھ نروس سی تھا۔ لیکن جب مجھے مقابل فریق شرماتا لجاتا نہ ملا تو میں اور بھی نروس ہو گیا۔ میں اپنی شریک سفر سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا، لیکن میرے پاس وقت بہت کم تھا۔"

میری اس بات پہ صوفیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"وقت کم تھا کیا مطلب؟"

"ہاں وقت کم تھا۔ جب میں کمرے میں گیا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ گھر کا اکلوتا رزند اور بھائی ہونے کے ناطے سب کو مجھ سے بہت سی توقعات تھیں تو وہاں خدشات بھی بہت تھے۔ بوی سے ملتے ہی کہیں میں بیوی کا ہی نہ ہو جاؤں۔ اسی لیے میں شادی کی پہلی صبح اپنے کمرے سے سی وقت نکلا جس طرح روز نکلتا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے۔

اور اس بات پہ میری بہنوں کا اطمینان مجھ سے چھپا نہ رہ سکا۔ ظاہر ہے ایسا سب کچھ ای لو بھی چاہتے ہوں گے تب ہی وہ مجھ سے خوش تھے۔

پھر اگر میں کمرے میں رکتا بھی تو الجھتا ہی رہتا۔ کیونکہ نمرہ سے پہلی ملاقات کے بعد میں پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا اور دن بھر مجھے یہی احساس ہوتا رہا کہ اس کے بھی کچھ حقوق تھے۔ مجھے اس چیز کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی۔

اگلی ملاقات پر جب میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس نے میری تردید نہیں کی اور چپ رہی۔ وہ شادی کی پہلی صبح تھی۔ ولیمہ کے بعد جب ہماری ملاقات ہوئی۔ تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ولیمہ کے ڈریس میں وہ اتنی حسین لگ رہی تھی تو شادی والے روز اس سے بھی زیادہ

حسین لگ رہی ہو گی کیوں اس نے اپنا میک اپ اور جیولری اتار دی تھی۔ میرا حق تھا کہ میں اس سے پوچھوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا مگر میں نے نہیں پوچھا۔

پہلے ہی پہلی رات کون سی اچھی گزری تھی۔ جو میں یہ تلخ باتیں لے کر بیٹھ جاتا۔ ویسے بھی فطرتاً صلح جو آدمی ہوں۔

لیکن مجھے پچھلی رات کی خلش ضرور تھی۔ اس لیے دانستہ میں نے اس کی تعریف نہیں کی۔ میں اس منافقت کا آج اظہار کر رہا ہوں۔ اگر وہ سمجھنا چاہتی تو میرے احساس کو جان سکتی تھی۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے خود پسندی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کیونکہ جب میں نے پیش قدمی شروع کی تو وہ اکڑ دکھانے لگی۔ حالانکہ میں نے تو سنا ہے کہ لڑکیاں ان لمحات میں شرماتی ہیں مگر وہ حساب کتاب کر رہی تھی۔ اس کی اس خودسری اور مجھ پہ حاوی ہونے والی فطرت ہی وہ وجہ تھی کہ میں نے اسے رونمائی کا تحفہ بھی اپنے ہاتھ سے نہیں پہنایا تھا جسے اس نے ایک طرف پٹخ دیا تھا۔ تب میں پیچھے ہٹ گیا۔ اور نئے سرے سے الجھنے لگا۔ اور وہ جا کر لیٹ گئی۔

اس کے کسی بھی رویے میں میرے لیے اپنائیت نہیں تھی بلکہ حاکمیت تھی۔ مگر پھر بھی میں نے اس کی اس بدتمیزی کو نظر انداز کر دیا۔

اسے شاید صبح دیر تک سوتے رہنے کی عادت تھی۔ مجبوراً مجھے ہی اسے جگانا پڑا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ذمے داری اچھی طرح سنبھال لے اور میرے والدین اور بہنوں کو کسی بھی شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"واٹ نان سینس۔" صوفیہ نے میری بات پہ سر جھٹکا۔ "دو روز کی دلہن بھلا اپنی کیا کارکردگی دکھا سکتی ہے۔ آپ نے اس سے غلط توقعات وابستہ کیں۔ ابھی تو وہ آپ کے ساتھ ایڈجسٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کے گھر والوں کو کیسے قبول کر لیتی۔ آئی مین ان کی خدمتیں وہ تب ہی کر سکتی تھی جب وہ آپ سے خوش ہوتی۔ وہ تو آپ سے خوش ہی نہیں تھی۔ پھر وہ یوں لوگوں کے دلوں میں جگہ بناتی، کیوں انہیں خوش کرتی۔ اس چیز کے لیے وقت تو لگتا ہے ناں......"

میں نے صوفیہ کی بات بڑے دھیان سے سنی۔ کہہ وہ بھی ٹھیک ہی رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ انسان کا پہلا تاثر ہی دیرپا ہوتا ہے۔ جتنے جوش و خروش سے میری بہنیں اور والدین نمرہ کو بیاہ کر لائے تھے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ماند پڑے۔ اور اس میں نمرہ ہی کا تو فائدہ تھا۔ اسی کی تو عزت بڑھانا چاہتا تھا میں۔ وہی سارے گھر پہ چھائی رہے، یہی میری خواہش تھی۔"

"تو کیا آپ نے اپنے ان احساسات کا اظہار اس کے سامنے کیا؟" صوفیہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں' میں نے اس چیز کو بارہا جتایا اور پہلی رات میں نے صرف اسی بات پر زور دیا تھا کہ وہ میرے گھر والوں کی چاہت بن کر آئی ہے۔ یہ چاہت کم نہ ہونے پائے۔"

"حیرت کی بات ہے پھر بھی آپ کی بیوی سمجھ نہ سکی۔" صوفیہ نے کاندھے اچکائے تو میں صوفیہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"اصل میں بات یہ ہے کہ اس نے میرے گھر والوں کو اہمیت ہی نہیں دی اور آج تک کا یہی رویہ ہے۔ وہ مجھ سے شاکی ہی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی اور زبردستی میرے ساتھ نباہ کر رہی ہے۔"

"بڑی جلدی کی آپ نے اس نتیجے پہ پہنچنے کی۔ آپ مرد لوگوں میں یہی تو خرابی ہے۔ عورت پہ الزام لگانے میں ایک منٹ نہیں لگاتے جبکہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو آپ خود اس وقت کیا کر رہے ہیں۔"

میں صوفیہ کی بات پہ محظوظ ہوا۔ اور چلتے چلتے رک گیا۔ پھر صوفیہ کی خوب صورت آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"میں آپ سے فلرٹ تو نہیں کر رہا۔"

صوفیہ میری بات پہ گھبرا گئی۔ ایسی گھبراہٹ میں نے کبھی نمرہ کے چہرے پہ نہیں دیکھی تھی میں نے مسکراتے ہوئے اس پہ سے نظریں ہٹا لیں۔

روزانہ شام کو صوفیہ کے ساتھ وقت بتانا میرا معمول بن چکا تھا۔

مجھے اس کی سنگت میں خوشی حاصل ہوتی تھی۔ وہ مجھے سنتی بھی تھی اور مجھے سناتی بھی تھی لیکن اس نے کبھی مجھ پہ حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ محض میری غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن نمرہ نے کبھی مجھے یا میرے گھر والوں کو اہمیت نہیں دی۔"

"آپ کے گھر والوں نے کبھی اس کو اہمیت دی ہے۔ کبھی اس کو سراہا، اس کی تعریف کی؟"

"یہ سچ ہے کہ میرے گھر والوں میں سے آج تک اس کی تعریف کسی نے نہیں کی۔"

صوفیہ اس بات پہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "یہ تو ہمارے معاشرے کا وتیرہ ہے کہ بہوؤں کی کوئی تعریف نہیں کرتا۔"

"مگر میرے گھر والے اس کی برائیاں بھی نہیں کرتے۔" میں نے سچائی سے کہا۔

"یہ تو پھر آپ لوگوں کا بڑا پن ہے کہ اس میں خوبیاں بھی نہیں ہیں۔ پھر بھی اس کی برائی نہیں کرتے۔" صوفیہ محظوظ ہوتے ہوئے مجھ پہ طنز کر رہی تھی۔

"ویسے یہ آپ کی بیوی کی خوبی نہیں کہ جب آپ رات کو دیر سے گھر جاتے ہیں تو وہ آپ سے پوچھتی نہیں کہ آپ کہاں تھے؟"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اب مجھ میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا ہے یا اپنے جذبات تائب ہوگئی ہے۔"

"صرف چند ہی ماہ میں۔" صوفیہ کو حیرانی ہوئی۔

"ہاں' میں نے بتایا ناں خود پسندی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔"

"تو آپ اس خود پسندی کا یہ فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ آپ نے راستہ ہی بدل لیا۔"

"نہیں۔" میں نے اس کی بات کو سختی سے رد کیا۔

"میں بھی زندگی کو اب کھل کر انجوائے کرنا چاہتا ہوں ساری عمر میں نے اپنے جذبات صرف ایک لڑکی کے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ لیکن اس نے مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ کم جتانا چاہتی تھی مجھے، میرے ہی پیسوں سے مجھے گفٹ دے کر؟ کیا مجھے یہ سب کچھ کرنا نہیں آتا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار جو تحفہ کسی لڑکی کو دیا تھا۔ وہ رونمائی کی انگوٹھی تھی۔ جسے اس نے آج تک انگلی میں نہیں ڈالا۔ یہاں تک کہ میں نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسے یہ پسند نہیں تو میں دوسری کوئی اور چیز بھی لا سکتا ہوں۔"

"کیا وہ انگوٹھی آپ نے اسے خود پہنائی تھی؟" صوفیہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"جب اس نے تمام زیور ہی اتار کر پھینک رکھا تھا تو میں اسے انگوٹھی کیوں پہناتا؟ بندہ کا پہلا امپریشن ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ یہ جان بوجھ کر میری ہر بات کی نفی کرے گی۔ اس لیے میں نے اس سے کسی بھی معاملے میں بحث یا ضد نہیں باندھی۔ کبھی میں نے اسے تکرار کا موقع نہیں دیا اور میں جانتا ہوں اس بات پر وہ بہت تپخ پا ہوتی ہے اور مجھے روکر کے اپنا آپ منوانا چاہتی ہے۔"

"یعنی آپ تو بڑے گھنے آدمی ہیں۔" صوفیہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"میں ایسا تھا نہیں لیکن مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔ صرف اس کی حرکتوں کی وجہ سے۔ ابھی شادی کو چند ہی دن ہوئے تھے اور وہ اپنی ماں کی تیمارداری کے بہانے اپنے میکے میں چلی گئی۔ پورے نو دن مزے سے اپنے گھر میں بیٹھی رہی۔"

"تو آپ اسے لینے چلے جاتے۔ کیوں چھوڑا اتنے دن۔"

"کیوں لینے چلا جاتا۔ کیا وہ مجھ سے پوچھ کر گئی تھی۔ یا میری ماں سے پوچھ کر گئی تھی۔ صرف امی کو بتا کر گئی تھی کہ اس کی اماں کی طبیعت خراب ہے۔ میں دو بار اس کی اماں کی طبیعت

پوچھنے گیا مگر اس نے میرے ساتھ آنے کے لیے نہیں کہا۔ میں اپنے گھر والوں کے سامنے دل ہی دل میں پشیمان ہوتا رہا۔ میرے گھر والے بنا کہے میری بات کا خیال رکھتے ہیں تو اس کو بھی ان کا خیال چاہیے۔"

"یہ احساسات آپ کے گھر والوں کے آپ کے لیے تھے۔ آپ کی بیوی کے لیے تو نہیں۔" صوفیہ نے دوٹوک انداز میں کہا تو میں چونک گیا۔ میں نے صوفیہ کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی آپ کا اور آپ کے گھر والوں کا خیال رکھے تو آپ کو بھی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"ہونہہ!" میں صوفیہ کی بات پہ تلخ ہو گیا۔

"وہ اپنی ہر خوشی کے لیے خود ہی پہلے سے اہتمام کر لیتی ہے۔"

"اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہوا آپ کی بیوی زندہ دل اور رومنٹک ہے۔ اب تک تو میں اسے لڑاکا' جھگڑالو ہی سمجھتی آ رہی تھی۔"

"رومنٹک اور زندہ دل، صرف اپنے لیے۔" میں زہر خند ہوا۔

میں نے صوفیہ کو اس کی برتھ ڈے والی بات بتائی۔

"کیوں اس نے یہ چاہا کہ وہ اپنی خوشی کو اپنی دوست کے گھر جا کر منائے۔ کیا وہ وہاں وہ انجوائے کر سکتی تھی۔ اگر وہ اپنے گھر میں اس چیز کا اہتمام کر لیتی تو کیا سب اس کی خوشی میں شامل ہوتے اور گھر میں چھوٹی سی پارٹی بھی ہو جاتی۔ میری بہنیں اور والدین بھی خوش ہو جاتے۔ وہ اپنے رہ چلی جاتی ہے یا فون پر دوستوں سے گپیں لگاتی رہتی ہے۔ اس کے لیے اب بھی وہی سب کچھ اہم ہے۔ جو وہ چھوڑ کر آئی ہے۔ تو پھر میرے لیے وہ اہم کیوں نہ ہوں جن کے ساتھ میں رہ رہا ہوں۔"

"لگتا ہے بہت جلدی بد دل ہو گئے ہیں آپ اپنی بیوی سے۔" صوفیہ مسکرا رہی تھی۔ ایک ب سا تفاخر اس کے چہرے پہ تھا۔

"کچھ بیویاں اپنے سیدھے سادے شوہروں کو جاہل اور پرانے خیالات کا سمجھ کر ایسے ہی راتی ہیں۔ حالانکہ ایسے مرد تو آج کے دور میں نایاب ہوتے ہیں۔"

صوفیہ نے شرارتی انداز میں میری تعریف کی تو میں نے اترائے ہوئے فرضی کالر جھاڑا۔

"باقی وادے اب آپ بھی نایاب نہیں رہے۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے اب بھی تو یانتی کر رہے ہیں۔"

"میں کوئی بد دیانتی نہیں کر رہا۔ اپنی بیوی کے خیالات کی تعمیل کر رہا ہوں۔"

"کم از کم ایسے خیالات کسی عورت کے نہیں ہو سکتے۔" صوفیہ میری اور اپنی دوستی کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے ہنسی۔

''مجھے پتا ہے تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ لیکن تمہیں یہ پڑھ کر ہوسکتا ہے یقین کرنا پڑے۔''

میں نے اپنی جیب سے ایک ورق نکالا اور صوفیہ کے سامنے کر دیا۔

صوفیہ دلچسپی سے وہ کاغذ لے کر پڑھنے لگی۔

کاش!
مجھ سے پہلے تمہاری زندگی میں
کوئی لڑکی آئی ہوتی
بہت شوخ، بہت چنچل
بہت سندر، بہت کومل
جس کے بنا جینے کا تصور تمہارے لیے محال ہوتا
موسم سرما کا سا مزاج رکھنے والے
اسے محبت میں کمال ہوتا
تو وہ تم میں اپنی محبت کی گرمی سمو دیتی
وہ تمہیں روٹھنا سکھاتی
وہ تمہیں منانا سکھاتی
بارشوں کے موسم میں
چاندنی راتوں میں
سرد صبحوں میں
خنک شاموں میں
کس طرح بتاتے ہیں
ان حسین لمحوں کو
وہ تمہیں ہر لمحے سے آشنا کر دیتی
پھر کچھ یوں سانحہ ہوتا
وہ تم سے دور ہو جاتی
اور
تب میں تمہاری زندگی میں آتی
تم اس کی محبت بھلانے کے لیے

مجھ سے محبت کرتے
ہر وہ عمل دہراتے جو وہ تمہارے ساتھ کر چکی تھی
پھر......
خواہ مجھے دوسرا نمبر میسر ہوتا
لیکن جان من......تب تمہیں محبت کا ہنر تو آتا

''واؤ فنٹاسٹک بڑی زبردست نظم ہے۔''

''اور ایک چیلنج بھی۔'' میں نے ٹکڑا لگایا۔

صوفیہ نے شوخ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''اور آپ نے اس چیلنج کو یوں قبول کیا۔''

''ہونہہ اور اب دوسرا نمبر اس کا نہیں، تمہارا ہے۔'' میرے کہنے پہ صوفیہ کے چہرے کا اڑ گیا اور وہ ٹالنے والے انداز میں بولی۔

''بائی دا وے آپ کی مسز شاعری بھی کرتی ہیں؟''

''پتا نہیں، یہ اس کی ہے یا کہیں سے چرائی ہوئی ہے۔ میں تو ان باتوں میں زیادہ دلچسپی لیتا۔''

''حالانکہ آپ کو انہی باتوں میں دلچسپی لینی چاہیے۔'' وہ مجھے چھیڑ رہی تھی۔

''ایک بات پوچھوں تم سے'' میں بالکل سنجیدہ تھا۔

''ہوں......'' وہ یکدم پھر میری طرف متوجہ ہوگئی۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہماری یہ دوستی کسی نام، رشتے میں بندھ جائے۔'' میری بات پہ بہ کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں اور یہ مجھے بالکل عجیب نہیں لگا۔ اگر وہ مجھے الو سمجھ کر الو کا پٹھا بنا ئی تو میں کون سا دیدۂ دل فرش راہ کیے بیٹھا تھا۔ میں تو یہ جانچنا چاہتا تھا کہ آخر اس نے مجھ سے اکیوں کی تھی۔ محض وقت گزاری کے لیے یا وہ بھی کوئی تجربہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میری طرح۔

وہ میری سوچ سے زیادہ چالاک نکلی۔ جلد ہی سنبھل گئی اور کہنے لگی۔

''آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟''

''آف کورس۔'' میری خوشی دیدنی تھی۔

''کوئی وجہ؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''یہی کہ ہمارے خیالات بہت ملتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''حالانکہ ہمارے خیالات بالکل بھی نہیں ملتے۔'' وہ استہزائیہ مسکرائی۔

"اتنے دن سے ہم کیا کر رہے تھے؟" میں نے دانستہ اپنا اور اس کا مذاق اڑایا۔

"صرف وقت گزاری۔" اس نے کاندھے اچکائے۔

"کیا وقت گزارنے کے لیے میں ہی ملا تھا آپ کو؟" میں نے قدرے روکھے انداز میں پوچھا۔

"یہ شکوہ میں بھی تو کر سکتی ہوں۔ آپ نے مجھے بور ہی کیا اپنی بیوی کے قصے سنا سنا کر۔"

"میں تو آپ کے جمال پہ قصہ خوانی کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ اجازت دیں۔" میں شرارتاً مسکرایا۔

"فارگاڈ سیک آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی خوب صورت لڑکی کی تعریف کے لیے کسی مرد نے اجازت طلب کی ہو۔" اس کی ہنسی طنزیہ تھی اور انداز میں بالکل ویسی ہی بے زاری تھی۔ جیسی میں نے نمرہ میں دیکھی تھی۔ مجھے نمرہ کی بے زاری سے کبھی سبکی محسوس نہیں ہوئی لیکن آج صوفیہ کے سامنے میں بالکل شرمندہ ہو گیا اور مجھے دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا۔

"میری یہ اظہار نہ کرنے کی عادت اچھی نہیں ہے۔ اسے بدلنا چاہیے۔ اگر میں ایسا کروں تو نمرہ کی شکایتیں ختم ہو جائیں پھر مسئلہ ہی کیا ہے۔"

صوفیہ نے میرے سامنے ہاتھ نچایا۔ "کہاں کھو گئے؟"

"کہیں نہیں۔" میں کھسیانا ہنسا۔

"سوچ رہا ہوں۔ تمہیں میرا پرپوز کرنے کا انداز برا لگا ہوگا۔"

"برا نہیں، آپ کی شخصیت کے بالکل متضاد لگا۔"

"آپ اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ نہ تو آپ جلد باز ہیں۔ اور نہ ہی آپ اپنے خیالات و نظریات تبدیل کرنے والے شخص ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ اپنی بیوی کے ساتھ ہی کمپرومائز کر چکے ہوتے۔ دیکھیں مضراب صاحب! ایک بات کہوں برا مت مانیے گا۔ آپ کے ٹھوس خیالات نے آپ کی شخصیت کو ٹھس کر رکھا ہے۔ بجائے اس کے آپ کے اردگرد تبدیلی آئے۔ خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کے اردگرد اچھے اثرات پڑیں گے۔"

صوفیہ کی گفتگو مجھے بہت سطحی ثابت کر رہی تھی۔ اور تب مجھے ڈھٹائی سے کام لینا پڑا۔

"یہ سب باتیں میرے سوال کا جواب تو نہیں ہیں؟"

اس نے ایک بار پھر حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

"اگر آپ واقعی سنجیدہ ہیں تو میں سوچ کر جواب دوں گی۔"

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری اور صوفیہ کی یہ آخری ملاقات ہو گی۔ جس طرح وہ بالکل اچانک میری زندگی میں آئی تھی۔ ویسے ہی روپوش بھی ہو گئی اور میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش

بھی نہیں کی۔

☆☆☆

منال کو رخصت کر کے جب میں نبیل کے ہمراہ گھر آئی تو بہت تھک چکی تھی۔ اور صرف ونا چاہتی تھی لیکن مضراب کو پہلے سے سویا ہوا پا کر میں نئے سرے سے چیخ گئی۔ کچھ دن سے میں مضراب کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

"منافق!" میں چلا چلا کر کہنا چاہتی تھی مگر مجھے ضبط کرنا پڑا۔

یں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مضراب اندر سے اتنا گھٹیا ہوگا جس شخص نے پہلی رات اتنے بڑے بڑے عوے کیے تھے۔ وہ بھی اندر سے وہی تھا۔ وہ ایک غیر لڑکی سے عشقیہ ڈائیلاگز بول سکتا تھا۔ بیوی سے سب کچھ کہتے ہوئے اسے شرم آتی تھی اور یہاں تک کہ اس نے منال کو پرپوز بھی کر دیا تھا۔

اور یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

منال نے صوفیہ بن کر جہاں مضراب کی شخصیت کے اور پرت کھولے تھے۔ وہاں اس کی ہری فطرت کو مجھ پہ واضح کر کے مجھے سخت بددل کر دیا تھا۔

"وہ میری کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ تو میں کیسے اس کے اتنے بڑے جرم کو معاف کر کتی ہوں۔" میں نے آنسو ضبط کرتے ہوئے منال سے کہا تو اس نے اپنا دلہناپا بھلا کر مجھے سینے سے لیا اور کہنے لگی۔

"میں نے یہ سب تم دونوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ میں تم وں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتی تھی۔"

"وہ تم سے کہہ سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے کیوں نہیں کہا سب کچھ۔" میں رو پڑی تھی۔ منال بھی پریشان ہو گئی۔

"میں نے ان کی ذات کی ساری کمزوریاں اس لیے تم پہ واضح کی ہیں۔ تاکہ تم انہیں اچھی رح سمجھ سکو اور پھر تم نے خود ہی تو آفر کی تھی، مضراب بھائی کو دوسری لڑکی کی۔" اس کا اشارہ اس نظم طرف تھا۔ جو کالج مشاعرے میں ہماری ایک دوست نے پڑھی تھی اور جسے میں نے تب ہی اپنی ری میں لکھ لیا تھا۔

☆☆☆

وقت کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اب نمرہ کی دلچسپیوں کا مرکز میں نہیں، رے گھر والے تھے۔ نمرہ نے سب میں گھل مل کر اپنی اچھی خاصی جگہ بنالی تھی حالانکہ اس کی طبیعت لمعت ہونے کی وجہ سے خاصی گری گری رہتی تھی۔ نہ اس کے چہرے پہ بشاشت تھی اور نہ آنکھوں

میں وہ چمک اور تازگی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔

لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ نمرہ مجھ سے دور ہوتی جارہی ہے۔ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ ہمارے درمیان ایک خلیج سی حائل تھی۔

میں گھر میں داخل ہوا تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی میری تین بہنیں بمعہ بچوں کے آئی ہوئی تھی۔ نمرہ امی کے پاس بیٹھی تھی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابو..... نہایت سنجیدہ اور لیے دیے رہنے والے ابو دیواروں پہ پھول چسپاں کررہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی تینوں نے قنافت تیار ہونے کا آڈر جاری کردیا۔

''مگر مجھے پتا تو لگے معاملہ کیا ہے؟'' میرے سوال پہ امی نے سب سے زیادہ مجھے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

''آج کے دن نمرہ ہمارے گھر آئی تھی۔''

''یعنی میری ویڈنگ اپنی درسری۔'' میں زیرلب بڑبڑایا۔

''جی ہاں!'' میری ساری بہنوں نے ایک ساتھ کہا اور میں نے نمرہ کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے لاتعلقی سے بیٹھی تھی۔

''اب تم جلدی سے نہا دھولو۔ تمہارے بہنوئی بھی آنے والے ہوں گے۔'' امی نے کہا۔

مجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے تو کوئی اچھا سا گفٹ بھی نہیں خریدا۔ اب اتنی جلدی میں کیا لوں۔

''آپ کے ٹھوس نظریات نے آپ کی شخصیت کو ٹھس کردیا ہے۔'' صوفیہ کی بات مجھے شدت سے یاد آئی۔

''کیا میں نمرہ سے پوچھوں کہ وہ کیا لینا چاہے گی۔''

نہیں میں اپنی پسند سے نمرہ کے لیے گفٹ لوں گا۔

میں الٹے قدموں گھر سے نکل گیا۔

☆☆☆

سب نے میرے ہاتھ کے پکے کھانوں کی تعریف کی تھی اس چھوٹے سے فنکشن سے سب ہی بہت خوش تھے۔ مجھے سب نے تحفے دیے تھے۔ میری نندوں نے نندوں کے بچوں نے اور امی نے یہاں تک کہ نبیل نے بھی۔ میں مضراب کی محبت ڈھونڈنے نکلی تو مجھے بہت سی محبتیں مل گئیں۔ میں ان محبت کرنے والوں کے درمیان خود کو بہت پرسکون محسوس کررہی تھی۔

''کیا مجھے اب مضراب کی محبت کی ضرورت نہیں تھی؟'' میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا چھوڑ دیا تھا۔

سب کے چلے جانے کے بعد میں امی ابو کے درمیان بیٹھی رہی۔ جویریہ ہمارے لیے چائے بنالائی تھی اور اب جویریہ اور ماریہ مل کر برتن وغیرہ سمیٹ رہی تھیں۔

مضراب کمرے میں جاچکا تھا اور کچھ بعید نہیں سو بھی گیا ہو۔ مجھے چونکہ نیند نہیں آرہی تھی اس لیے میں باتوں میں مشغول رہی۔ تھوڑی دیر بعد ابو بھی سونے چلے گئے۔ تب میں کمرے میں آگئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔

لیکن خوشبو اتنی تھی کہ میں چکرا سی گئی کہ میں غلط جگہ تو نہیں آگئی اور تب ہی مضراب نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔

''شادی کا پہلا سال مبارک ہو۔'' میں چونک سی گئی۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔'' کچھ توقف کے بعد میں نے آہستگی سے کہا۔

''کیا لائٹ گئی ہوئی ہے؟'' مجھے اس طرح لائٹ آف کرکے وش کرنا بالکل بے تکا سا لگا تھا۔

''نہیں، خود اپنے ہاتھ سے لائٹ آن کرلو۔'' اور جب میں نے لائٹ آن کی تو دنگ رہ گئی۔

کمرے میں بے تحاشا پھول تھے۔ سرخ گلابوں کا ڈھیر۔ میں نے حیرانی سے مضراب کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''آج کے دن پھولوں سے اچھا تحفہ کوئی نہیں ہوتا۔ ہے ناں!'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہرا ہاتھ تھاما اور میری وارڈروب کی طرف بڑھا۔

میں پھولوں کی پتیوں پہ چلتے ہوئے جب وارڈروب تک پہنچی تو وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

''کھولو اسے۔'' وہ چاہت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

میں نے وارڈروب کھولی۔ سامنے ہی ریڈ اینڈ بلیک شیفون کا نفیس کڑھائی والا سوٹ لٹک رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔

وہ سوٹ مجھے بے حد پسند آیا تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ ''ابھی اور اسی وقت سے پہن کر دکھاؤ۔'' اس کی فرمائش پہ میں حیران رہ گئی۔

''میں اسی وقت اسے پہن نہیں سکتی۔'' میں نے اس کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور صوفے پہ لی۔ تب ہی کشن اٹھاتے ہوئے ایک ڈبہ میرے ہاتھ لگا اس میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ میں ری سے سنبھل گئی۔ ذرا سی غفلت سے وہ چوڑیاں ٹوٹ بھی سکتی تھیں۔ ابھی میں چوڑیوں پہ غور وفکر ہی رہی تھی کہ میری نگاہ بیڈ پہ پڑی وہاں ایک گفٹ پیک رکھا تھا۔

میں متجسس سی ہو کر اٹھ گئی۔ قریب جا کر دیکھا تو چار شاعری کی کتابیں رکھی تھیں۔ ریپر ان ہی رکھا ہوا تھا یعنی پیکنگ نہیں تھی۔

میں نے مضراب کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھوں میں مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ اپنی طرف دیکھنے پہ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے پرفیوم رکھا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز شاید اچھا لگتا مگر اب ایک پھانس میرے حلق میں آ کر پھنس گئی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے منال کو پرپوز کیا تھا۔ اس سے زیادہ میری تحقیر کیا ہوگی۔ میری روح جھلسنے لگی۔ یکدم ہی میرے چہرے پہ بے زاری پا کر وہ میرے قریب آ گیا۔

''کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟'' اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر صوفے پہ بٹھا دیا اور دو زانو میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''ہاں میری طبیعت صحیح نہیں ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔''

''اچھا آخری گفٹ تو لے لو۔'' اس کا جوش ابھی ماند نہیں پڑا تھا۔

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

پھر وہ اٹھا اور اس نے اپنی محبت کی مہر میری پیشانی پہ ثبت کی۔

''تم واقعی لاجواب عورت ہو۔ تم نے اپنی محبت سب میں بانٹ کر مجھے محبت کرنا سکھا ہی دیا۔ زندگی میں، میں نے اتنی تیز شاپنگ بھی نہیں کی جیسا مجھے آج کرنا پڑی۔

''اس اچانک تبدیلی کی کوئی وجہ تو ہوگی؟'' میں نے اسے بے تحاشا خوش پا کر پوچھا۔

''تمہاری سنگت اور کیا؟'' اس نے مجھے لاجواب کرنا چاہا۔

''یہ میرا نہیں کسی اور کا رنگ ہے۔'' میں بالکل سنجیدہ تھی۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا۔

''صوفیہ کون تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ یک دم اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا پھر اس نے چہرہ جھکا لیا۔ میرے ساتھ بھی تو وہ یہی کرتا تھا جب میں خوش ہوتی تب ہی مجھے رلاتا تھا۔ میں نے خود کو بھلا دیا۔ سب کچھ مٹا دیا۔ تب وہ بہت خوش ہے۔ میں کیوں نہ اسے احساس دلاؤں۔

میں نے اپنے من کو مار دیا تو وہ مجھے لاجواب عورت کہہ رہا تھا۔

اگر میں لاجواب ہوں تو صوفیہ کون تھی؟ تادیر ہمارے درمیان خاموشی رہی۔

''صوفیہ ایک رانگ نمبر تھی۔ جس کے ذریعے میں نے تمہیں ڈھونڈا۔'' وہ اعتماد سے بول رہا تھا۔

''مجھے!'' میں نے اس کا مذاق اڑایا۔

''ہاں..... تمہیں۔'' وہ سیدھا ہو گیا۔

''میں نہیں جانتا، صوفیہ کون تھی کہاں سے آئی، کیوں میری زندگی میں آئی اور کیوں چلی گئی۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں اس کے آنے یا جانے سے میری زندگی پہ کچھ فرق نہیں پڑا۔ فرق پڑا ہے تو تمہاری تبدیلیوں سے۔''

اس نے اعتماد سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر کہنے لگا۔

ایک تتلی تو میں بھی پکڑ ہی لیتا تو خیر
ہاتھ میں گر پھول لے کر نکلتا میں بھی
اور سچ تو یہ ہے کہ.....

تمہاری نظم ''دوسرا نمبر'' نے مجھے مایوس کیا تھا۔ تب ہی صوفیہ جیسی لڑکی کی طرف توجہ کرنا پڑی اور بس۔'' وہ مطمئن تھا۔

''کیا میں نے وہ نظم آپ کو لکھ کر دی تھی؟'' میں نے مضراب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ وہ شرمندہ سا ہوا پھر جلدی سے بولا۔

''نہیں، لیکن انسان کے انتخاب سے اس کی شخصیت ظاہر ہوتی ہے۔''

''عجیب بات ہے۔ میرے انتخاب سے میری شخصیت کا اندازہ لگایا۔ جبکہ میں تو بذات خود کھلی کتاب تھی۔'' میں نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا اور سر صوفے پہ ٹکا لیا۔

ہمارے درمیان تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر وہ میرے نزدیک آ کر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

''لگتا ہے تم بہت تھک گئی ہو۔ جب ہی تمہیں کسی بھی چیز سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر سے آنکھیں موند لیں۔ سچ یہی تھا کہ مجھے مضراب کی کسی چیز سے خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

''ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے مضراب! اور اب میرا وہ جوش ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔''

شاید میرے اندر کہیں آنسو گر رہے تھے۔ تب ہی میں نے آنکھوں کے کناروں کو جلتا سوس کیا تھا۔

''مگر محبت کے لیے کوئی وقت نہیں ہوتا۔'' وہ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مجھے آس دلا رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں تمہیں مجھ سے بہت سے شکوے ہیں۔ میں تمہارے سارے شکوے دور کر دوں گا۔''

اس کی بھوری آنکھوں میں محبت ٹھاٹھیں مار رہی تھی اور یہ محبت صرف میرے لیے تھی۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ میں متاثر ہی نہیں ہو پا رہی تھی سارے احساسات جیسے منجمد ہو چکے تھے.....

مضراب نے میرے خشک رویے کو اچھی طرح سے نوٹ کیا اور مسکراتے ہوئے میرے ہاتھ پہ بوسہ لیتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو وہی ہنستی مسکراتی لڑتی جھگڑتی نمرہ چاہیے جس نے مجھے یکسر بدل ڈالا ہے اور اب یہ اداس موڈ تبدیل کرو۔ میرے بچے پہ برا اثر پڑے گا اور میں یہ بالکل نہیں چاہوں گا کہ اس کا مزاج میرے جیسا ہو۔ اسے اپنی مما جیسا ہونا چاہیے۔ نٹ کھٹ اور شرارتی۔" مضراب کی بے ساختگی پہ مجھے بھی ہنسی آگئی۔ میری ہنسی اتنی بے ساختہ تھی کہ وہ مجھے حیرانی سے تکنے لگا۔

عجیب بات تھی..... زندگی میں اکثر وہ ہو جاتا ہے جسے ہم نہیں سوچتے اور جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا۔

بس' میرے من نے یہی کہا۔

دیر آید درست آید۔

.....❁.....

وہ ورق دل کی کتاب کا

صبح کی نوخیز کلی تھی اور زندگی اپنے پورے جوبن کے ساتھ رواں دواں ہو گئی تھی۔

"سلمان منزل" میں ہر شخص کو جلدی پڑی تھی۔ سنی کو اسکول جانا تھا۔ اس کی جرابیں ایک جیسے رنگ کی مل کر نہیں دے رہی تھیں۔ عارش کو صبح صبح بائیک کو دھونا یاد آ گیا تھا۔ ثاقب صاحب باتھ روم میں ایسے گھسے تھے کہ نکلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ رہیعہ بے چین ادھر سے ادھر ثاقب کو کوستی پھر رہی تھی آخر اسے بھی تو کالج جانے کی جلدی تھی۔

"آخر کس نامراد نے مشورہ دیا تھا کہ باتھ روم میں، آئینہ لگوایا جائے۔ جس کا دل چاہتا ہے، ایک ایک گھنٹے شیو بنانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے، باہر والے اپنی ایسی تیسی کراتے رہیں۔"

"اگر باہر کھڑے ہو کر شیو کا اہتمام کیا جائے تو آپ جیسی نازک مزاج خواتین کو گھن بھی بہت آتی ہے۔" اندر سے جواب بلا تامل ملا تھا۔

"ثاقب کے بچے! تم ایک بار ذرا باہر تو نکلو پھر بتاؤں گی تمہیں، میرا فرسٹ پیریڈ مس ہو جانا ں تو پھر دیکھ لینا۔"

"دیکھنے کی چیز تو عارش ہے، جسے کوئی نہ دیکھتا ہے اور نہ پوچھتا ہے۔ آہ۔ ہا۔ اس گھر میں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔"

"سن رہی ہیں اماں!۔ آپ کے نواسے کو سہرا سجانے کا شوق چرا رہا ہے۔ بی اے تو تنگ سے کیا نہیں۔ بیاہ کریں گے۔"

"مجھ جیسے اعلیٰ اوصاف کے حامل مرد کو خوامخواہ کتابوں سے سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ تو ویسے بھی لڑکی مل ہی جائے گی۔ تم اپنی فکر کرو۔"

"اما! دیکھ لیں اسے۔" رہیعہ تلملا کر رہ گئی۔

"بی بی! بس دیکھ لیا۔ نہ تو تمہاری زبان میں ٹانکا ہے اور نہ تمہارے بھائیوں کی۔ نہ جانے تمہارے بھائی پڑھا لکھا کر تمہیں کس افلاطون کے پلے باندھیں گے اور تمہاری ماں۔ خدا پوچھے اس سے۔"

"اماں! ہر وقت آپ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہیں یا پھر آپا جان کے۔"

"حالانکہ پیچھے پڑنے والی چیز تو تم ہو جو بھونکتی بھی ہے اور کاٹتی بھی ہے۔"

عارش نے اس کی چوٹیاں کھینچتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ ربیعہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"اماں! اسے روک لیں۔ ورنہ۔"

"ورنہ کیا تو اسے قتل کر دے گی۔" اماں الٹا اسی پہ چڑھ دوڑیں۔

"اس گھر میں مردوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے ہمیشہ عورت کے حقوق کی پامالی کی گئی ہے۔" ربیعہ بگڑ کر بولی۔

"تین عدد بھابیاں آنے کے بعد اب تو تمہیں اس شکایت کو ختم کر دینا چاہیے تھا۔"

"بھابیاں بڑا سر میں تیل لگانے آئی ہیں۔" وہ جل ہی تو گئی۔

"اچھا کرتی ہیں ورنہ تو تمہاری گز بھر کی زبان اور بھی نکل آتی۔" عارش ہنسا۔

"اسی لایعنی بحث میں وقت گزار دینا۔ آج ناشتے کی باری کس لبن کی ہے؟" بڑی اماں نے اکتا کر پوچھا۔

"ربا بھابھی کی لیکن بدقسمتی سے وہ عباد بھائی کے عتاب کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"انہوں نے انکم ٹیکس کے کاغذات کہیں رکھے تھے۔ بچوں نے گم کر دیے، اب پوری بمعہ بچوں کے کاغذات ڈھونڈ رہی ہے۔ آخری اطلاع آنے تک کاغذات تو ابھی تک نہیں ملے سابقہ گمشدہ چیزیں مل رہی ہیں۔"

"سنی! تم ضرورت سے زیادہ ہی دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کرنے ہو۔" ربیعہ کو ناگوار گزرا تو اس نے بھائی کو ڈپٹ دیا۔

"اس لڑکی کے دو بچے کیا ہو گئے۔ پاگل ہی ہو کر رہ گئی ہے۔" اماں نے سرپیٹ لیا۔

"اور عباد بھائی ہر وقت "کھوئے ہو تم کہاں؟" کا اشتہار بنے دکھائی دینے لگے ہیں۔" عارش نے کہا۔

عباد کمرے سے نکلے اور کھٹا کھٹ سیڑھیاں اتر گئے۔

"اے۔ ہے۔ کیا بغیر ناشتے کے ہی جا رہے ہو؟"

"اماں! بس جلدی ہے۔"

"ارے بیٹا! اتنی جلدی ہوتی ہے تو صبح سویرے کیوں نہیں اٹھتے۔"

"وکیل کا ٹائم نکل جائے گا۔" وہ مختصر جواب دے کر نکل گئے۔

ایک فرد بنا ناشتے کے گھر سے نکل گیا تھا۔ اب تو سب ہی کی شامت آنا تھی۔

رما نے ناشتا لگا کر سب کو آواز دی تو اماں وہیں سے بولیں۔

"اے بی بی! اب ہمیں ناشتے کا کیا کرنا۔ جب تمہارے میاں ہی بغیر ناشتے کے چلے گئے۔"

"اماں! ناشتا تو میں نے تیار کر رکھا تھا، لیکن ان کے پاس کرنے کا ٹائم نہیں تھا۔" رما نے سے کہا۔

اماں جل ہی تو گئیں۔

"سنو بی بی! اگر ناشتا وقت پہ تیار ہوتا، تو کیا بھی جاتا۔ ہمیں تو پسند نہیں آئی تمہاری یہ ت۔ اپنی غلطی ماننے کے بجائے میاں پہ ہی بات رکھ دی۔ بھلے سے تم برا مانو یا بھلا۔ بچے تو ہم نے ی پالے تھے۔ سارے گھر کا کام کرتے تھے۔ بھینسیں علیحدہ سنبھالتے تھے۔ صبح اٹھ کر دودھ نکالنا، دھ بلونا۔ لکڑی کے چولہوں پہ کام ہوتا تھا۔ سارا دن مہمانوں کی خاطر تواضع۔ کبھی ماتھے پر بل نہیں یا اور آج کل کی لڑکیوں سے تو اپنے ہی گھر کے کام نہیں ہوتے۔"

رما کو اماں کی بات بہت بری لگی، لیکن وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ صبر کر لیتی۔ وہ پ چاپ بچوں کو ناشتا کرانے لگی۔

"زرین! شہزاد اٹھ گیا ہے۔ اسے غراروں کا پانی لا دو۔" اماں کی توجہ اب شہزاد کی طرف سویرا سو کر اٹھی تھی، آ کر اماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"بڑی اماں! آج میں اسکول نہیں جاؤں گی۔ میرے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔"

"اے موا رات کو کیا کھایا تھا؟"

"برگر۔" سویرا نے بتایا۔

"نزاہا سی گوشت۔ گھر میں تو بیٹا تیری ماں سے کچھ پکتا نہیں۔ بچوں کو پیسے پکڑائے گی اور میں روانہ کر دے گی۔ اب باوا کے پیسے علاج میں اٹھیں گے یا نہیں۔ کیا اس طرح پلتے ہیں چے۔ میں کہتی ہوں غراروں کا پانی ہے یا پائے۔ جواب تک نہیں پہنچا۔ ہر وقت کی سستی۔ ہر وقت کی ستی یوں چلتے ہیں گھر۔"

"اماں! خود تو اتنی دیر میں دنیا فتح کر لیتیں۔ ٹیپو سلطان کی پوتی جو ٹھہریں۔"

"آپ کو ہر کام کے لئے اماں ہی یاد آتی ہیں۔ سیدھا مجھ سے نہیں کہہ سکتے تھے۔" زرین

نے شہزاد کے سامنے پانی پٹختے ہوئے کہا۔

"پہلے تم ہی سے کہا تھا لیکن تم بچے کا فیڈر بنانے میں مصروف تھیں؟"

"تو پھر...... پہلے بچوں کو دیکھوں یا آپ کو؟ تھوڑا سا انتظار کر لیتے تو قیامت ہی آ جاتی۔"

زرین کی آواز تیز تھی تو اماں کے کانوں تک کیوں نہ پہنچتی۔

"یااللہ! یہ بچے ہیں یا قیامت جس سے بات کرو۔ وہی بچوں کا مسئلہ لیے بیٹھی ہے۔ ہماری بھی تو نواسی بیاہی ہے۔ ماشاء اللہ دو بچے ہیں اس کے بھی۔ بھرے پرے سسرال میں بیٹھی ہے۔ سب کے آگے پیچھے ایسے پھرتی ہے جیسے ہوا۔ مجال ہے جو کسی کو شکایت ہو۔"

"لو اب سن لو' صدف نامہ' محترمہ ضرورت سے زیادہ ہی پھرتیلی ہیں۔ اس جیسا تو کوئی کیا نہیں، اس نے تو پہاڑ کھود کر دودھ کی نہریں نکال دیں اور ہمارے گرد کنیزیں کھڑی مورچھل لیے۔"

زرین بڑبڑاتے ہوئے بستر ٹھیک کرنے لگی۔

"اگر تم زبان کا استعمال کم اور ذہن کا زیادہ کرو، تو اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"اماں تو ہمیشہ ہی ٹھیک کہتی ہیں۔ ایک غلط ہوں تو میں ہی۔" زرین کو آگ لگ گئی۔ وہ بستر کی چادر پھینک کر کمرے سے نکل گئی۔

سب ناشتا کر کے فرداً فرداً جا چکے تھے۔ سوائے ربیعہ کے۔ ربیعہ ابھی رہتی تھی۔ اماں حماد کو یاد کر رہی تھیں۔

"تین دن ہو گئے ہیں۔ نگوڑا گھر کو نہیں لوٹا۔ اس موئی سیاست میں گھسا ہے۔ جیسے اس کے بغیر تو ملک چلے گا ہی نہیں۔ اپنے گھر میں تو حکمرانی چلتی نہیں۔ ملکوں پر حکمرانی کرے گا۔ ہر کامیاب مرد کے پیچھے اچھی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن بس۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔"

اماں آبدیدہ ہو کر آنسو صاف کرنے لگیں۔

حماد ان کے سب سے بڑے نواسے تھے۔ حماد سے چھوٹے سات بہن بھائی تھے، سب انہیں بڑے بھیا کہتے تھے اور نہایت احترام کرتے تھے۔ صباحت حماد کی بیوی تھی جسے کہا تو بڑی بھابھی جاتا تھا لیکن بقول اماں کے اس میں بڑا پن نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شادی کو سات سال ہو گئے تھے لیکن دونوں میاں بیوی کی کبھی نہیں بنی تھی۔ یہ بھی مضحکہ خیز حقیقت تھی کہ دونوں کی لو میرج تھی۔ اس کے باوجود دونوں کا کمرہ جنگ کا میدان بنا رہتا تھا جس کی وجہ سے دونوں بچے ذہنی طور انتشار کا شکار ہو رہے تھے۔ نہ جانے بیوی کی کیا خواہشات تھیں اور شوہر کی کیا ترجیحات...... دونوں کی اول دن سے بن ہی نہیں پا رہی تھی۔ اب حماد اکثر گھر سے باہر رہنے لگے تھے تاکہ گھر میں بے سکونی نہ ہو اور بیوی کے ہاتھوں تذلیل سے بچے رہیں۔

"ویسے صباحت بھابھی اتنی بری تو نہیں ہیں۔ جتنا ان کے بارے میں مشہور ہے۔ ہم سے تو بہت اچھا رویہ ہوتا ہے ان کا۔ جانے اماں سے کیوں نہیں بنتی ان کی۔"

ربیعہ تیار ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

اس کی بس آ گئی تھی۔ وہ تیار ہو کر اپنا بیگ ٹٹول رہی تھی، بیگ میں اتنے بھی پیسے نہیں تھے کہ وہ لنچ بریک میں اپنی چند سہیلیوں کو کوک اور برگر ہی کھلا سکے۔ ہمیشہ کی طرح وہی لگا بندھا خرچ۔ کیا ہوتا ہے اتنے کم پیسوں میں۔ اس کا ازلی احساس کمتری اندر سے باہر نکل آیا۔ وہی عام سا یونیفارم اور عام سے جوتے۔ ہمیشہ کی طرح وہ نظر بچا کر بڑی بھابھی کے پاس چلی گئی۔ اس کی مظلوم شکل دیکھ کر صباحت کو ایک لمحہ لگا سمجھنے میں۔

"تم ابھی کالج نہیں گئیں؟" صباحت نے ایسے ہی پوچھا۔

"بس تو آ گئی ہے لیکن۔ وہ دراصل کچھ پیسے ادھار چاہیے تھے۔" وہ رک رک کر بولی۔

صباحت کو ہنسی آ گئی۔ اس نے دراز کھول کر دو سرخ نوٹ دے دیے۔

"اتنے زیادہ۔" ربیعہ کو شرمندگی اور خوشی ایک ساتھ ہوئی۔

"کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ تمہارے بھائی کی ہی کمائی ہے، میں تو کہیں سے لے کر نہیں آئی تھی۔ اور سنو واپس دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

"تھینک یو بھابھی! آپ تو سمجھ سکتی ہیں، کالج لائف کے کیا کیا مسائل ہوتے ہیں۔ بڑی اماں اور آپا جان تو پانچ سو روپے دے کر سمجھ لیتی ہیں کہ دنیا فتح ہو گئی۔ لیکن انسان کی کچھ عزت بھی تو ہوتی ہے۔"

"اوکے۔ اوکے، میں سمجھتی ہیں۔" صباحت نے ہنس کر کہا تو ربیعہ مسکرا کر کمرے سے نکل گئی۔

"تھینک گاڈ کہ صباحت بھابھی کو کچھ سینس ہے۔ ورنہ اس گھر میں تو آپا دھاپی پڑی ہوئی ہے۔" وہ سوچتے ہوئے چادر اوڑھنے لگی۔

حماد سے چھوٹے عباد تھے جن کی شادی کو چار سال ہوئے تھے۔ عباد سے چھوٹا شہزاد اور پھر صدف تھی۔ تینوں بہن بھائیوں کی شادی دو چار دن کے وقفے سے ہوئی تھی تینوں کے دو دو بچے تھے۔

صدف سے چھوٹا عارش تھا۔ عارش ایف اے فیل تھا اور پرائیویٹ کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ عارش سے چھوٹا ثاقب تھا، ثاقب میڈیکل کا طالب علم تھا اور بی ایس سی کر رہا تھا۔ ربیعہ ثاقب سے چھوٹی تھی جو فرسٹ ایئر میں زیرِ تعلیم تھی۔

سنی ربیعہ سے چھوٹا تھا اور سیونتھ کلاس میں پڑھ رہا تھا۔

سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے تھے۔ اب گھر میں ننھے بچے اور خواتین ہی رہ گئیں تھیں۔

صباحت نے کپڑے دھونے کی مشین لگا لی تھی۔ زرین کچن کی صفائی کرنے لگی۔ اور رما بڑی اماں کے ساتھ سبزی بنوانے لگی۔

''ابھی تک بڑی آپا کا فون نہیں آیا۔ صدف کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو۔ شاید تمہیں معلوم نہیں صدف کو ڈاکٹر نے آپریشن بتا رکھا ہے۔ شائد اپنڈکس کا۔''

زرین نے صباحت کو آہستگی سے بتایا' کہیں بڑی اماں کے کانوں میں آواز نہ چلی جائے۔ صباحت کا دل بیٹھ گیا۔

''اس کا شوہر تو کماتا نہیں۔ ظاہر ہے بھائیوں کی ہی گردن پہ چھری پھرے گی۔'' دونوں دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئیں، پہلے دونوں بچے بھی آپریشن سے ہوئے تھے۔ عباد اور شہزاد نے خون بھی دیا تھا۔

''جان اور مال سے بھائی ہر وقت حاضر رہتے ہیں۔ لیکن داماد صاحب کے مزاج ہی ٹھکانے پہ نہیں ملتے۔''

''خود ہی محترمہ کے کون سے مزاج ملتے ہیں۔'' زرین چیخ کر بولی۔ ''بھائیوں کی رگوں سے بروقت خون نچوڑنے پر تلی رہتی ہے۔ امی نے پرسوں ثمن کی سوتی قمیصیں اور چند کرسٹل کے برتن بھیجے تھے۔ آئی ہوئی تھی دیکھ کر فوراً بولی۔ شہزاد! مجھے بھی ایسی گلاسیاں لا دینا۔ شہزاد صاحب تو پتلی کے جن کی طرح فوراً شام کو گلاسیاں لے آئے مجھے تو دیکھتے ہی آگ لگ گئی۔ بھلا بتاؤ۔ اولاد کے لئے تو باپ لا نہیں سکتا اور بھانجا بھانجی کے لئے فوراً حاضر ہیں۔ کہوں تو کہہ دیں گے۔ اس کا باپ کماتا نہیں ظاہر ہے بہن کی ذمے داری بھی ہم ہی پہ ہے۔'' زرین نے نقل اتارتے ہوئے کہا تو صباحت کو ہنسی آ گئی۔

''ایسی کون سی بات ہے جس پہ ہنسا جا رہا ہے۔'' رما نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ایسے ہی' کچھ نہیں۔'' دونوں نے ایک دوسرے کی طرف آنکھ دیکھتے ہوئے کہا۔

رما سبزی کی ٹوکری لینے آئی تھی، چلی گئی۔

''بڑی اماں کی پکی جاسوس ہے۔'' زرین نے آہستگی سے کہا۔

''ابن صفی کے ناول پڑھتی رہی ہوگی۔'' صباحت لطف لے کر بولی۔

''ابن صفی۔'' زرین کے خاک پلے نہ پڑا۔ حیرت سے صباحت کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم چھوڑو۔ ہے کوئی بلا۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئیگی۔'' زرین اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے کئی احمقانہ سوال کر دیتی تھی اور پھر دیر تک اپنی تعلیم اور اپنے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے احساسِ کمتری میں مبتلا رہتی تھی۔

اب بھی کچھ ایسی ہی سچویشن ہوئی تھی۔

☆☆☆

آج کالج میں ویمن ڈے کی وجہ سے فیشن شو کا اہتمام کیا گیا تھا۔ فیشن ایبل گھرانوں کی تیز طرار لڑکیاں، دراسٹائل لباسوں میں کیٹ واک کر رہی تھیں۔ ربیعہ بڑی حیرت سے ان کے بے تکے فیشن اور لہراتے جسم دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ یہ بھی تو لڑکیاں ہیں کیا ان کے گھروں میں بڑی اماں جیسی ہستی نہیں ہوتی۔

ان کا گھر دنیا کے عام گھروں کی طرح کیوں نہیں تھا۔ پابندیوں سے پاک اور آزاد۔

''صباحت بھابھی نے کتنے ٹھاٹ کی آزاد زندگی گزاری ہے۔ اگر اب پنجرے میں قید ہے تو کیا ہے انہوں نے دنیا کی رنگینیاں تو دیکھ لیں، میں نے کیا دیکھا۔ نصیحتیں اور روک ٹوک۔ کیوں؟ اس لیے کہ میری ماں نے اپنی ساری زندگی اپنے ماں باپ کے گھر گزار دی۔ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ کفالت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ آپا جان، نانا نانی کی اکلوتی اولاد تھیں۔ ماں باپ نے فوراً بیٹی اور نواسا نواسی کو گلے لگا لیا۔ نانا کی زندگی چند دن کی تھی۔ وہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ اب بڑی اماں تھیں اور آپا کی ننھی فوج..... انہوں نے اس ننھی فوج کو بڑا سنبھال سنبھال کر پالا کہ انہیں زمانے کی ہوا نہ لگ جائے۔

دو بڑے بھائیوں نے پڑھا۔ باقی سب میٹرک ایف اے تک ہی پہنچ سکے۔ صدف کی شادی چھوٹی سی عمر میں ہی کر دی گئی۔ کوئی سنبھالنے والا نہ ہونے کی وجہ سے جو کچھ بھی نانا چھوڑ کر گئے تھے منشیوں اور ملازموں کے پیٹ میں اتر گیا۔ اب زندگی کی جدوجہد تھی اور مسائل تھے۔

بھائی اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہو چکے تھے اور روزگار کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے لیکن قسمت کا ستارہ بھی کسی جلے ہوئے برتن کی طرح سیاہ ہو کر رہ گیا تھا جو چمکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

بس ضروری اخراجات نکل جائیں وہیں سب کافی سمجھ لیتے تھے۔ حالانکہ زندگی اس سے بھی آگے کتنی رنگین اور خوبصورت تھی۔

اسے کالج میں داخلہ لیے چند ماہ ہی ہوئے تھے اور ان چند ماہ میں اس کے خیالات میں عجیب و غریب تبدیلیاں آتی جا رہی تھیں، ربیعہ لایعنی سوچوں میں گرفتار تھی۔

تب ہی جویریہ نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ چونک گئی۔ پروگرام ختم ہو چکا تھا اور ہال کی آدھی سے زیادہ نشستیں بھی خالی ہو چکی تھیں۔

''کہاں کھوئی ہوئی ہو۔ چلو باہر چلتے ہیں۔''

ربیعہ کچھ خفیف سی ہو کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

''خواتین و حضرات آج کی شام عارش کے نام۔ اے ربیعہ! ربیعہ کی بچی جلدی آؤ۔ دیکھو میں گرم گرم تلی ہوئی مچھلی اور تندوری روٹیاں لایا ہوں۔ فٹافٹ برتن لے آؤ۔ سنی! یہ آئس کریم فریج میں رکھو۔''

''کیوں کیا لاٹری نکل آئی ہے، جو اتنی شاہانہ دعوت کر رہے ہو۔'' ربیعہ کتابیں رکھ کر دوڑی ہوئی آئی۔ ثاقب پہلے سے ہی پہنچ چکا تھا۔ سنی آئس کریم فریج میں رکھتے ہوئے چاٹ رہا تھا۔

ننھے بچے عارش کے گرد ایسے اکٹھے ہو گئے تھے جیسے محلے میں کوئی ریڑھی والا بچوں کے لئے مزیدار چیزیں فروخت کرنے آیا ہو۔

''صدف بھی آئی ہوئی ہے کیا؟'' بچوں کے درمیان عیشہ اور انس کو دیکھتے ہوئے عارش نے پوچھا۔

''ہاں۔ صبح سے آئی ہوئی ہے، طبیعت صحیح نہیں ہے اس کی۔''

''تو پھر کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔'' عارش نے سرسری سا کہا۔ اس کی تمام تر توجہ مچھلی پہ تھی۔

''اب تم لوگ آ گئے ہو تو لے کر چلے جانا۔ اس کے سسرال والوں کو تو فکر نہیں۔ ساری بات تو شوہر سے ہوتی ہے۔ جو وہی توجہ نہ دے تو پھر کسی سے کیا ارمان۔ اسے تو کام کے لئے ایک نوکرانی چاہیے یا ضرورت کے لئے ایک عورت۔ وہ انسان کب سمجھتے ہیں اس کو۔''

اماں اور بڑی آپا کی نشریاتی تقریر شروع ہو چکی تھی۔

''ہمارے گھر میں تین تین بہوئیں آئی ہوئی ہیں۔ بتاؤ کسی کو کچھ دکھ دے رکھا ہو تو۔ شوہروں نے ہتھیلی کا چھالا بنا کے رکھا ہے۔ ایک یہ ہے بدقسمت۔ ذرا سی بیمار ہوئی۔ میکے چھوڑنے چلے آئے، تندرست ہو تو ایک دن یہاں نہیں چھوڑیں گے۔''

''اب اصل واقعہ کی طرف بھی آیا جائے گا یا لن ترانیاں ہی ہوتی رہیں گی۔'' بڑی آپا کو عارش کی غیر دلچسپی بہت بری لگی۔

''اگر تمہیں اتنی ہی بیزاری ہے تو اپنا راستہ لو۔ ہم تو اپنے دکھوں سے پہلے ہی بیزار ہوئے بیٹھے ہیں۔'' وہ چڑ کر بولیں۔

''صدف کے کئی دن سے پیٹ میں درد ہے۔ ایسا درد اٹھتا ہے کہ بچی تڑپ تڑپ جاتی ہے۔'' اماں نے بتایا۔

''تو اس سے کہو کہ کم کھایا کرے۔ بھینس کی طرح تو پھیلتی جا رہی ہے۔'' عارش اپنی بدزبانی سے لاچار تھا۔

''آئے ہائے، غم سے پھول رہی ہے۔ ورنہ کھانے کو وہاں ملتا ہی کیا ہے۔ نہ فروٹ نہ دودھ۔

یں تو فکر ہے کہیں اپنڈکس کا درد نہ ہو۔ تین وقت اناج سے کیا ہوتا ہے۔ نرا جو وہی پھولتا ہے۔''

''اماں! اناج میں بڑی طاقت ہے۔ جو پھل اور دودھ پیتے ہیں وہ اندر سے کھوکھلے ہوتے اناج کھانے والے جفاکش بھی ہوتے ہیں اور ان کی دو گز کی زبان بھی ہوتی ہے!''

''گینڈے! تمہاری زبان ضرورت سے زیادہ ہی چل رہی ہے۔'' صدف جو دیر سے رش کی بکواس سن رہی تھی۔ کمرے سے باہر نکل آئی۔

''ماشاءاللہ'' عارش نے اس کے گیم شیم وجود کو دیکھ کر پینترا بدلا۔ ''آپ آئے ہمارے لمر میں ہمارے گھر کی قسمت۔ کبھی ہم آپ کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔'' صدف دھرنا مار کر اماں ے تخت پہ بیٹھ گئی۔

''دیکھو، یہ محترمہ بیمار ہیں۔'' اس نے کھانا شروع کیا تو عارش نے فوراً طنز کر دیا۔

''یہ بچوں کی فوج کیا ہماری قسمت میں ہے۔ جب دیکھو یہیں منڈلاتے رہیں گے۔ ان کی کے حوالے کرو ناں۔ میری ساس تو ایک پل بھی پوتا پوتی کو اپنے گرد برداشت نہیں کرتیں۔ ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ ایک تم ہو۔ اپنے سینے پہ ہی سوار رکھتے ہو۔'' صدف ناک چڑھا کر بولی۔

''اے بدتمیز لڑکی! تم سے ہزار بار کہا ہے۔ اپنے گھر کی باتیں یہاں نہ کیا کرو۔ سخت زہر ہیں مجھے تمہارے گھر والے، آ جاتی ہو ہمارا گھر خراب کرنے۔''

عارش نے سب بچوں کے حصے علیحدہ علیحدہ کر کے لفافے میں ڈالے اور ان کے ہاتھوں دے دیے۔ ساتھ آواز بھی لگا دی۔

تینوں باری باری آ کر بچوں کو لے گئیں۔

''دیکھا آپا! آپ نے۔ تینوں میں سے ایک کو بھی توفیق نہیں ہوئی مجھ سے بات کرنے دعا سلام تو دور کی بات۔''

''چلو انہوں نے نہیں کیا تو تم کر لیتیں۔ کون سا تمہاری عزت گھٹ جاتی ویسے بھی بقول ے تم تینوں سے چھوٹی ہو۔''

''عمر میں چھوٹی ہوں۔ مگر رشتہ تو میرا ہی بڑا ہے۔''

''کیوں کیا تم ان کے اوپر ہائی کمان ہو۔ یا عالی جاہ!''

''تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا، یہ گھریلو فلسفہ ہے۔'' ربیعہ مصروفیت سے بولی۔

''گھریلو فلسفہ نہیں۔ من گھڑت فلسفہ ہے۔''

''اے بی بی! ہمارے دم تک ہی تمہارا زور ہے۔ ہمارے بعد تو بھائی بھاوج تمہیں پوچھیں بھی نہیں۔''

"اگر انسان کا اپنا ذاتی اخلاق اور رویہ اچھا ہو تو تا عمر اچھے تعلقات رہ سکتے ہیں۔ کیا ہے، ایک فریق کو دبا دو اور دوسرے کو اس پہ برتری دیے جاؤ۔"

"اماں! اس کے خیالات سن لیں۔ اس سے تو ہمیں کسی قسم کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ خود بہنوں کی عزت نہیں کرتا بیوی سے تو کیا کرائے گا۔"

"پھر کیا تمہاری عزت کم ہو جائے گی یا تمہارا جاہ و جلال۔"

معاً حماد گھر میں داخل ہوئے تو سب ہی کی توجہ ان کی طرف ہو گئی۔

حماد تین بعد لاہور سے لوٹے تھے۔ انہوں نے بلند آواز میں سلام کیا۔ اماں اور آپا لپک ان کی طرف بڑھیں۔

ادھر ماؤں کا پیار تھا۔ ادھر بیٹے کی سعادت۔

"ہائے قربان جاؤں ایسی محبت پہ....." عارش جل کر بولا تو سب ہی ہنسنے لگے۔

پھر وہ جو تحائف لے کر آئے تھے۔ صدف کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ لو بھئی صدف! اچھا ہوا کہ تم بھی آئی ہوئی تھیں۔ اس میں بچوں کے کھلونے اور کپڑے وغیرہ ہیں۔ سب بچوں کو دے دو اور جو تمہیں پسند آئے اپنے بچوں کے لئے لے لو۔"

صدف تو اس نمبرداری پہ پھولی نہ سمائی۔ اتنی دیر سے عارش جو اس کی کانٹ چھانٹ کر تھا۔ بھول بھال کر تحائف کی تقسیم میں مشغول ہو گئی۔

حماد اپنے بچوں کو پیار کرنے لگے۔ پھر صدف کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔

"صدف! اس شاپر میں دو نیٹ کے زنانے سوٹ ہیں ایک تمہارے لیے اور صباحت کے لئے۔ جو رنگ تمہیں اچھا لگے لو۔" صدف نے جھٹ سے ایک سوٹ اٹھا کر رکھ لیا دوسرا اٹھاتے ہوئے بولی۔

"یہ بھابھی کو دے آؤں۔" ساتھ ہی اٹھ کر چل دی۔ حالانکہ صباحت کا رویہ اکثر آمیز ہوتا تھا۔ لیکن حماد کے رویے کی وجہ سے بہنیں اس کے رویے کو نظر انداز کر دیتی تھیں۔

"ے آئی کم ان۔" صدف اتراتی ہوئی صباحت کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ پہلے۔ بیٹھی جل بھن رہی تھی کہ جو چیز اس کا شوہر اس کے لئے لاتا تھا۔ وہ اس کے پاس آنے سے پہلے کیوں کھل جاتی تھی۔ دوسرے پسند کا اختیار بہنوں کے پاس تھا، ریجیکٹ چیز اس کے حصے میں تیسرے جو چیز حماد لاتے تھے وہ حماد کو اپنے ہاتھ سے اسے دینی چاہیے تھی نہ کہ بہن صاحبہ دینے آئی۔

"بھابھی! یہ بھائی لائے ہیں آپ کے لئے اور یہ بچوں کا سامان۔"

"رکھ دو۔" صباحت جلی بھنی تو بیٹھی ہی تھی۔ ٹی وی دیکھتی رہی۔

صدف چیزیں رکھ کر تھوڑی دیر کھڑی کمرے کا جائزہ لیتی رہی کہ شاید بھاوج بیٹھنے کا کہہ دے لیکن اس نے بیٹھنے کو نہیں کہا تو صدف کو برا بھی نہیں لگا۔ کیونکہ اس وقت اسکا دل نیٹ کے سوٹ سے شاد ہو گیا تھا۔

حماد کمرے میں آئے تو وہ سامان ایسے کا ایسا ہی پڑا تھا۔ صباحت نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ حماد نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر نارمل سے انداز میں بولے۔

"تمہیں بچوں کی چیزیں اور کپڑے پسند نہیں آئے؟"

صباحت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا دل احتجاج کرنے کو چاہ رہا تھا کم از کم اس کا اتنا تو حق تھا کہ وہ پوچھتی میری اس گھر میں کیا حیثیت ہے۔

"تحائف محبت کی زبان ہوتے ہیں پھر یہ تمہاری بہنیں موکل بن کر دن رات تمہاری اور میری محبت میں کیوں حائل رہتی ہیں ڈائریکٹ میرے لیے اگر کچھ لے آتے تو کیا تم پہ دفعہ ۱۴۴ لگ جاتی۔" لیکن اس نے اپنے احتجاج کو اندر ہی دبا لیا۔

حماد نے کون سا اس کی بات سننی تھی۔ وہ تو یہی کہتے "یہ سب تمہارے اندر کا کمپلیکس ہے۔ بہن بھائیوں کی ذمے داری سب مجھ ہی پہ ہے۔ کیونکہ نہ تو ہمارے سر پہ باپ ہے اور نہ ہی دو ھیال میں سے کسی کی سرپرستی۔"

"ہونہہ۔ یہ بڑا ہونا ہی تو سب سے بڑا عذاب ہے میرے لیے۔ کچھ تو بڑے تھے۔ مزید سیاست میں جا کر بڑے ہو گئے۔"

"میں تین دن کے بعد لاہور سے آیا ہوں۔ تمہارا موڈ ابھی بھی خراب ہے۔" حماد نے شکوہ کیا۔

"نہ تو میرے لیے گئے تھے اور نہ میرے لیے آئے ہیں۔ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی کون سا آپ میرے پاس رہتے ہیں۔ میری بلا سے آپ باہر تین دن رہیں یا تیس دن۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

حماد نے تپتی نگاہوں سے دیکھا۔ "تمہارے اسی رویے نے تو مجھے باہر دھکیلا اور مجھے دوسری مصروفیت میں پناہ لینے پر اکسایا۔ شکر کرو۔ میں بھٹک نہیں گیا۔ گھر میں سکون ہو تو کون باہر جانا پسند کرتا ہے۔"

"آپ جیسے لوگ ضرور پسند کرتے ہیں۔ جن کی خوراک ہی عزت کروانا ہو۔ وہ بھلا گم نامی کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ لیکن مسٹر حماد! اس چیز کے علاوہ بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ محبت اور صرف محبت۔"

"آخر تم مجھ سے کس قسم کی محبت چاہتی ہو۔ وہ کون سی ضروریات ہیں تمہاری جو میں پوری

نہیں کرتا یا اپنے بچوں پہ میری توجہ نہیں، وہ اچھے سکول میں نہیں پڑھتے یا تمہیں میں نے اپنی ذات سے کوئی تنگی دی ہوئی ہے۔ آخر تم مجھ سے کس قسم کی محبت چاہتی ہو۔" حماد زچ ہو کر بولے۔

"حماد! ضرورت اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

صباحت نے کہا تو حماد طنزیہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"حماد! مجھے تمہاری توجہ اور چاہت کی ضرورت ہے۔ میں ضروریات کے بغیر رہ سکتی ہوں لیکن تمہارے بغیر نہیں۔ تم میری ضرورت نہیں ہو۔ میری زندگی ہو۔ ہماری بھی تو کوئی ذاتی زندگی ہونی چاہیے۔ ایسی زندگی جس میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ جو صرف میرے آپ کے اور ہمارے بچوں کے لئے ہو۔ ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنے کے لیے یہ نہ سوچنا پڑے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ لیلیٰ مجنوں بنے پھرتے ہیں۔ عزت و مرتبہ اپنی جگہ، لیکن۔ محبت..... محبت کو بھی تو سمجھو، یاد کریں وہ وقت، آپ کیا تھے اور میں کیا تھی۔"

صباحت اپنا مؤقف شاید صحیح طرح بیان نہیں کر سکی تھی۔ شاید کر بھی نہیں سکتی تھی۔

حماد نے اس کی طرف دیکھا۔

"وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ میں سدا تمہارے نخرے نہیں اٹھا سکتا۔ اب تم بھی ایک ذمے دار عورت ہو۔ ہمارے مسائل اب کچھ اور ہیں۔"

"کچھ مسائل نہیں ہیں ہمارے۔ سب آپ کے ماحول کی پیداوار ہے۔"

"افسوس تو اسی بات کا ہے کہ تم نے اس ماحول میں آج تک ایڈجسٹ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ اپنے دکھوں کا رونا روتی ہو۔ کیا دکھ ہے تمہیں صباحت بیگم! انسان کا جب پیٹ بھر جائے نا، تو اسے مزید چونچلوں کی سوجھتی ہے۔ لیکن انسان کا بنیادی مسئلہ پیٹ بھرنا ہے۔ تمہارا دکھ ضروریات نہیں ہیں۔ عیش و عشرت ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں سینماؤں میں لے کر جاؤں، ہوٹلنگ کراؤں یا پارکوں میں لیے پھروں۔ اسی سے میری محبت کا اظہار ہو گا تو آئی ایم سوری۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ نہ تو میرا ماحول اس چیز کی اجازت دیتا ہے اور نہ میرا ذہن افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم نے آج تک اس ماحول کو نہیں اپنایا۔ صرف مجھے اپنایا ہے..... لیکن میں اپنے ماحول سے نہیں کٹ سکتا۔ تم ایک آزاد ماحول کی پروردہ لڑکی تھیں اور آج بھی تمہیں آزادی چاہیے۔ آوارہ گردی کرنا اور لڑکوں کے ساتھ گھومنا پھرنا۔ اس چیز کو بھولنا ہو گا۔"

"میں آزاد ماحول کی لڑکی تھی۔ اس چیز کا تم لوگوں کو پہلے سے علم تھا۔ پھر کیوں بیاہ کر لائے تھے؟" صباحت کے آگ ہی تو لگ گئی۔

(لوگ چاند پہ جا رہے ہیں اور یہ بیٹھے ہیں آج تک وہی روایتی قصے لیے)

"قسمت کا لکھا کون بدل سکتا ہے۔ اور پھر آپ کے حسن نے ہمیں اتنا گھائل کر دیا تھا کہ ہم کسی اور کی طرف دیکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یوں بیاہ کر لائے تھے۔" حماد کا موڈ یکا یک بدل گیا۔ ہلکے فیروزی رنگ کے لباس میں اس کا تنک منک وجود اور تیکھے نقوش وہ بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔ جینک اب وہ نوعمر لڑکی نہیں تھی، وہ بچوں کی ماں اور مجیو رعورت بن گئی تھی، لیکن اس کی دلکشی میں فرق نہیں آیا تھا۔ حماد کی آنکھوں میں پیار بھرا اظہار تھا۔ صباحت نے نظریں چرا لیں۔

اسے یونیورسٹی کے وہ دن یاد آ گئے جب دونوں اکٹھے پڑھتے تھے۔ کتنا چاہتے تھے ایک دوسرے کو۔ گھنٹوں بیٹھے مستقبل کے پلان بنایا کرتے تھے۔ کتنے حسین خواب تھے صباحت کی آنکھوں میں، لیکن اسے کیا پتا تھا۔ آج کا کھلنڈرا لڑکا۔ کل ذمے داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا مجبور انسان بن کر نکلے گا۔ آج وہ جو گھنٹوں اس کے پیچھے پھرتا ہے۔ کل..... وہ اس کے انتظار میں دن اور رات گزارا کرے گی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اماں اور آپا جان نے ہی کیا، بلکہ گھر کے کسی فرد نے اس لو میرج کو قبول نہیں کیا تھا۔ ہاں۔ حماد نے سب سے بڑا بیٹا ہونے کے ناطے ان لوگوں سے اپنی بات منوا ضرور لی تھی لیکن اماں اور آپا جان کے دل میں زبردست پھانس تھی۔

اماں اپنی سگی بھتیجی کو حماد کے لئے پسند کر چکی تھیں اور رشتہ بھی ڈال دیا تھا۔ لیکن جب انہوں نے حماد کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو انہیں اپنی عزت کی خاطر خاموش ہونا پڑا۔

سو اول دن سے صباحت کی ہر بات پہ نکتہ چینی شروع ہو گئی۔ اماں اور صباحت کے درمیان ہمہ وقت محاذ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ آپا جان کو تو اس کی ہر بات کھٹکتی تھی۔ یہ بھی حقیقت تھی صباحت نے کبھی اماں جیسی طاقت اور شخصیت کو رام کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ چاپلوسی اور عبدبندیوں سے آزاد ذہن کی مالک تھی۔

اماں اپنی بھتیجی عباد کے لئے لے آئیں۔ انہیں صباحت سے چڑ تھی۔ اس لیے اول دن سے ہی رما کو غیر معمولی اہمیت ملی۔ رما کے بعد زرین آئی لیکن کوئی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے رما کی ہی پوزیشن مستحکم رہی۔ حالانکہ زرین اماں اور آپا جان کی مرضی و انتخاب تھی، لیکن اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ دلوں میں وہ جگہ نہ بنا سکی جو رما بنا چکی تھی۔

صباحت کے بارے میں سب کچھ تو معلوم تھا انہیں، وہ شادی سے پہلے برقع نہیں اوڑھتی تھی۔ نہ ہی ان کے ہاں بیٹیوں کو زیادہ لیٹے دینے کا رواج تھا۔ اس کے بھائی انگلینڈ میں تھے۔ بھابیاں جینز پہنتی تھیں۔ ماں فوت ہو چکی تھی۔ دو بہنیں تھیں جو اسی شہر میں رہتی تھیں۔ ان کا بھی لائف سٹائل آزادانہ تھا۔ اماں نے سب سے پہلے برقع پر اعتراض کیا۔ پھر باہر جانے پہ۔ پھر بہنوں سے

ملنے پر۔ پھر ماں باپ کے گھر جانے پہ بھی پابندی لگ گئی۔ اب دن رات اسے اسی گھر میں رہنا تھا کیونکہ گھر سے باہر کی دنیا آوارہ تھی اور ''سلمان نگر'' کے لوگ بہت پاکیزہ تھے۔

''کہاں کھوئی ہوئی ہو؟'' حماد نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ تو وہ ماضی سے کر حال میں آ گئی۔

''جانے کیا الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہو۔ کبھی ہمارے بارے میں بھی سوچ لیا کرو۔'' حما نے اس کی تیکھی سی ناک کو چھیڑا۔ نجانے اس شخص کی شخصیت میں کیا سحر تھا کہ وہ اس کا قرب پا ہی سب کچھ بھول جاتی تھی۔

''بھائی! کھانا گرم ہو گیا ہے۔ کھا لیجئے۔''

صدف کی آواز صباحت کو سخت ناگوار گزری تھی۔ وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

''کیا ہوا؟'' یکا یک اس کے بدلتے موڈ کو دیکھ کر حماد نے حیرانی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتی وہی کی طرف مصروف ہو گئی۔ جانے یکا یک عورت کو کیا ہو جاتا ہے۔ پل میں کچھ ہے اور پل میں کچھ۔

حماد سوچتے ہوئے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

موسم بہت ہی خوشگوار ہو رہا تھا، لیکن اس کے اندر بڑی اداسی تھی۔ دو دن سے انگلش کی کلا میں پکنک پر جانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لیکن اسے سو فیصد امید تھی کہ گھر والے اسے ٹرپ پہ جانے ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ کچھ تعجب نہیں اس کے ٹرپ کا سن کر اسے کالج سے ہی اٹھا لیا جاتا۔

بہت سی مخالفتوں کے بعد تو اس نے کالج میں داخلہ لیا تھا صرف اور صرف عباد بھائی حمایت پر۔ اب تو وہ بھی اتنی توجہ نہیں دیتے تھے۔ نہ جانے رما بھابھی اندر ہی اندر کیا پھونکتی ر ہیں۔ اب تو عباد بھائی بھی بدلتے جا رہے تھے۔ اسے رما سے سخت چڑ تھی۔ ایک تو محترمہ امال ضرورت سے زیادہ ہی چہیتی بہو تھیں۔ دوسرے عباد بھائی تو بالکل ہی مجنوں بن کر رہ گئے تھے۔ اُ تو رما بھابھی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ زرین بھابھی سے تو اللہ بچائے۔ انہوں نے تو نہ پڑھا تھا اور نہ انہیں کچھ معلوم تھا۔

رہ جاتی تھی صباحت جو وقت کے ساتھ ساتھ ربیعہ کو انتہائی مظلوم ہستی لگنے لگی تھی وہی کوئی حل نکال سکتی تھی۔ دو دن تک تو وہ اپنے آپ کو بہلاتی رہی، لیکن دل تھا کہ مچلا جاتا آخر کار وہ دل کی خواہش کو دور نہ کر سکی۔ صباحت سویرا کو ہوم ورک کرا رہی تھی۔ ربیعہ اس کے آ کر بیٹھ گئی اور فائز کے ساتھ کھیلنے لگی۔

صباحت نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ادھار مانگنے کا اشتہار نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا چہرا اترا ہوا تھا اور آنکھیں اداس تھیں۔ صباحت چونک گئی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''آپ سویرا کو پڑھا لیں، میں بعد میں بات کر لوں گی۔'' صباحت نے سویرا کی چھٹی کر اور ہمہ تن گوش ہو گئی۔

ربیعہ نے جھجکتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ صباحت کے منہ سے ایسی ہنسی نکلی جیسے سے پھونک نکل گئی ہو۔

''یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ تم نے کسی کو بتایا ہے؟''

''نہ بابا۔ اگر پتا لگ گیا ناں۔ تو میری تو ہمیشہ کے لئے چھٹی سمجھو۔''

''واپسی کب تک ہو گی؟'' صباحت سوچ کر بولی۔

''چار یا پانچ بجے تک۔''

''پچھلے دونوں پریکٹیکل کی وجہ سے تم اتنے بجے تو آ ہی جاتی تھی۔''

''وہ اور بات تھی۔''

''نہیں! اب بھی یہی بات ہے۔ تم میڈیکل کی طالبہ ہو اور یہ تو بہت لٹ فیلڈ ہے۔ تک کوئی بھی انسٹکشن پہ آ سکتا ہے یا پریکٹیکل کا ہی بہانہ کر دینا۔''

''اگر بھائیوں کو پتا لگ گیا تو۔''

''بھائی کیا روز اس تفریح گاہ پہ جاتے ہیں جہاں تم جا رہی ہو۔ اماں کو بتا جانا کہ دیر ہو ئے گی۔ عارش یا ثاقب کو بھیج دیں گی۔ آدھے گھنٹے کا ٹائم زیادہ بتا کر جانا۔''

''آنے کا تو کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں کالج بس چھوڑ جائے گی۔''

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں اور اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کیا کلاس کی اور لڑکیاں نہیں جا ، پھر ٹیچر بھی جا رہی ہوں گی۔ اتنا منہ لٹکانے والی کون سی بات ہے۔''

ربیعہ خفیف سی ہو کر ہنس پڑی۔

''یہ لو۔ کچھ پیسے ہیں، رکھ لو۔ ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔''

ربیعہ وہاں سے سرتاپا مشکور ہو کر اٹھی تھی۔ صباحت نے کہا تھا۔ وہ سنبھال لے گی۔

☆☆☆

آج وہ بے انتہا خوش تھی۔ آزاد جو تھی۔

سب لڑکیاں ادھر اُدھر کلکاریاں مارتی پھر رہی تھیں۔ آج اسے چادر تو کیا دوپٹے کا بھی

ہوش نہیں تھا۔ اس کے گھنے بالوں کی چوٹیا اس کے دل کی طرح مست لہرا رہی تھی۔ گالوں پہ خوشی کی سرخی چھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔ آج اسے خود پہ پیار آرہا تھا۔

آج اسے نہ کوئی زیادہ اونچا بولنے پہ ڈانٹ رہا تھا، اور نہ اچھلنے کودنے پہ نصیحتیں تھیں۔ وہ ڈیم پر گئے تھے۔ جس کے قریب ہی چڑیا گھر تھا۔

سب چڑیا گھر کے جانوروں کو فورِ شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ اچانک ایک گینڈا انجانے کدھر سے جھومتا ہوا آیا اور لڑکیوں کے غول کی طرف بڑھا۔ پھر کیا تھا سب ہی نے دوڑ لگا دی۔

فضا میں چیخ و پکار تھی۔ اور بھاگتی دوڑتی لڑکیاں، انجانے گینڈے کو کیا مستی چڑھی تھی۔

جدھر لڑکیاں جاتی تھیں وہ بھی ادھر ہی جاتا تھا۔ اب لڑکیوں کو جان کے لالے پڑ گئے تھے ٹیچرز درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھی کولڈ ڈرنکس محظوظ ہو رہی تھیں، یہ ہولناک منظر دیکھا تو وہ بھی حواس باختہ ہو گئیں اور مدد کے لئے ادھر اُدھر پکارنے لگیں۔

چڑیا گھر کے ناظمین ان کی مدد کے لئے آگئے۔

وہ بھی بہت دیر سے یہ تماشا لطف لے کر دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب اس نے صورتحال کو سنگین دیکھا تو فوراً پہنچ گیا۔

سب لڑکیاں اونچے سے ٹیلے پر چڑھ گئی تھیں۔ ربیعہ بھی چڑھنا چاہتی تھی، لیکن اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ نیچے ہی رہ گئی۔ قریب تھا کہ وہ گینڈے کو اپنے نزدیک دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی۔ لوگوں نے گینڈے کو اپنی طرف موڑ لیا۔ وہ کھڑی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"گھبرائیے نہیں۔ اب آپ محفوظ ہیں۔" اپنے قریب اتنے نزدیک غیر مرد کو دیکھ کر وہ ڈر گئی۔

"نیلی پینٹ اور سرمئی شرٹ میں ملبوس گلے میں کیمرہ ڈالے، ایک اسمارٹ سا لڑکا" کے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے جلدی سے اپنا دوپٹہ تلاش کیا۔ جو شانوں پر ہی جھول رہا تھا۔ گینڈے کے جانے کے بعد سب لڑکیاں اس کے قریب آگئیں۔

"ربیعہ! تم ٹھیک تو ہو؟" جویریہ بے چین ہو کر اس کی طرف بڑھی۔ وہ اجنبی غائب ہو چکا تھا۔

"ہاؤ سویٹ یار! کیا زبردست فلمی سچویشن ہوئی ہے۔"

"ایمان سے ربیعہ کیا اسمارٹ لڑکا تھا۔ تم نے تو اسے لفٹ ہی نہیں کرائی۔" ایک اور کا فیلو لطف لے کر کہہ رہی تھی۔

معاً اساتذہ کے قریب آنے سے سب ہی سنجیدہ ہو گئیں۔

واپسی کے سفر میں ربیعہ کی ٹانگیں اب بھی اس دہشت ناک واقعہ کو یاد کر کے کانپ

تھیں۔ لیکن اس کے علاوہ سب ہی انجوائے کر رہی تھیں۔

گھر پہنچی تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے، اماں نماز کی تیاری کر رہی تھیں۔ آپا سو رہی تھیں تھکن سے اس کا برا حال تھا۔ کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا ظاہر ہے جو کچھ بتا کر گئی تھی، سب اس سے مطمئن تھے۔ وہ تھوڑی دیر ستانے کی غرض سے لیٹ گئی پھر نہانے چلی گئی۔ ابھی تک اس کے سر پر وہ دہشت ناک واقعہ سوار تھا اور وہ اجنبی کون تھا۔ جو اس سے اتنی ہمدردی کر رہا تھا۔ ان ہی سوچوں میں اس کی عصر کی نماز بھی قضا ہو گئی مگر آج اسے پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

اسے حیرت کا زبردست جھٹکا لگا تھا۔ جب اگلے ہی روز پکنک کی تصاویر جویریہ لے کر آئی تھی۔ کیا زبردست فوٹو گرافی تھی۔

ہراساں بھاگتی ہوئی لڑکیاں اور تعاقب کرتا گینڈا۔ سب بے حد ایکسائیٹڈ ہو رہی تھیں۔

ایک تصویر میں صرف ربیعہ تھی اور بہت ہی قریب وہ گینڈا۔ ربیعہ نے دل تھام لیا۔

اف اللہ۔ یہ تصویر اگر اس کے گھر والوں نے دیکھ لی۔ تو کیا ہوگا۔

"تم تو کیمرہ نہیں لائی تھیں۔ پھر یہ سب کیسے؟"

"یہ اسی اجنبی کا کمال ہے۔ جو تمہاری جان بچانے آیا تھا۔"

جویریہ نے ہنس کر کہا۔ ربیعہ مزید سراپا حیرت بن گئی۔

"وہ میرا کزن ہے فوٹو گرافی اس کا پہلا شوق ہے۔ باقی زندگی کی سب رنگینیاں اس کے مزاج کا حصہ ہیں۔ اتفاق سمجھ لو یا کچھ بھی وہ کل وہاں موجود تھا، یہ تصویریں مجھے دکھانے کے لئے لایا تھا۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ اسے یہ تصویر بہت ہی پسند آئی ہے۔" جویریہ راز داری سے اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ تو ربیعہ خود بخود مغرور ہو گئی۔

"ہٹو پرے۔ تمہارا کزن بہت ہی بدتمیز ہے۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی تھی۔

☆☆☆

سب گھر والے تقریباً سو چکے تھے۔ شہزاد نے وقت دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پہ سونے چلے گئے ہوں گے، وہ زرین کی پسندیدہ چیز جو اس نے آج مس کی تھی۔ مرغ روسٹ، پیک کرا کے گھر کی طرف چل دیا۔ اماں، آپا اور چھوٹے بہن بھائی پر سونے چلے گئے ہوں گے حماد بھائی ابھی گھر آئے نہیں ہوں گے۔ عباد بھائی اپنے کمرے جانے کے بعد صبح تک باہر نہیں نکلتے، یعنی راستہ صاف ہی تھا۔

اب وہ مرغ روسٹ باآسانی اپنے کمرے میں لے جا سکتا تھا۔

اس نے گھنٹی بجائی۔ زرین انتظار کر رہی تھی۔ اس کا کمرہ قریب ہی تھا وہ دروازہ کھولنا چاہتی تھی کہ اس سے پہلے صدف نے دروازہ کھول دیا۔ صدف کو اچانک گھر میں موجود پا کر شہزاد گڑبڑا سا گیا۔

"تم کب آئیں؟" کھانے کی اشیاء کا شاپر بیک اسکے ہاتھ میں من و من کا ہو گیا۔

صدف نے بھی اچانک ہی دروازہ کھولا تھا۔ وہ اپنے بچے کو باتھ روم میں لے کر آئی تھی۔

"ہم شام کو ہی آئے تھے۔" وہ رکھائی سے کہتے ہوئے باتھ روم میں چلی گئی۔ شہزاد اپنے کمرے میں ایسے گھسا جیسے بندوق سے گولی نکلی ہو۔

"یہ کیوں آئی تھی دروازہ کھولنے۔ تمہیں گھنٹی کی آواز نہیں آئی تھی؟" وہ زرین پہ ناراض ہوا۔

"بس جاسوسی کرنے کی عادت ہے۔ صباحت بھابھی نے ان کا نام موکل صحیح رکھا ہوا ہے۔" زرین جل کر بولی۔

"اچھا۔ زیادہ بکواس نہیں کرو۔ روسٹ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ برتن نکالو۔ اور فائنل کو بھی جگاؤ۔ کافی زیادہ ہے۔"

"اٹھ گیا تو چار گھنٹے تک روئے گا۔ گھر والے پوچھنے آ جائیں گے کہ کیوں رو رہا ہے۔" زرین نے کہا تو شہزاد چپ ہو گیا۔

آج کی صبح بڑی دلچسپ تھی۔ ساری رات صدف کے نخلتوں میں مرغ روسٹ کی خوشبو مہکتی رہی تھی۔ اب وہ سارے گھر میں کیوں نہ پھیلتی۔

اماں کا پارہ اور بڑی آپا کے تیور آسمان پہ پہنچے ہوئے تھے۔ اتفاق سے یا بدقسمتی سے آج زرین کی باری ناشتا بنانے کی تھی اب جو کچھ اس نے کھایا تھا۔ بڑی اماں اسے ایسے ہضم کرا رہی تھیں۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آج ناشتا وقت پہ نکل جائے۔"

"ارے یہ پراٹھے ہیں یا پاپڑ۔"

"گھی دیکھو۔ کتنا خرچ کر رہی ہو۔ باوا کی مل لگی ہوئی ہے۔"

شہزاد اماں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"اماں! میرے تو پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ صرف چائے بنوا دیں۔"

"ارے بچے رات بے رات کھانا کھاؤ گے تو پیٹ میں درد ہو گا ہی۔"

شہزاد سمجھ گیا کہ رپورٹ پہنچ چکی ہے۔ سنبھل کر بولا۔

"میرے منہ کا ذائقہ خراب ہو رہا تھا، اس لیے بازار سے کھانا لے آیا تھا، سب لوگ چکھ چکے تھے اس لیے..... بھیجنا مناسب نہ سمجھا۔"

"ارے بیٹا! ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے۔ جس کے دال کھانے سے پیٹ میں درد ہو

وہی مرغ مسلم کھائیں گی۔"

"اف اللہ اماں تو پیٹ سے نکلوا کر ہی دم لیں گی۔"

ربیعہ تیار ہوتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ اسے گھر والوں کا یہ رویہ پسند نہیں تھا۔ "صدف تو پیسے لوگوں میں بیاہی ہے کہ بالکل ہی پھاپھا کٹنی بن کر رہ گئی ہے۔ کیا ضرورت تھی اسے یہ چغل خوری کرنے کی۔"

آج سارا دن زرین کی کمبختی رہی۔ صبح کے ناشتے کی طرح دوپہر کے کھانے میں بھی لیڑے نکلے۔

شام تک زرین طعنوں سے ادھ موئی ہو چکی تھی۔ اب اماں کے پاس دو ہمسائیاں بیٹھی تھیں۔ اماں بہوؤں کے جہیز پر خیال آرائی فرما رہی تھیں۔ یہ ٹاپک اماں کا بے حد پسندیدہ تھا۔ جس کی طرف سے ناراضگی ہوتی۔ اس کے جہیز کی برائیاں کرنے بیٹھ جاتیں۔

"بڑی کے تو بھائی اور باپ اتنے ماڈرن تھے کہ چند ضروری چیزیں دے کر فارغ ہو گئے۔ بعد میں بیٹی کو پوچھنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ البتہ منجھلی اچھا خاصا جہیز لائی تھی۔ بھلے سے کوئی دیتا ہے تو اپنی بیٹی کو دیتا ہے ہم تھوڑا ہی استعمال کر رہے ہیں اور چھوٹی صاحبہ کیا لائیں۔ خاک نہ دھول نہ نیلر لائیں ڈھنگ کا اور نہ ہی شعور اور پھر بھی راج کر رہی ہے، خاک پڑ گئی تھی ہماری آنکھوں میں ذہم اس بنو کو لے آئے تھے۔"

کھلم کھلا اتنی بے عزتی۔ زرین کی آنکھوں میں پانی آ گیا، معاً زرین کی چھوٹی بہن مبرین گھر میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم آنٹی!" وہ اماں کے پاس تخت پہ بیٹھ گئی اور باسکٹ ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

"یہ امی نے بھیجا ہے آپ لوگوں کے لئے۔ آپا اور بچے کہاں ہیں؟"

"زرین! زرین! امبرین آئی ہے کہاں ہو۔"

آپا جان نے آوازیں دیں۔ زرین اپنا حلیہ درست کرنے لگی کہ بہن پر کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"نجانے ہر کام میں اتنی سستی کیوں کرتی ہے۔" آپا کہے بنا نہ رہیں۔ امبرین کو عجیب لگا۔

"ٹھیک سے ہو کر بیٹھ جاؤ۔ بنی۔"

"نہیں بس۔ بھائی باہر کھڑا ہوا ہے۔ میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتی۔" امبرین نے شگفتگی سے

کہا اور بہن کا انتظار کرنے لگی۔

اچانک ہی عارش گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی اس کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

کاسنی رنگ کے پرنٹڈ سوٹ میں وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے فوراً ہی راستہ بدل لیا اور اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

☆☆☆

حسن اور احسن نے بری طرح رما کو کھایا ہوا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ماں کے چنگل نکل کر چاچوؤں کے پاس جانا چاہتے تھے جبکہ وہ انہیں صاف ستھرے کپڑے پہنانے کی جستجو میں ہوئی تھی۔

عباد کمرے میں داخل ہوئے تو کمرے کا حلیہ تپٹ تھا۔ ساتھ رما کی حالت بھی کچھ قابل دید نہ تھی۔ عباد کی نفیس طبیعت کو گندگی اور بے ترتیبی سے سخت چڑ تھی لیکن قدرت کی ستم ظریفی یہ تھی جب سے وہ بیک وقت دو بچوں کی ماں بنی تھی، سراپا الجھن بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن اس کی طبیعت کی شوخی اور خوش گفتاری کم نہیں ہوئی تھی۔

بچے تیار ہو کر کمرے سے بھاگ گئے۔ وہ بڑی اماں کی نقل اتارتے ہوئے کمرہ سنبھالنے لگی۔

"کمرے کو چڑیا گھر بنا رکھا ہوا ہے، نجانے کیسے بچے ہیں۔ باپ سوتا ہے تو بستر میں سلوٹ تک نہیں آتی۔ کبھی کپڑوں پہ میل نہیں دیکھی۔ کبھی جوتوں پہ کیچڑ نہیں لگی۔ بیٹے ایسا پیدا ہوئے ہیں کہ ہر چیز ملیا میٹ کر دی ہے۔"

"بمعہ ماں کے....." عباد نے مسکراتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ تو رما چونک گئی۔

"آپ کب آئے؟" رمانے ہنس کر بریف کیس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"کبھی آپ نے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ہم تو ہمیشہ ہی آپ کے پاس رہتے ہیں۔"

"خیر تو ہے، آج موڈ بڑا خوشگوار ہو رہا ہے۔ کیا کوئی نئی سیکریٹری پھنسا رہے ہیں۔"

"ہم تو ایک ہی میں ایسے پھنسے ہیں کہ نکلنے کو جی نہیں کرتا اوروں کی طرف کیا دیکھیں۔"

ان کی وارفتگی پہ رما مغرور سی ہو کر ہنس پڑی۔

"دراصل آج بہت دنوں کے بعد کمپنی کو غیر ملکی کنٹریکٹ ملا ہے۔"

"جی ہاں۔ خوشی کی وجہ کوئی کاروباری ہی ہو سکتی تھی۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی تو عباد۔ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور قریب بٹھاتے ہوئے بولے۔

"سب کچھ تمہارے اور بچوں کے لئے تو کر رہا ہوں۔ ایک اچھے مستقبل کے لئے محنت کرنا پڑتی ہے ناں۔"

رما مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

"آج کا دن کیسا گزرا؟" وہ اپنے جوتے اتارتے ہوئے بولے۔

"بس۔ سو..... سو" پھر کسی خیال کے تحت بولی۔

"آج کل گھریلو حالات کچھ اچھے نہیں جا رہے۔"

"چھوڑو۔ جب تک انسان خود نہ چاہے تو اچھا ہو بھی نہیں سکتا۔ تم اچھی ہو۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"مجھے آپ سے بس یہی اختلاف ہے، آپ ہر معاملے سے لاتعلق رہتے ہیں۔" وہ کچھ خفا سی ہو کر بولی۔

"ہر معاملے سے تعلق رکھنا اتنا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ جن سے میرا تعلق ہے۔ مجھے ان کے سب معاملات کی خبر ہے۔"

"کیا خبر ہے آپ کو۔ گھر دن بدن ٹینشن کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس ماحول سے گھٹن ہونے لگتی ہے۔ میں آج تک صباحت کو نہیں سمجھ سکی۔ زرین ہر وقت اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتی ہے۔ اماں ہر وقت ہر کسی سے نالاں و شاکی رہتی ہیں۔ جس کی وجہ سے سب ڈپریشن کا شاکار ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ مسئلہ کیا ہے۔ سب ہنسی خوشی کیوں نہیں رہتے۔"

"اس لیے کہ سب کے دل ہماری مسز کی طرح صاف اور دماغ فارغ نہیں ہے۔"

پھر سادگی سے بولے۔ "سب نظریات کا اختلاف ہے۔ جہاں ایک جگہ بہت سارے لوگ ہوں اور سب کے اپنے اپنے نظریات ہوں، وہاں کسی ایک شخص کا ان پر حکومت کرنا بغاوت کو جنم دیتا ہے۔ بغاوت شیرازہ بکھیرتی ہے بناتی نہیں۔ صباحت کو اول دن سے اماں نے قبول نہیں کیا۔ صباحت کی جنگ اماں سے ہے۔ اس نے زرین کو اپنا آلہ کار بنایا ہوا ہے۔ ایک دن دیکھ لینا، وہ زرین کو اماں کے مقابل لا کھڑا کرے گی اور خود تسی ساوتری بن جائے گی۔ رہ گئیں اماں..... تم اماں کا مسئلہ نہیں سمجھ سکتیں اور نہ ہی آپا جان کا۔

"یہ وہ دو عورتیں ہیں جنہوں نے نامردوں کے زندگی گزاری ہے۔ اب وہ ہمارے بارے میں کس قدر حساس ہوں گی۔ اندازہ کر کے دیکھو۔ ہماری ذرا سی غفلت انہیں دکھ پہنچاتی ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہم پہ حق جتلاتی ہیں۔ ہماری بے رخی انہیں دکھ پہنچاتی ہے تو وہ ہمارے بیوی بچوں پہ کسر نکالتی ہیں۔ شاید وہ زیادتی بھی کر جاتی ہوں..... لیکن یہ بھی تو دیکھو۔ انہوں نے ساری زندگی ہمارے لیے وقف کر چھوڑی ہے۔ آج اماں کے اپنے بیٹے ہوتے۔ تو ان کی زندگی کا رخ کچھ اور ہی ہوتا۔

آپا کے سر پہ ابو کا سہارا ہوتا تو ان کے خیالات بھی تبدیل ہوتے۔ اسے صرف قسمت کی

ستم ظریفی کہہ سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔

''صدف اور ربیعہ کے ساتھ قسمت نے کیا کیا ہے۔ جو وہ مجھ سے اتنا خار کھاتی ہیں۔''

''صدف کو اچھی سسرال اور کماؤ شوہر نہیں ملا۔ وہ اس احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ ربیعہ بچپن سے مجھ سے اٹیچ تھی۔ شادی کے بعد میں صرف تمہارا ہو کر رہ گیا۔ وہ اس لیے تم سے حسد فیل کرتی ہے۔''

رما خاموشی سے عباد کو دیکھتی رہی۔

بظاہر کتنے سنجیدہ اور لاپروا لگتے ہیں لیکن تجزیہ کس قدر گہرائی سے کیا تھا کہ وہ لاجواب ہو کر رہ گئی۔

''بہرحال بقول تمہارے۔ عارش، ثاقب اور سنی ہر قسم کے تعصب سے پاک ہیں۔''

''سو تو ہے۔'' وہ جھٹ بولی۔

''تو بس ٹھیک ہے۔ جن سے نعمتی اور بنتی ہے ان کے ساتھ اچھا وقت گزارو۔''

رما نے سر ہلایا پھر اچانک خیال آیا تو فوراً بولی۔

''کل میں عارش کے ساتھ شاپنگ پہ گئی تھی۔ آپ کے پاس تو وقت نہیں ہوتا۔ بچوں کے لئے کچھ ضروری چیزیں لینی تھیں۔ مجھ سے تو عارش پیسے بھی نہیں لے رہا تھا۔ اسے پیسے دے دیجئے گا۔''

''آج کل پیسے تو فقیر بھی نہیں لیتے۔ عارش کیسے لے سکتا تھا۔ روپوں کی شاپنگ کی تھی۔ تو روپے ہی کیوں نہ دے۔''

عباد کی بات پہ رما بے ساختہ ہنس پڑی۔

☆☆☆

کئی روز سے ربیعہ عجیب سے احساس میں مبتلا تھی اور پلکوں پہ انجانا سا بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی بات تو ایسی تھی کہ سوچنے میں بہت اچھی لگتی تھی لیکن کسی کو بتانے کا تصور بہت ہی ہولناک تھا۔ جب اس میں اتنا شعور تھا کہ یہ بات غلط ہے۔ یہ راستہ غلط ہے تو وہ قدم پہ قدم کیوں اٹھاتی رہی۔ کیا اس نے اپنے آپ کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کی تھی بہت زیادہ۔ لیکن وہ تھا ہی اتنا اچھا کہ وہ خود کو روک نہ سکی اور پھر اس کی دنیا اس سے بھی کہیں زیادہ پُرکشش اور بے لگام تھی۔

پہلی بار پکنک پہ ملا تھا تو اجنبی تھا۔

دوسری بار اس کے ہنر کا کمال دیکھا تو معلوم ہوا، وہ جویریہ کا کزن ہے، نجانے جویریہ نے اس کے متعلق اسے کیا بتایا تھا۔

تیسری ملاقات خط کے ذریعے ہوئی۔ جس میں اس نے ربیعہ کے حسن کی بے حد

تعریف کی تھی۔

کیا وجہ تھی، اسے یہ تعریف بری کیوں نہیں لگی۔ بلکہ اچھی لگی۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی نام سہیلیوں اور کلاس فیلوز کی باتوں میں اکثر کزنز اور منگیتروں کے قصے ہوتے تھے اور وہ بدھو بنی سنتی رہتی بعض اوقات ایسا ہوتا کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی۔

اب ایک اجنبی اچانک زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ اس نے اس اجنبی کے لئے تمام راستے کھلے چھوڑ دیے تھے۔

ربیعہ نے کبھی خود سے کوئی قدم نہیں بڑھایا تھا۔ لیکن اس کے بڑھتے قدم بھی نہیں روکے تھے۔ نجانے اس کی باتوں میں، اس کے لفظوں میں کیسا سحر تھا کہ وہ کھوتی چلی گئی تھی۔ رات سوچ سوچ کر کٹتی تھی۔ کالج کا وقت اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔ لیکن مختصر اس سے بھی زیادہ اب وہ راتوں کو اس کے لیے جاگتی تھی اور پہروں اس کے بارے میں سوچتی۔ اسے سوچنا بھی اچھا لگتا تھا اور اس کے لیے جاگنا بھی۔ اب وہ اپنی سہیلیوں میں خود کو برتر سمجھنے لگی تھی۔ اس کی چاہت کے انداز نے ربیعہ کے اندر غرور بھر دیا تھا۔

لیکن کیا وجہ تھی کہ وہ اب تک زمانہ شناس اماں اور جہاندیدہ آپا کی نظروں سے بچی ہوئی تھی۔ وہ آگ کا کھیل کھیل رہی تھی اور کسی کو بھی اس آگ کی تپش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس میں ربیعہ کا کمال نہیں تھا۔ صباحت کا کمال تھا۔ وہ جس مہرے کو آگے لانا چاہتی تھی، بڑی مہارت سے لے کر آتی تھی، اب اس کی منزل قریب تھی۔ اس نے گھر کے سرپرستوں کو اپنی لڑائی میں الجھا رکھا تھا۔

دشمن جب کسی ملک کو پسپا کرنا چاہتا ہے۔ اندرون ملک خانہ جنگی کرا دیتا ہے، اس وقت بھی یہی صورتحال تھی۔ گھر کے اندرون رات کے جھگڑے تھے۔ گھر سے باہر کیا ہو رہا تھا۔ اس سے سب لاعلم تھے۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا اور موسم بہت ہی خوشگوار ہو رہا تھا۔ اچانک دھوپ کی شدت میں بہت کمی آ گئی تھی۔ آسمان پہ سرمئی بدلیاں اور تیز چلتی ہوئی ہوائیں مزاج کو بہت ہی بھلی لگ رہی تھیں۔ عارش، ثاقب، سنی اور ربیعہ بمعہ تمام بچوں کے پچھلے صحن میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ ابرار الحق کے گانے ڈیک پہ فل والیوم میں چل رہے تھے۔ بڑی اماں حسب معمول اپنے آبائی تخت پہ بیٹھی چھالیہ کے ساتھ ساتھ مزاجوں کی بھی کانٹ چھانٹ کر رہی تھیں۔ آج مشقِ ستم صباحت تھی۔

''ہمارے خاندان میں کسی عورت نے اپنے مرد کے ساتھ اتنی زور آوری نہیں کی جتنی یہ عورت کر رہی ہے۔ پھر کیا حاصل کر لے گی، ذلت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔''

""جس کے پاس جو ہوگا، وہ وہی دے گا۔" صباحت سویرا کو ہوم ورک کرا رہی تھی، جھٹ بولی۔ اماں کے تو آگ لگ گئی۔

""اسی زبان درازی کا نتیجہ ہے کہ مرد کے دل سے اتر رہی ہے۔"

""سمجھ میں نہیں آتا، میں اپنے مرد کے دل پہ چڑھوں یا اتروں۔ کوئی میری فکر میں دبلا کیوں ہوتا ہے۔" دوسرا جواب حاضر تھا۔

""کیوں منہ لگتی ہیں اماں! کیا جیت سکیں گی اس سے۔ اس نے تو جھگڑے کو دال روٹی بنا لیا ہے۔ جانے کیا چاہتی ہے آخر ہم کب تک لڑیں گے۔" بڑی آپا کروشیا چلاتے ہوئے بولیں۔

اماں خون کے سے گھونٹ پی کر چپ ہوگئیں۔ زرین بیٹھی اپنی بیٹی کی فراک سی رہی تھی۔ دل ہی دل میں خوش ہوتی۔

""تمہاری طبیعت تو یہی صاف کرتی ہے۔ مجھے تو تم نے پیس کر رکھا ہوا ہے۔"

رما شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ آج اماں نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے حیرت ہے جو وہ خاموش ہوگئیں۔ ورنہ دونوں کو دو بدو ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی تھی۔ دونوں خاموش تو ہوگئی تھیں لیکن ماحول میں تناؤ پیدا ہوگیا تھا، رما کا دل چاہتا تھا ایسے وقت میں غائب ہو جایا کرے۔

""آیئے رما بھابی! ایک گیم لگاتے ہیں۔"

عارش دوڑا ہوا آیا اس کے ہاتھ میں بیڈمنٹن تھا اور وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ عارش کی آمد اسے غنیمت لگی۔ دوسرے ہی پل وہ دال چاول رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ کھانا پکانے میں ابھی دیر تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ پچھلے صحن میں آ گئی۔

""تمہیں بھی میں ہی نظر آتی ہوں۔ صباحت بھابی یا زرین کو آفر نہیں کر سکتے تھے۔"

""آپ کو معلوم تو ہے۔ صباحت بھابی کے موڈ کا۔ کبھی دوست مزاج ہیں اور کبھی دشمن مزاج۔ زرین بھابی ایسے مشاغل سے فارغ ہیں رہ جاتی ہیں آپ۔ آپ کو بھی نخرے آتے جا رہے ہیں۔"

""ارے نہیں۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" اس نے شٹل کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

ربیعہ شاید بہت زیادہ کھیل چکی تھی۔ اس لیے تھکی ہوئی بیٹھی پسینہ خشک کر رہی تھی۔ انہوں نے گیم شروع کر دیا۔ وہ تھوڑا ہی کھیلی تھی کہ اس کا سانس پھول گیا۔

""بھئی عارش! مجھ سے تو اب کھیلا نہیں جاتا۔ میں تو بہت موٹی ہو چکی ہوں۔ تم ربیعہ کے ساتھ کھیلو۔"

""اتنی اچھی ہماری بھابی اور اتنی جلدی ہار گئیں۔" ثاقب اور سنی نے بیک وقت کہا۔

ربیعہ کو اس کی اتنی پذیرائی پسند نہیں آئی وہ اٹھ کر دور جا بیٹھی۔ رما تھوڑی دیر ہی کھیل سکی۔ پھر اپنے کھانے کا بہانا کر کے کچن میں آ گئی۔

""آج کل ربیعہ بہت بدلی ہوئی نظر آ رہی ہے۔" وہ کچن میں کھانا پکاتے ہوئے سوچ رہی۔ ربیعہ چائے بنانے آئی تو رما نے کن اکھیوں سے اس کی تنگ اور ہاف بازوؤں کی قمیص کو دیکھا، کا دوپٹہ اوڑھے وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔

""حیرت ہے۔ بڑی اماں محترمہ کے رنگ ڈھنگ نہیں دیکھ رہیں۔"

""ربیعہ! یہ سوٹ تمہارا کس نے سیا تھا؟"

""صباحت بھابی نے۔ کیوں اچھا نہیں سلا؟"

""نہیں، بہت اچھا سلا ہے۔ لیکن قمیص ذرا زیادہ ہی تنگ نہیں ہے۔"

""آج کل فیشن ہے بھابی۔" رما ہنس پڑی۔ اسے فیشن کا بتا رہی تھی۔ جس کے لباس کی نقل کرتے تھے اور سراہتے تھے تنگ ماحول کی لڑکیوں کا ہی تو ایسا ہوتا ہے۔ یہ فیشن کو بنا سوچے اپنا لیتی ہیں۔

""فیشن تو ہے لیکن اپنا ماحول بھی تو دیکھنا پڑتا ہے ناں۔" رما کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ ایسا کہ اسے ی نہ لگے اور وہ بات بھی سمجھ لے۔

""دیکھو۔ گھر میں چھوٹے بڑے بھائی ہیں۔ پھر آدھی آستینوں کی قمیص سے تو نماز بھی نہیں۔ تم سمجھ رہی ہو ناں۔"

رما کا خیال تھا کہ وہ شرمندہ ہو جائے گی اور بات سمجھ لے گی لیکن اس کی پیشانی پر بل آ ٹھہر گئے۔

رما خوف زدہ ہوگئی۔ اللہ رحم کرے کہیں بات کا بتنگڑ بن جائے۔ عباد ٹھیک کہتے ہیں، اپنے سے غرض رکھنی چاہیے۔ دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ مگر فطرت کے ہاتھوں ، کیا کرتی۔

""تمہیں میری بات بری تو نہیں لگی؟"

""ایک بات کہوں بھابی؟" اس نے سوال کے جواب میں سوال کر دیا۔ اس کا انداز تو کیلا ۔ما متوجہ ہوگئی۔

""شریعت نے تو دیوروں سے پردہ رکھا ہی ہے لیکن انسان کو اپنا ماحول بھی نہیں بھولنا ۔ دیور آپ سے چھوٹے سہی لیکن جوان تو ہیں۔ ان کے ساتھ اچھل اچھل کر کھیلنا۔ کیا ہمارا اور مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے؟"

رما بھک سے اڑ گئی۔ البتہ ربیعہ کہہ کر رکی نہیں اور چائے کا کپ لے کر باہر چلی گئی۔

☆☆☆

آج پھر صباحت نے جنگ کا طبل بجا دیا تھا۔ قصہ کچھ یوں تھا۔ حماد کے کچھ سیاسی قسم کے مہمانوں نے آنا تھا بمعہ بیگمات کے۔ حماد صباحت کو کہہ گئے تھے کہ وہ ڈھنگ کے کپڑے پہن کر ہلکا پھلکا زیور اور میک اپ سے آراستہ ہو جائے۔

لیکن صباحت کو تو ایسے موقعوں پر حماد سے بدلہ لے کر لطف آتا تھا۔

(جب مجھ پر لوگوں سے ملنے کی پابندی ہے تو پھر میں کیوں آپ کے لوگوں سے ملوں) وہ گھر میں عام سے انداز میں پھرتی رہی۔

آخر کار بڑی آپا نے ٹوک ہی دیا۔ ”صباحت! تم نے کپڑے کیوں نہیں پہنے۔“

”کیوں بڑی آپا! میں کیا ننگی پھر رہی ہوں۔“ وہ لطف لے کر بولی۔

”بی بی۔ یہ سوال و جواب اپنے میاں سے کرنا جا کر ڈھنگ کے کپڑے پہن لو..... اور بلکہ وہ والے پہن لو جو ابھی حماد لے کر آیا تھا۔ مہمان آتے ہی ہوں گے۔“

”مجھے کسی مہمان سے نہیں ملنا۔ میرے تو ویسے بھی سر میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”اے لو اور سنو۔ ادھر میاں کے مہمان گھر میں آئے نہیں۔ ادھر بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہوا نہیں۔“ بڑی اماں جل کر بولیں۔ ”اے بی بی! اپنے مہمانوں کو خود نمٹانا۔“

اتنے میں صدف وہی نیٹ کی قمیص اور دوپٹہ پلین شلوار کے ساتھ پہنے نمودار ہو گئی جو حماد لاہور سے لے کر آئے تھے۔

صباحت کے تو دیکھ کر آگ ہی لگ گئی۔ اب تو اس نے کسر نکالنا تھی، جل کر بولی ”کیوں میں نے بلایا ہے ان مہمانوں کو؟ سنبھالنا تم خود ہی۔ کمائی بھی تو اسی بیٹے کی کھاتی ہو۔“

بڑی اماں اور آپا تو بھسم ہو کر رہ گئیں۔ ”ہم کیوں کھانے لگے اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ عیش تو تو کر رہی ہے اس شوہر کی کمائی پہ۔ جس کی عزت کو تو نے خاک میں ملایا ہوا ہے۔“

”ضرورت کے لئے چار پیسے دے دیتا ہے۔ اسے عیش کہتے ہیں۔“ وہ سکون سے بولی۔ انداز جلانے والا تھا۔

”اے۔ ہے۔ ہمارا تو بچہ بھولا سیدھا تھا۔ نہ جانے چڑیل نے کیا جادو کیا۔ بچے کی سوجھ بوجھ ہی کھو گئی۔ پرائی عورت کو دیکھنا تک نہ تھا۔ نجانے بچے کو کیسے حربوں سے پھنسا لیا۔ ہم بھی بھگت رہے ہیں۔ خود بھی بھگت رہا ہے۔“

اماں اور آپا آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ ان کا اینڈ یہی ہوتا تھا تاکہ سب ان ہی کو مظلوم سمجھیں، صباحت ہنس رہی تھی۔

”آہ۔ ہا۔ بڑھیا۔ دیکھنا چاند چڑھے گا تو دنیا دیکھے گی۔ فرشتہ اوصاف کو.....“

وہ کسی خیال کے تحت مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

ربیعہ گھر میں داخل ہوئی تو گھر میں غیر معمولی سناٹا تھا۔ وہ آج معمول سے زیادہ دیر سے آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی پوچھے گا تو وہ بتا دے گی، راستے میں بس خراب ہو گئی تھی، اس لیے دیر ہو گئی۔ لیکن کسی نے نہیں پوچھا۔ اماں علیحدہ سر لپیٹے پڑی تھیں اور آپا علیحدہ۔

وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور دھم سے بستر پہ لیٹ گئی آنکھیں بند کیں تو وہ چھم سے آنکھوں میں آ گیا۔ کیا تھا اس میں جو وہ کھنچی جا رہی تھی۔

اس نے زیر لب اس کا نام دہرایا۔ مہتاب خان۔ کتنا پُر وقار نام تھا۔ اس کی شخصیت کی طرح۔

آج اس نے ایک اور سرحد پھلانگی تھی۔ اس کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھانے چلی گئی تھی۔ یہ ان کی پہلی باضابطہ ملاقات تھی۔

فورتھ پریڈ کے بعد گیٹ کھل جاتا تھا اور آٹھویں پریڈ تک کالج لگا رہتا تھا۔ اس کا آخری پریڈ آٹھواں ہوتا تھا۔ وہ چوتھے پریڈ میں باہر چلی گئی تھی اور آٹھویں پریڈ میں واپس اندر آ گئی تھی اور پھر اپنے پوائنٹ سے گھر.....

وہ گیٹ پہ ہی کھڑا تھا۔ سراپا اضطر..... اس نے کالج کے گیٹ سے قدم نکالتے ہوئے سوچا تھا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ اس کے چھ بھائی تھے۔ چھ میں سے کوئی بھی۔

ہوٹل کی دنیا بڑی دلفریب تھی۔ ہلکا ہلکا اندھیرا اور روشنی۔ ایک سے دوسری ٹیبل کا پتا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے دل کو تقویت ہوئی۔ پھر اسے یہ بھی اطمینان تھا۔ تین بڑے تو اپنے کام پہ ہوتے ہیں عارش بھی پرائیویٹ فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ ثاقب کالج میں اور سنی اسکول..... یہ تو خاصا محفوظ تھا۔ آج مہتاب خان نے اس سے بہت ساری باتیں کی تھیں بہت سے انکشافات ہوئے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اسے عرصے سے جانتا تھا۔ وہ روز اسے بس سے اترتے چڑھتے دیکھتا تھا۔

”بہت ساری بے پردہ لڑکیوں میں چہرے کو کالی چادر سے ڈھانپے تمہاری سرمی آنکھیں مجھے اپنی جانب کھینچتی تھیں۔ میں روز ان آنکھوں کا دیدار کرنے آتا تھا۔ لیکن یہ آنکھیں مجھے دیکھتی نہ تھیں۔ میں نے کئی بار جو یہ کو تمہارے ساتھ دیکھا تھا لیکن تمہارے متعلق نہیں پوچھا۔

ایک دن میں فیصل کے گھر گیا تو جو یہ فون پہ اپنی کسی سہیلی سے پکنک پر جانے کی باتیں

کر رہی تھی، میں نے وہ باتیں سن لیں، مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ پکنک پر کہاں جانا ہے۔ میں وہاں بہت دیر تک تمہیں تلاش کرتا رہا لیکن دور سے مجھے سب لڑکیاں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ میں تمہیں قریب سے دیکھنا چاہتا تھا اور یہ ناممکن تھا میں نے فوٹو گرافی کے بہانے ایک پنجرہ کھول دیا۔ گینڈا تم لوگوں کے پیچھے پڑ گیا۔ جہاں بہت سارے لوگ تمہاری مدد کو پہنچے۔ وہاں میں بھی پہنچ گیا۔ یہ آنکھیں میں ساری کائنات کی آنکھوں میں پہچان سکتا تھا۔"

مہتاب نے بڑے جذبہ سے کہا تو ربیعہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تم بہت خوف زدہ تھیں۔ تمہیں اس تکلیف کا سامنا میری وجہ سے کرنا پڑا۔ آئی ایم ویری سوری....."

ربیعہ نے سر جھکا لیا۔ وہ اس کی ساری باتوں پر ایمان لے آئی تھی۔ اسے معذرت کرتے دیکھ کر ربیعہ کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔

"ہمیں ملنا تھا۔ اس ملاقات کو اتفاقیہ بنانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو قدرت نے کرنا ہی تھا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"ہاں شاید۔" مہتاب خان نے اتفاق کیا۔ وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا اور ربیعہ اس دنیا سے نابلد۔ اسے سب کچھ انوکھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔

ہوٹل کی دنیا کتنی دلفریب تھی اور پھر اس کی باتیں۔ ربیعہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اس کے گھر میں کیا تھا۔

روزمرہ کے کاموں پہ جھگڑا۔

کھانے پینے پہ جھگڑا۔

اصول و روایات پہ جھگڑا۔ ہر چیز اصولوں کے تحت تھی۔

بصورت دیگر بڑی اماں اور آپا کے لیکچر۔

پھر ایک گھر سے دوسرے گھر میں چلے جانا تھا۔ وہاں بھی ان ہی مسائل سے نمٹنا تھا۔

جیسے صدف چلی گئی۔ یہ بھی کوئی زندگی تھی۔ اس کے اندر بغاوت انگڑائیاں لے رہی تھی۔

اس کی ذات میں تجسس تو پہلے ہی تھا اب یہ تجسس بغاوت بن رہا تھا۔ آخر ہر انسان کو اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا حق ہے۔ باقی تمام لوگ بھی تو اپنی پسند کی زندگی گزار رہے ہیں۔

☆☆☆

"ایک رشتہ لے کر آئی ہوں عارش میاں کے لئے، بہت ہی بھلے لوگ ہیں۔"

"بس بہن بس۔ ہم تو باز آئے بھلوں سے بھی اور بروں سے بھی۔ تین بیٹے بیاہ کر ناک

تک بھر پائے۔"

"اے لو..... تم تو ایسے باتیں کر رہی ہو۔ جیسے اب مزید بچے بیاہنے ہی نہیں۔" اماں کی بات پہ خالہ صغریٰ نے دانتوں پہ انگلی رکھی۔

عارش قریب ہی پلنگ کی ادوائن کس رہا تھا۔ جھٹ بولا۔

"دیکھ لیجئے خالہ صغریٰ! کسی کی سزا کسی کو مل رہی ہے۔ عارش کا کسی کو خیال نہیں آتا۔"

عباد قریب ہی بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پہ دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

داد حسب معمول ٹیلی فون سے چپک کے بیٹھے تھے۔ بقول اماں کے یا تو گھر میں نہیں ہوتا، گھر میں تا ہے تو فون کی خیر نہیں ہوتی۔

شہزاد کی بیوی میکے گئی ہوئی تھی۔ وہ اس غم میں دیر سے سو کر اٹھ رہا تھا۔ سنی کی طبیعت صحیح نہیں تھی۔ وہ اماں کے پاس لیٹا تھا۔ ثاقب جوتے پالش کر رہا تھا۔ شرارت سے بولا۔

"کوئی عارش کو سوچے گا تو ثاقب کو بھی سوچ ہی لے گا۔"

صغریٰ ہنسی۔

"انہوں نے اگر شادیاں کرنی ہیں تو اپنے اپنے گھر بنائیں۔ کاروبار جمائیں، بے شک یاں کر لیں اور کریں بھی اپنی پسند کی روز شہزاد میاں کی طرح شکایت کرنے نہ آئیں کہ تم بیاہ کر تھیں۔ یہ نہیں آتا' وہ نہیں آتا۔ میں کہاں جاؤں۔ اپنی پسند کی کرنا۔ تاکہ ہم بری الذمہ رہیں۔ ہم تو تھک گئے۔ اب ہم سے برداشت نہ ہو گا یہ جھگڑا....."

"بڑے بھیا نے تو اپنی پسند کی کی تھی۔ پھر اختلاف کس چیز کا؟ صباحت بھابھی کو قبول ں نہیں کیا آج تک۔" ربیعہ ناشتا کرتے ہوئے سوچ رہی تھی "یہی تو دوغلا پن ہے اس گھر کا۔"

"یہ بات آپ نے اوپر والوں کے بارے میں نہیں سوچی۔ اب کیا ہم چاروں کو اپنے ے میں خود سوچنا پڑے گا۔" عارش نے سوال کیا۔

"ربیعہ کا کر دیں گے۔ اللہ کرے کسی نیک بخت سے پالا پڑے۔"

"اور ہمارا بدبختوں سے۔" عارش ہنس دیا تھا۔

"تمہیں اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ پھانس تو رکھی ہے۔ جہاں کام کرتے ہو اس کی ۔" عباد نے بے پر کی چھوڑی۔

"اتنا سوفیصد صحیح اندازہ آپ کو کیسے ہوا؟" عارش نے حیرت کے پہاڑ توڑے۔

"ایک تو محبت کی شادی کو بھگت رہا ہے۔ اب تم بھی ایسی ہی کوئی چنڈال ہمارے سر پر کرو گے۔" بڑی اماں جل کر بولیں۔

"ابھی آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ اپنی پسند سے کر لیتا۔ تاکہ ہم شکایات سے بری الذمہ رہیں۔" عارش کون سا ادھار رکھتا تھا۔

"وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا" بڑی اماں کھسیانی سی ہوگئیں۔

"اولاد کے حقوق سے دستبردار ہونا ماں باپ کے لیے اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اولاد چاہے حقوق ادا کرے یا نہ کرے۔" آپا نے بات جڑی۔

"جب بھائیوں کو یہ اختیار حاصل ہے تو کیا میں لڑکی ہونے کی وجہ سے اپنے جذبات کا گلا گھونٹتی رہوں گی۔" ربیعہ نے سوچتے ہوئے چائے کا کپ رکھا۔

"صحیح بتاؤ۔ تم نے کوئی پسند کر رکھی ہے؟" بڑی اماں کا تو رنگ اڑ گیا۔ عارش نیچے منہ کر کے ہنسنے لگا۔

(اماں! اگر میں نے بتا دیا کہ مجھے زرین بھابھی کی چھوٹی بہن امبرین پسند ہے تو آپ مجھے اسی وقت کتوں کے آگے ڈلوا دیں گی اور کچھ بعید نہیں کہ پھر آپ ان کتوں کو گولی سے مار دیں۔ آپ کو زرین بھابھی سے اتنی نفرت ہے تو ان کے گھر والوں سے کیونکر محبت ہوگی۔

کہاں سے ایسا وکیل لاؤں۔ جو آپ جیسی جابر حکمران کے سامنے میری وکالت کرے اور کیس بھی جیت لے۔) وہ خیالات کے تانے بانے بن رہا تھا جبکہ بڑی اماں سمیت سب ہی اس کی بات کو مذاق سمجھتے ہوئے اپنی باتوں میں لگ گئے تھے۔

☆☆☆

"مختصر یہ کہ آپ نے مراۃ العروس" پڑھا تو ہوگا۔ ٹی وی پر دیکھا بھی ہوگا۔ اکبری کے بعد جب اصغری سسرال میں آتی ہے تو گھر کا نقشہ ہی بدل کر رہ جاتا ہے۔ ہر طرف سکون ہی سکون اور شانتی ہی شانتی۔ ضروری تو نہیں ایک بہن جیسی ہو، دوسری بھی ویسی ہی ہو۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ سمجھ دار ہے۔ ہنر سلیقہ میں بھی زرین بھابھی سے بہت آگے ہے اور حسن میں تو بہت ہی آگے۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ۔ یہ سلسلہ کب سے ہے؟" رما اس کی تقریر روزانہ سنتی تھی۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔ شاید وہ محبت کی عمر سے محبت کی شدت کا اندازہ کرنا چاہ رہی تھی۔

"جب آپ لوگوں کی شادی ہوئی تھی جب سے۔ شہزاد بھائی کی شادی میں بہت زیادہ مڈبھیڑ ہوئی تھی۔"

"صرف مڈبھیڑ...... یا کوئی مراسم بھی ہیں۔"

"نعوذ باللہ...... کوئی مراسم نہیں ہیں۔ صرف شادی میں ہی قریب آنے کا موقع ملا تھا اور جب سے اب تک نہ وہ دل سے نکلی اور نہ کسی اور کی طرف خیال گیا۔"

"میرا خیال ہے تمہیں اسے اپنے دل سے نکالنا ہوگا۔" رما نے بہت سوچ کر جواب دیا۔

"آخر کیوں؟" وہ زچ ہوگیا۔

"دنیا میں اور بھی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ شاید تم نے انہیں نہیں دیکھا اور پھر یہ اختیار بڑی اماں اور آپا کے پاس ہے۔ وہ یقیناً تمہارے لیے اچھا ہی سوچیں گی۔"

"مگر میں کسی کے لیے نہیں سوچ سکتا۔ مجھے صرف امبرین سے محبت ہے۔ میں اپنی بات نوا سکتا ہوں لیکن جو کام سیدھے راستے سے ہو جائے۔ اس میں جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ۔"

رما نے اچک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ معصومیت اور آنکھوں میں صداقت تھی۔ رہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

"تمہیں چاہیے کہ تم اپنا موقف زرین یا شہزاد سے بیان کرو۔" رما نے مناسب حل نکالا۔

"اور زرین بھابھی کی گھر میں پوزیشن اتنی مستحکم ہوتی تو شاید میں ان ہی سے بات کر لیتا۔"

"مجھ سے زیادہ تو صدف کی پوزیشن مستحکم ہے۔"

"صدف کو رہنے دیجیے۔ اس کی تو ذہنی سطح ہی عجیب و غریب ہوگئی ہے۔ وہ تو مجھے کہیں وائی جگہ پہ بیاہنا چاہتی ہے۔ جہاں اس کی اور اس کے شوہر کی بہت زیادہ آؤ بھگت ہو۔"

"تو پھر یہ کیسے ممکن ہے۔"

"اس ناممکن کو ہی تو ممکن بنانا ہے مجھے، معلوم ہے بھابھی......! میرے تینوں بھائیوں کی واجی زندگی میں سب سے زیادہ پرسکون اور خوشحال زندگی آپ کی اور عباد بھائی کی ہے۔ یقیناً یہ عورت بہت اعلیٰ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ مطابقت سے زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ عباد سے سب کچھ منوا سکتی ہیں۔ جب میرے دو حمایتی ہوں گے تو ممکن ہی نہیں کہ میرا مؤقف کمزور رہ ے۔" اس نے پر یقین لہجے میں کہا اور سنجیدگی سے کھڑا ہوگیا۔ وہ دو پل رکا اور چلا گیا۔

رما بہت ساری سوچوں میں الجھ گئی۔

☆☆☆

ادھر عارش نے الجھا رکھا تھا۔ ادھر ربیعہ کی سرگرمیاں عجیب و غریب صورت حال اختیار جا رہی تھیں۔ بھلا سخت گرمیوں کی دوپہر میں ایک لڑکی کا چھت پہ تنہا ٹہلنا۔ ٹیلی فون کو کمرے رکھ لینا اور گھنٹوں سہیلیوں سے باتیں کرنا۔

"آخر یہ سب کچھ بڑی اماں اور آپا کو نظر کیوں نہیں آتا یا میرا ہی دماغ خراب ہوگیا۔ دن کالج سے دیر سے آنا۔ آخر کیا ہے یہ سب کچھ؟"

رما بہت بے چین رہنے لگی تھی لیکن اسے کوئی ایسا سرا ہاتھ نہیں لگتا تھا۔ جس کی بنیاد پہ وہ

کچھ کر سکتی۔ کوئی پکی شہادت یا شک کو یقین میں بدل دینے والی کوئی غلطی۔

آج عجیب سا واقعہ ہوا۔

شام کا وقت تھا، اماں عصر کی نماز اور تسبیحات میں مصروف تھیں۔ بڑی آپا محلے میں کسی کے ہاں میلاد میں گئی ہوئی تھیں۔ ربیعہ صحن میں پانی ڈال رہی تھی۔ زرین اپنی امی کی طرف گئی ہوئی تھی صباحت اپنے کمرے میں تھی اور رما چائے بنا رہی تھی۔

اچانک ڈور بیل بجی، ربیعہ بے چینی سے بھاگی۔ جیسے اسے انتظار ہو۔ گھنٹی کی آواز پہ رما کچن سے باہر نکلی تھی۔

پوسٹ مین نے لفافہ اندر ڈال دیا۔ ربیعہ نے سائن کر کے لفافہ اٹھالیا۔

''دروازے پر کون ہے؟'' بڑی اماں نے آواز دے کر پوچھا۔

ربیعہ جلدی سے بولی۔ ''اماں! پوسٹ مین ہے۔ ڈیٹ شیٹ لے کر آیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ کمرے میں بھاگ گئی۔

رما چائے کا کپ لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

ربیعہ جلدی میں تھی، دروازہ بند نہ کر سکی۔ اسے لفافہ کھولنے کی جلدی تھی، جیسے ہی اس نے لفافہ چاک کر کے کارڈ کھولا۔

سرخ گلابوں کی پتیاں زمین پہ بکھر گئیں خوبصورت حرفوں سے مزین کارڈ۔ رما تحیر سے دیکھتی رہ گئی۔ اچانک ربیعہ مڑی تو رما کو پیچھے دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔

''میں تمہارے لیے چائے لائی تھی۔'' رما نے سکون سے کہا۔

ربیعہ کے چہرے کی بوکھلاہٹ کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔

رما نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے لیا اور ستائشی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ کارڈ پہ تحریر تھی، سادہ سے انداز میں اس کے جنم دن پہ وش کیا گیا تھا۔ لکھنے والے کے نام کی جگہ صرف M ہوا تھا، یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ یہ لڑکا تھا یا لڑکی۔

رما نے اسی سکون سے کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور ربیعہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ویسے تم نے اماں سے یہ کیوں کہا کہ ڈیٹ شیٹ آئی ہے؟''

ربیعہ پھنس تو گئی تھی لیکن اس کے تیور بگڑ گئے، کہنے لگی۔

''مجھے تو ڈیٹ شیٹ کا ہی انتظار تھا۔ اگر کارڈ نکل آیا تو اس میں تحقیق کرنے والی کون سی بات ہے۔ آج میرا جنم دن ہے میری کوئی بھی سہیلی مجھے وش کر سکتی ہے۔''

رما خاموشی سے اسے دیکھ کر باہر نکل آئی۔ وہ سوچ رہی تھی یا تو وہ بہت پکے ہاتھوں میں

یا واقعی سچ کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

بلی شیر کو سب گر سکھا دیتی ہے لیکن جب درخت پہ چڑھنے کی باری آتی ہے تو وہ تنہا چڑھتی ہے۔ ربیعہ نے صباحت کو ہر راز سے واقف کر دیا تھا لیکن مہتاب خان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ صباحت بے خبر نہیں تھی، جان گئی تھی کہ پتنگ تیز ہواؤں کی زد میں ڈول رہی ہے۔ کبھی بھی کٹ کر کسی کے ہاتھ میں آسکتی ہے اور پھر تار تار۔ اس کا مقصد تو صرف پتنگ کو آزادی کی ڈور کے ہمراہ آزاد فضا کے حوالے کرنا تھا جو وہ کر چکی تھی اب پتنگ کی مرضی تھی۔ ڈولتی یا چڑھتی۔

رما نے آج عباد کو اپنے دل کی پریشانی اور وہم سے متعلق آگاہ کر دیا تھا۔ کافی دیر تک عباد خاموشی سے سنتے رہے اور کچھ نہ بولے۔ رما کے لئے یہ دوہرا امتحان تھا۔ ایک تو ربیعہ عباد کی چھوٹی بہن تھی۔ دوسرے خدشہ ایسا تھا کہ دل میں بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ بات کو بڑے نپے تلے انداز میں پیش کرنا تھا کہ وہ اس کا دسواں سمجھ جائے۔

عباد بڑی گہری سوچ میں مبتلا دکھائی دے رہے تھے۔

رما پہ گھبراہٹ وار ہونے لگی۔

''آپ مجھے غلط مت سمجھئے گا۔ ربیعہ میری بھی تو چھوٹی بہن ہے میرا مقصد اس پر الزام لگانا نہیں ہے، میں یہ چاہتی ہوں کہ اس کا نوٹس لیا جائے۔''

عباد کی عادت تھی کہ وہ فوری طور پہ کسی بھی ردعمل کا اظہار نہیں کرتے تھے اور یہ رما کے لیے سب سے بڑی مصیبت تھی۔

معاً حسن روتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، دونوں کی توجہ بچے کی جانب چلی گئی۔ رما اس کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اٹھ چکی تھی جبکہ عباد کا ذہن ربیعہ کی طرف الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

''آج سے عارش ربیعہ کو کالج چھوڑ کر بھی آئے گا اور لے کر بھی۔'' عباد نے بڑے نپے تلے انداز میں کہا تو بڑی اماں فوراً بولیں۔

''ہم تو پہلے ہی کہتے ہیں جب چھ چھ بھائی ہیں تو بہن بس میں کیوں جاتی ہے۔ اللہ کا فضل ہے اپنے گھر کی سواریاں بھی ہیں۔''

عارش نے بڑے بھائی کے حکم پہ کوئی حیل حجت نہ کی ویسے بھی اسے عباد کی سپورٹ کی ضرورت تھی۔ وہ کیونکر انکار نہیں کرتا۔ البتہ ربیعہ کے تو آگ لگ گئی۔

رما سے تو وہ پہلے ہی خار کھاتی تھی۔ اب تو اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسے شوٹ کر دے۔

اس کی آزادی کو سلب کرنے والی آخر وہ کون ہوتی تھی۔ آج آزادی سلب کر رہی تھی کل آواز دبا تی۔

وہ عارش کے ہمراہ آنے جانے لگی۔ مہتاب خان اسے روز عارش کے ہمراہ آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ ربیعہ بے چین تھی کہ کس طرح مہتاب سے ملے اور اسے سارا قصہ کہہ سنائے۔

اس نے یہ ترکیب نکالی جویریہ جو اس کے حال دل سے واقف تھی اسے ساری بات بتا دی۔ ساتھ ہی جویریہ کو خط دیا کہ وہ مہتاب تک پہنچا دے جس میں اس نے اپنی پریشانی کا حال لکھا تھا۔ اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہ ٹیلی فون بھی نہیں کر سکتی۔

"تمہیں چاہیے کہ کچھ دن ایک دوسرے سے رابطہ بند کر دو۔ گھر والوں کو شک ہی تو ہے یقین تو نہیں۔ پھر میرے گھر آ کر مل لینا۔" جویریہ نے اس کی پریشانی کا حل نکالا۔

یہ تجویز ربیعہ کے لئے بے حد خوش آئند تھی۔ آخر اس نے ایسا پہلے کیوں نہیں سوچا۔ مہتاب جویریہ کا کزن تھا اور وہ ان کے گھر آتا رہتا تھا۔ جویریہ کی فیملی اچھی تھی۔ پہلے یہ لوگ ان کے ہمسائے ہی تھے۔ شہر سے باہر بعد میں شفٹ ہوئے تھے، اماں وغیرہ بھی انہیں جانتی تھیں۔ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھا لیکن جب سے وہ دوسری جگہ شفٹ ہوئے تھے خاص مواقعوں پر ہی ایک دوسرے کے ہاں آیا جایا جاتا تھا۔ ان کا لائف اسٹائل کالونی میں جانے کی وجہ سے خاصا تبدیل ہو گیا تھا جس سے ربیعہ کے گھر والے واقف نہیں تھے۔

☆☆☆

جویریہ نے فون کیا تھا کہ "وہ آیا ہوا ہے۔ اگر تم آ سکتی ہو تو آ جاؤ۔"

"اس طرح اچانک؟"

"ہاں۔ اچانک ہی..... ہمارے گھر والوں کو بھی تو بے خبر رکھنا ہے۔ انہیں بھی تو شک نہ ہو۔ تمہاری ملاقات کا میں بندوبست کرا دوں گی۔"

لیکن آج اس کا جانا ناممکن تھا اس لیے کہ آج صدف آئی ہوئی تھی۔ رما بھی ضرورت سے زیادہ اماں کی چہیتی بنی ہوئی تھی۔ کسی وقت بھی کوئی صور پھونک سکتی تھی۔ وہ جانہیں سکی لیکن رات تک بے حد بے چین رہی۔

صبح کالج میں جویریہ نے اسے پکڑ لیا۔

"انتہائی بدتمیز ہو تم۔ پتا ہے تمہیں وہ صرف تمہارے لیے آیا تھا۔"

"معلوم ہے مجھے....." وہ بہت اداس تھی۔

"تو پھر کیوں نہیں مریں۔"

"معلوم تو ہے تمہیں۔ اول تو اماں کو سہیلیوں کے پاس آنا جانا بالکل پسند نہیں پھر اکیلے

ہیں بھیجتیں۔ عارش اور ثاقب گھر پہ نہیں تھے۔ صدف آئی ہوئی تھی۔ اگر وہ صدف کے ساتھ روانہ کر بھی دیتیں تو اور بھی مصیبت آ جاتی۔"

"چلو۔ یہ تو تم نے اچھا کیا لیکن اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

"سوچنا کیا ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نجانے میں کہاں پھنستی جا رہی ہوں۔ جہاں اس کا نام آتا ہے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ لاکھ اپنے آپ کو روکنا چاہوں رک نہیں پاتی۔ گھر کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔"

"کس قسم کے حالات؟"

"گھریلو حالات۔ تمہیں معلوم تو ہے، صباحت بھابھی اور حماد بھائی کی آج تک نہیں ..... حماد بھائی اکثر اب شہر سے باہر رہنے لگے ہیں۔ اماں ان کی جدائی میں اور بھی بے حال ہوئی ارہی ہیں۔ گھر گھر نہیں میدانِ جنگ لگنے لگا ہے۔ صباحت بھابھی اور اماں کے درمیان ہر وقت محاذ رائی ہوتی رہتی ہے۔

زرین بھابھی کے ہاں نئے بچے کی آمد ہے۔ یہ ٹینشن بھی کچھ کم نہیں۔ شہزاد بھائی اور رین بھابھی کے درمیان ہر وقت اسی بات کا جھگڑا ہے۔ وہ مزید بچہ نہیں چاہتے جبکہ زرین بھابھی کو پنے میکے کی حمایت حاصل ہے۔

صدف کل یوں ہی نہیں آئی تھی، راش بھائی یعنی ہمارے اکلوتے بہنوئی کا مطالبہ لے کر ئی تھی۔ وہ کوئی نیا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بھائیوں سے پیسے مانگے ہیں۔ بصورتِ دیگر صدف کا سارا زیور فروخت کر دیں گے۔ آپا کا اس وجہ سے دن رات بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا ہے۔ ج ابو ہوتے تو شاید....."

"اوہ..... مائی گاڈ..... تمہارا گھر ہے یا مسائل کا انبار۔" جویریہ نے گہرا سانس لیا۔

"مسائل کا انبار..... لیکن میں ان مسائل کی ذمے دار تو نہیں ہوں۔ اگر صباحت بھابھی ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اماں کہتی ہیں زیادہ پڑھنے سے انسان کا دماغ خراب ہو جاتا ، میرا بھی ہو جائے گا صباحت کی طرح۔ زرین بھابھی اگر ہر سال بچہ پیدا کرتی ہیں تو میں کیا روں۔ ان کے حصے کا کام مجھے کرنا پڑتا ہے۔ انہیں ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ بتا دیا ہے۔ صدف کی ست خراب ہے تو لازمی ہے میری بھی ایسی ہی ہو گی، اس لیے میں اپنے نفس کی اصلاح آج سے روں۔ تاکہ کل ہر مشکل حالات کا سامنا کر سکوں۔ کیوں۔ آخر کیوں؟

جویریہ! میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ اماں اور آپا کے چنگل سے سب نکل گئے ہیں۔ تجربے کے ئے رہ گئی ہوں تو صرف میں۔ جو کی بڑی اولادوں میں رہ گئی تھی۔ وہ مجھ پر آزمائی جا رہی ہے۔ آخر

عارش، ثاقب اور سنی بھی تو ہیں۔ انہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ میں لڑکی ہوں تو ضرورت سے زیادہ مجھ پہ پابندیاں ہیں۔ زندگی میں کوئی خوش گوار بات تو رہی ہی نہیں۔"

"کیا مہتاب سے بھی نہیں۔" جویریہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ربیعہ نے نگاہیں جھکالیں۔

"ایک وہی تو ہے جو اس وقت سب سے مختلف اور اچھا لگتا ہے۔ لیکن اب تو۔" ربیعہ خاموش ہوگئی۔

"نجانے لوگ دوسروں کی خوشیوں کے کیوں دشمن ہوتے ہیں۔ کیا محبت کرنا گناہ ہے۔ اچھا تو کوئی بھی لگ سکتا ہے۔"

وہ رو رہی تھی۔ جویریہ نے اسے دلاسا دیا۔

"آج کل میرے بہت رشتے آرہے ہیں۔ ابھی اماں اور آپا سوچ رہی ہیں لیکن میں نے دل میں عہد کر رکھا ہے۔ شادی کروں گی تو مہتاب سے..... ورنہ کسی سے نہیں۔"

جویریہ کی آنکھیں کھل گئیں۔

(اچھا۔ تو تم یہاں تک سنجیدہ ہو۔ میں تو سمجھی تھی کہ یہ کھیل صرف دل لگی کا ہے)

"اور مہتاب کا کیا ارادہ ہے؟" جویریہ نے کریدا۔

"وہ بھی یہی کہتا ہے۔ نوکری پکی ہوجائے پھر باقاعدہ پرپوزل بھیجے گا۔"

"اسے نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے باپ کا تو بہت بڑا بزنس ہے اور وہ اکلوتا وارث ہے۔"

"ہاں۔ لیکن وہ کہتا ہے' وہ سہاروں پر زندگی نہیں گزارے گا۔ اسے اپنے بازوؤں پہ ناز ہے۔ مجھے اس کے خیالات بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"اگر تم لوگ اتنے ہی سنجیدہ ہو۔ تو پھر کیسی مشکل؟" جویریہ نے پوچھا۔

"وقت کے فیصلے کا انتظار ہے۔" ربیعہ پرخیال انداز میں بولی۔

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ آئندہ تم اگر ملاقات کا بندوبست کرادو مہربانی ہوگی۔"

"دیکھو ربیعہ! گھر میں تو میرے بھی مشکل ہے، بے شک ہمارے کزنز ہمارے ہاں آتے جاتے رہتے ہیں لیکن مہتاب زیادہ آئے گا تو امی وغیرہ کو شک بھی ہوسکتا ہے۔ آج کل ویسے بھی گھر میں نادیہ کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں۔ امی اور نادیہ تقریباً شاپنگ پہ ہی رہتی ہیں۔ پرسوں ان کا جیولرز کے ہاں جانے کا پروگرام ہے، امید ہے خاصی دیر لگا کر آئیں گی۔ میں اسے فون کردوں گی اس کا ذاتی موبائل ہے اگر تم پہنچ سکتی ہو تو پہنچ جانا۔"

"تھینک یو جویریہ..... تھینک یو۔"

ربیعہ نے فرط مسرت سے اس کے ہاتھ چوم لیے۔

☆☆☆

اماں سے تو بات کرنا فضول تھا، اس نے بڑی آپا کو بتایا کہ اسے جویریہ کے ہاں جانا ہے۔ اس کے امتحان سر پر ہیں۔ جویریہ سے کچھ نوٹس سمجھنے ہیں۔

"ٹیوشن آپ لوگ رکھ کر نہیں دیتے، بھائیوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا جو وہ پڑھا سکیں۔ کمبائن اسٹڈی سے کافی مسائل حل ہوجاتے ہیں۔"

آپا جان میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ جلدی قائل ہوجاتی تھیں۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ آپا نے ثاقب کے ساتھ بھجوادیا تھا۔ اس نے جویریہ کے گھر پہنچ کر ثاقب کو واپس بھیج دیا۔ جب فارغ ہوجائے گی فون کردے گی۔

جویریہ اس کی منتظر تھی۔ البتہ مہتاب ابھی تک نہیں آیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی آگیا۔ وہ ربیعہ سے زیادہ بے چین تھا، جویریہ ان کی خاطر تواضع کے انتظام میں لگ گئی۔

ربیعہ نے موقع پاتے ہی مہتاب کو سارا قصہ کہہ سنایا۔

"مہتاب! میں اب تم سے اس طرح نہیں مل سکتی۔ یہ ملاقات سمجھ لینا کہ آخری ہے لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تمہیں باقاعدہ پرپوزل بھیجنا ہوگا۔"

"ربیعہ! اتنی جلدی۔ ابھی تو تمہاری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔"

"ہمارے ہاں تعلیم مکمل کرنا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میٹرک کے بعد بھی رشتہ آجائے تو شادی میں دیر نہیں کی جاتی۔"

"مگر مجھے تو ابھی....."

"تمہارے پاپا کا اتنا بڑا بزنس تو ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے فکرمند ہونے کی۔"

"ربیعہ! ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔ ہر چیز وقت پہ ہی اچھی لگتی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں بچی ہوں یا تم بچے ہو۔"

مہتاب ہنس پڑا۔

"میں تو بچہ نہیں ہوں۔ البتہ تم ذرا سی بچی ہو۔ جو ذرا سی پریشانی آنے پہ اتنا گھبرا جاتی ہو پریکٹیکل لائف میں تو اس سے بھی بڑے بڑے مسئلے ہوتے ہیں۔ تمہارے دن رات تو بس رو رو کر ہی گزریں گے۔"

"اللہ نہ کرے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"اللہ تو کچھ نہیں کرتا۔ بندے ہی کرتے ہیں۔ بھائی کے ساتھ اگر تم آ جا رہی ہو۔ تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ بندہ خط کا جواب ہی نہ دے تم تو اس طرح ہو گئی ہو جیسے تمہارا بھائی منکر نکیر بن کر ہر وقت تمہارے سر پر سوار رہتا ہو۔"

"میں نہیں چاہتی کہ ہماری محبت کسی رسوائی کا سبب بنے۔"

"مگر میں تمہاری جدائی نہیں سہہ سکتا۔" مہتاب بے چینی سے بولا۔

"میں بھی تو یہی کہنا چاہتی ہوں کہ اس جدائی کا کوئی حل نکالو۔"

"حل تو صرف ملاپ ہی ہے۔" مہتاب چمک کر بولا۔

ربیعہ نے نگاہیں جھکا لیں۔ "کب تک؟"

"ابھی۔" وہ قریب آنے لگا۔ ربیعہ بدک کر پیچھے ہو گئی۔

مہتاب قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"بزدل! اتنا بھی اعتبار نہیں۔"

"اعتبار پہلے، محبت بعد میں کی ہے۔" ربیعہ آہستگی سے بولی۔

(مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیوں کا سب سے بڑا المیہ یہی ہوتا ہے۔ حقیقت پسند بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ خواب کو خواب ہی نہیں سمجھتیں۔)

مہتاب سوچ کر رہ گیا۔

"اچھا۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ میں نے سوچا ہے کہ میں تمہیں ممی سے ملواؤں لیکن فی الحال وہ اسٹیٹس گئی ہوئی ہیں۔ جیسے ہی وہ آئیں گی۔ میں تمہیں ممی سے ملوانے لے جاؤں گا۔"

ربیعہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ الجھ کر بولی۔

"یہ کیسی بات ہے آپ کی ممی کو ہمارے ہاں آنا چاہیے یا میں جاؤں گی وہاں۔"

"یہی۔ یہی تو المیہ ہے میری جان! ابھی ہم ایک دوسرے کے اسٹیٹس سے واقف ہوئے نہیں۔ اور تم چلی ہو دلہن بننے۔ مائی ڈیئر۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اپر کلاس گھرانوں کی ڈیمانڈز کچھ اور ہوتی ہیں۔ تم اتنے بڑے کالج میں پڑھ رہی ہو لیکن ابھی تک بہت سی باتوں سے ناواقف ہو۔ میں تمہیں اپنے اسٹیٹس سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لئے ہمارا ملنا جلنا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بہت ضروری ہے۔"

مہتاب کو اپنے گھر بلانے کا تصور ہی اس کے لئے موت تھا۔ اس نے دل تھام لیا۔

"ہمارے ہاں تو لڑکا شادی کے بعد ہی آتا ہے۔"

"اُفوہ۔ ایک تو یہ بڑی مصیبت ہے۔ میری جان! میں تمہارے مسائل سے بخوبی واقف

ہوں لیکن میری پوزیشن بھی تو سمجھو۔ تم جب ممی سے نہیں ملو گی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ تمہارے بارے میں سوچ بھی سکیں۔"

"کیا تمہیں یقین ہے، آنٹی مجھے پسند کر لیں گی؟"

انہوں نے تمہارے لیے تو کوئی گوری پسند کر رکھی ہو گی۔"

"تمہارے سامنے کیسی گوری اور کیسی کالی۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ممی تمہیں دیکھتے ہی پسند کر لیں گی تم نے کبھی آئینہ دیکھا ہے ربیعہ؟" اس نے جذب سے ربیعہ کی طرف دیکھا۔ ربیعہ شرما گئی۔

"تمہارے چہرے پہ کتنی معصومیت ہے۔ تمہاری آنکھیں، تمہارے بال، میں ان کے سحر میں کھو گیا ہوں۔ تم، تم....."

"آن..... ہاں....." جو یریہ نے کمرے میں بڑھ کر کھنکھارا تو دونوں ہی سنبھل گئے۔

"تم نے کباب میں ہڈی ضرور بننا تھا۔" مہتاب نے پنتے ہوئے کہا۔

"میں بغیر ہڈی کے کباب لائی ہوں۔ چائے کے ساتھ۔" اس نے ٹرالی سامنے کی۔

دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

مہتاب کی ہنسی میں بے فکری تھی۔ ربیعہ نئی فکر میں مبتلا دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

"تمہاری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے ربیعہ؟" عباد بھائی اچانک اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔

وہ چونک گئی اور فوراً کھڑی ہو گئی۔

"بہت اچھی۔ آیئے بیٹھیے۔"

عباد قریب ہی کرسی پہ بیٹھ گئے۔

"آج آپ کو ہمارے غریب خانے میں آنے کی فرصت کیسے مل گئی۔ آپ کو تو کمپیوٹر یا پھر بھابی، ان دو چیزوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا تھا۔

"وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی مصروفیات بدل جاتی ہیں۔" وہ سادگی سے بولے۔

"کیا ترجیحات بھی؟" ربیعہ کا انداز ہنوز تھا۔

"یہ تم سے کس نے کہا۔"

"کچھ باتیں رویوں سے محسوس ہوتی ہیں، بتائی نہیں جاتیں۔"

"اچھا!" عباد ہلکے سے ہنس پڑے۔ "تم نے میرے رویے سے کیا محسوس کیا؟"

"یہی کہ آپ ضرورت سے زیادہ رما بھابھی کو ترجیح دیتے ہیں اور بھی تو بھائی ہیں مگر۔ ان کا رویہ نارمل ہوتا ہے؟" عباد ہنس پڑے۔

"بعض لوگوں میں ایسا سحر ہوتا ہے کہ انہیں زیادہ ہی ترجیح دی جاتی ہے۔" ربیعہ جل ہی تو گئی طنزیہ مسکرا کر بولی۔

"ان لوگوں کو بھی تو چاہیے کہ وہ ترجیح دینے والوں کو ترجیح دیں، نہ کہ دوسروں کو....."

"کیا مطلب؟" عباد سمجھے نہیں۔ ٹھٹک گئے۔

رما، احسن کو ڈھونڈتی ہوئی آرہی تھی، عباد کی موجودگی کی وجہ سے اس کے قدم وہیں رک گئے اور دل میں ہول اٹھنے لگے۔ نہ جانے عباد، ربیعہ سے کس طرح بات کریں گے۔ وہ دانستہ رک کر سننے لگی۔

"آج کل بھابھی صاحبہ عارش کو ضرورت سے زیادہ ہی ترجیح دے رہی ہیں۔ شاپنگ پہ جانا ہو تو عارش۔ اپنی امی کے ہاں جانا ہو تو عارش۔ بچوں کو سیر کرانے بھیجنا ہو تو عارش۔ نئے سے نئے قصے سن لو۔ عارش کو شور ہنگامہ پسند ہے، بھابھی صاحبہ کو بھی شور ہنگامہ پسند ہے۔

عارش کو پاپ میوزک پسند ہے۔ بھابھی بھی پاپ سننے لگی ہیں۔ کہتی کیا ہیں..... عباد کے پاس تو طبلے والے گیت ہوتے ہیں۔ سست اور بے کار۔

کچھ پکائیں گی تو سب سے پہلے عارش کو یاد کیا جائے گا۔ وہ ریسپانس اچھا دیتا ہے اس لیے سب سے پہلے اسے ہی چکھاتی ہوں۔ تمہارے بھیا تو بس پیٹ بھرنے کو کھاتے ہیں۔ ذائقوں کے دام تو عارش سے لگوانے چاہئیں۔

اب تو کپڑے بھی عارش کی پسند کے پہننے لگی ہیں۔ کہتی ہیں "انہیں تو میں ہر روپ میں اچھی لگتی ہوں۔ لیکن لوگوں کی بھی تو ہمارے بارے میں رائے اچھی ہونی چاہیے۔ عارش کی چوائس اچھی ہے۔"

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ بھابھی کی نظر میں آپ کس حیثیت و مقام پہ ہیں اور وہ کیا ترجیح دیتی ہیں آپ کو؟"

"ربیعہ! تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" یہ شاید عباد ہی تھا جو برداشت کر گیا تھا۔ دنیا کا کوئی اور مرد ہوتا تو بہن کو الزام لگانے پہ قتل کر دیتا یا بیوی کو مجرم ہونے پہ زندہ گاڑ دیتا۔

"بھائی! اگر آپ کو میری بات عجیب لگ رہی ہے اور یقیناً بری بھی لگی ہوگی۔ تو آپ چند دن خود نوٹ کر لیں۔"

"ربیعہ! تمہارے خیالات سن کر مجھے بے حد افسوس ہو رہا ہے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان دونوں کی اول دن سے انڈر اسٹینڈنگ ہے۔"

"اور آپ کے ساتھ کتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے بھابھی کی؟ ہر وقت تو وہ آپ کے مزاج سے نالاں و شاکی رہتی ہیں۔ عباد کو یہ پسند نہیں۔ عباد کو وہ پسند نہیں۔ گھر میں عارش نہ ہو تو میرا تو دل نہ

لگے۔ بس آپ کے بعد عارش ہی تو ہے گھر میں۔ اور کوئی ہے ہی نہیں۔ ہر رشتے کا ایک رویہ ہوتا ہے بھائی.....! جن لوگوں کی وجہ سے آپ نے خود کو اتنا کلوز کر لیا ہے۔ ان کے بارے میں سوچیں کہ وہ زندگی میں آپ کو کس مقام پر رکھتے ہیں۔"

اب مقام نہیں تھا کہ رما مزید کچھ اور سنتی۔ غم و غصے سے اسکا وجود کانپ رہا تھا۔ وہ اسی کیفیت میں آگے بڑھی اور دوسرے ہی پل زور دار طمانچہ ربیعہ کے منہ پہ تھا۔ ربیعہ تو ربیعہ عباد بھی حق دق رہ گئے۔

"یہ کام آپ کو کرنا چاہیے تھا لیکن افسوس مجھے کرنا پڑا۔" رما کی آواز کانپ رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس گھر کے لوگ ایسی سوچ بھی رکھ سکتے ہیں۔ بلائیے اپنے بھائی کو۔ اور پوچھیے کہ ایسے کون سے تعلقات ہیں ہمارے۔"

"رما!" عباد نے سرزنش کی۔

"مجھے روک رہے ہیں۔ اور اپنی بہن کے منہ سے اتنی بکواس سن لی۔ ہاں مجھے اول دن سے عارش کی عادات اچھی لگتی تھیں اور اس بات سے آپ واقف تھے۔ اتفاق سے ہماری عادات ملتی ہیں تو اس میں کیا جرم ہو گیا۔"

وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ چونکہ ربیعہ کا کمرہ اوپر تھا اس لیے ان قیامت خیز لمحات سے سب واقف تھے۔ اور ویسے بھی سب رات آٹھ بجے کے ڈرامے میں مصروف تھے۔

"ہر آدمی یہاں خود غرض ہے۔ تعصب سے بھرا ہوا ہے یہ گھر، مطلب پرست لوگ۔" رما منہ میں جو آرہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔

"عارش۔ عارش آج کل اس لیے زیادہ میرے آگے پیچھے رہتا ہے کہ اسے میری سپورٹ وہ زرین کی بہن امبرین کو پسند کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اماں سے اس کی سفارش کروں۔ جو اس معدے کو حل نہیں کر پائی تو اماں سے کیا بات کرتی اور پھر گھریلو حالات۔ گھریلو حالات تو اس کی طرح ہو گئے ہیں جو کھینچا تانی سے صرف تار تار ہو رہی ہے۔ میرے اچھے رویے کا آج مجھے یہ انعام ملا ہے، مجھے کسی سے شکوہ نہیں عباد! صرف آپ کے رویے سے دکھ پہنچا ہے۔ آخر آپ نے اتنی ہی کیوں آنے دی کہ میرے کردار کی دھجیاں آپ کی بہن آسانی سے بکھیر گئی اور آپ انہیں تار تار دیکھتے رہے۔ میاں بیوی کے تعلق کے درمیان سب سے اہم چیز اعتبار ہی تو ہوتا ہے محبت تو بعد میں ہے۔ آج تک تو میں آپ کا اعتبار حاصل نہیں کر سکی۔ تو پھر آپ کو مجھ سے محبت کیسی ہے؟"

اس کے بعد وہ رکی نہیں اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

آج کی رات قیامت کی رات تھی۔ ساری رات عباد کی سوچتے اور رما کی روتے گزری تھی۔ رما کا خیال تھا کہ عباد اس سے کوئی بات کریں گے اور انہیں کرنی بھی چاہیے تھی لیکن عباد نے کوئی بات نہیں کی۔ رما کے لئے عباد کا یہ رویہ ناقابل برداشت تھا۔

وہ عباد سے سخت خفا تھی۔ ان سے بہت سا لڑنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ بات خود شروع کریں۔ ساری رات گزر گئی اور آخر کار وہ ایک فیصلے پہ پہنچ گئے۔

دونوں باتوں میں سے ایک سچ ضرور ہے اور یہ حقیقت کتنی تکلیف دہ تھی جبکہ رما کے دل میں عباد کی طرف سے بہت ہی برے برے خیالات آتے رہے تھے اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب یہاں نہیں رہے گی۔ اپنے والدین کے گھر چلی جائے گی۔

اس نے اپنا سب سامان پیک کر لیا تھا اور جانے کے لئے تیار تھی۔ گھر والوں کے لئے اس کا یوں چلے جانے کا فیصلہ بالکل اچانک تھا جبکہ عباد بھی آفس جا چکے تھے۔

"آخر پتہ بھی تو لگے، جا کیوں رہی ہو۔ عباد سے کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ بات کیا ہے۔ ہمیں بتاتی کیوں نہیں۔"

بڑی اماں نے کوئی سترویں دفعہ پوچھا تھا اور رما کا وہی جواب تھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔"

"تو پھر یہ ساز و سامان اٹھائے کہاں جا رہی ہو؟"

"اپنے والدین کے گھر۔"

"مگر کیوں......؟"

"کیونکہ یہ جگہ اب رہنے کے لائق نہیں رہی؟"

"اچانک کیا کیڑے پڑ گئے اس جگہ میں؟"

"اپنے بیٹے سے پوچھیے گا۔"

"اگر تم دونوں میاں بیوی کا کوئی جھگڑا ہوا ہے تو اسے باہم سلجھاؤ۔ یوں گھر سے جانے کا مطلب؟"

"اسی چیز کا تو افسوس ہے گھر والوں کو کہ آج تک ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور تھپڑ نہیں لگا۔ اب سازش مکمل ہو گئی فساد کرانے کی۔"

"اے بی بی! بس رہنے دو۔ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے اگر تمہیں اپنے مرد سے کوئی شکایت ہے یا کوئی مطالبہ ہے تو صاف بیان کرو۔ ہمیں درمیان میں کیوں لپیٹ رہی ہو اور یوں باپ کے ہاں جا کے بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔"

"جواز تو پیدا کیا گیا ہے۔" رما کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"بس اماں! میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔" (انسان دلوں میں رہتے ہیں جگہوں پر نہیں۔ عباد کے دل میں میرے لیے شک کا بال آ گیا تو اب میرے لیے ممکن نہیں کہ میں یہاں رہ کر مزید اپنی تذلیل کراؤں۔)

اماں خاموش ہو گئیں لیکن بڑی آپا بول رہی تھیں۔

"ایک ہی کچھ بہتر آئی تھی اس کے بھی پر نکل گئے۔ ارے لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔" بڑی آپا بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ اماں بھی اٹھ گئیں۔

صدف آئی ہوئی تھی اور وہ جلتی پہ تیل کا کام کر رہی تھی۔

"آپ لوگوں کو ہی خوش فہمی تھی کہ محترمہ اچھی ہیں۔ وقت کے ساتھ آدمی کا بھید کھلتا ہے۔ کھل کر گن سامنے آ گئے۔ بیٹا آئے تو اس سے بات کرنا۔ اس کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ جاتی ہے تو جانے دو۔"

رما' سامان اور بچے لے کر گھر سے نکل رہی تھی لیکن آوازیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

☆☆☆

عباد کا آج سارا دن بے چینی اور مضطرب سوچوں میں گزرا تھا۔ بار بار رات کا واقعہ ذہن میں ابھر رہا تھا اور مٹ رہا تھا کتنی عجیب و غریب بات تھی جو رات کو پیش آئی تھی۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ جس طرف بھی ذہن جاتا، وہی مجرم لگتی تھی۔ لیکن ایک بات مختلف تھی۔ رما نے صرف خدشہ ظاہر کیا تھا اور جبکہ ربیعہ نے الزام......

الزام تھا یا تہمت......

آخر ایسی نوبت ہی کیوں آئی اور یہ بھی کتنی عجیب بات ہے، دونوں ہی باتوں سے گھر کا کوئی بھی شخص آگاہ نہیں۔

یہ کیسی گتھی تھی جو سلجھ نہیں رہی تھی۔

کبھی رما کا چہرہ آنکھوں میں آتا تھا اور کبھی ربیعہ کا۔ ربیعہ ایک لچک دار نرم شاخ تھی جو کدھر بھی مڑ سکتی تھی۔

رما۔ مجبور عورت تھی۔ اسے جھکنے میں بھی دیر لگتی اور کھلنے میں بھی۔

ربیعہ کے انداز میں اتنی جرأت اور بے باکی کیوں تھی۔

رما نے اتنے جھجکتے ہوئے کیوں بتایا تھا۔

ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ربیعہ نے اپنا دفاع کرنے کے لئے چال کھیلی ہو۔ اتنی گھناؤنی چال۔

"بھاڑ میں جائے ثبوت اور بھاڑ میں جائے کچھ اور....."

کچھ بھی ہے ربیعہ کا ان حالات میں کالج جانا درست نہیں، اگر کچھ ہو گیا۔ تو اس نقصان کا ذمہ دار کون ہوگا۔ وہ جس نے ربیعہ کی تعلیم کے معاملے میں حمایت کی تھی۔ یعنی وہ خود....."

لیکن دل دونوں کے خلاف گواہی نہیں دیتا..... مگر دماغ منوانے پر تلا ہوا تھا۔

انہوں نے ٹائم دیکھا۔ دو بجنے میں دس منٹ تھے۔ گاڑی کی چابی اٹھائی اور ربیعہ کو کالج لینے کے ارادے سے اٹھ گئے۔

☆☆☆

صبح کالج آتے ہی اسے مہتاب کا مختصر پیغام ملا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا کرے؟ آج وہ گھر سے ہی گم صم آئی تھی، اس کے دل میں ایک خوف تھا۔ ایسا خوف جو کچھ ہونے کا پتا دے رہا تھا۔ رات اس نے کیا کچھ بکا تھا۔ کیا وہ اندازہ کر سکتی تھی۔ اپنے مفاد کے خاطر دو انسانوں کی زندگی داؤ پہ لگا دی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کے سامنے تھا۔

یہ بات تو طے ہے کہ کوئی انقلاب یا کوئی طوفان آنے والا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے کالج سے ہی اٹھا لیا جائے۔ کیا وہ مہتاب کے بنا جی پائے گی۔

وہ بے چینی سے اس کے خط کو ہتھیلیوں میں مسلنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا فیصلہ کرے۔ اس نے بے چینی سے ایک بار پھر اس رقعہ کو کھول کر پڑھا۔ جس میں لکھا تھا۔

"ممی اسٹیٹس سے آ گئی ہیں اور وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں، بتاؤ کب تمہارے دولت خانے پہ حاضری دوں۔ آج یا پھر کبھی؟ میں مقررہ وقت پہ تمہارے جواب کا انتظار کالج کے باہر کروں گا۔"

ربیعہ نے کئی بار اس تحریر کو پڑھا جیسے اپنے دل کو آمادہ کر رہی ہو۔

پھر کبھی کیوں۔ آج ہی کیوں نہیں؟

آج وہ اس کی ممی سے ضرور ملے گی۔

ہاں۔ آج ہی اس کہانی کا ڈراپ سین ہو جانا چاہیے۔

نجانے اس سے ملنے کے بعد اس کی ممی کے کیا خیالات ہوں۔

یہی فیصلہ بہتر ہے کہ وہ ان سے مل لے۔

کم از کم۔ یوں مجرموں کی طرح ملنا۔ رابعا بھی نے صرف شک کا ہی اظہار کیا تھا۔ اس سے قبل کوئی چشم دید گواہ بنے۔ وہ اس سلسلے کو ہی ختم کر دے اور اسکا فیصلہ اس کی ممی ہی کر سکتی تھیں۔

آج صبح سے اس نے کوئی کلاس نہیں لی تھی۔ چوتھے پریڈ کے اختتام کا اسے بے چینی سے انتظار تھا۔ جیسے ہی پریڈ اور ہوا اور کالج کا بیرونی گیٹ کھل گیا۔ آج جویریہ بھی کالج نہیں آئی تھی۔ وہ

چپ چاپ کالج سے باہر نکل گئی۔ وہ گاڑی لیے منتظر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر کھل گیا۔ لیکن ربیعہ کا چہرا اور آنکھیں اداس تھیں۔ وہ اپنے اس فیصلے پہ مطمئن بھی تھی اور بے چین بھی۔ وہ کسی ایک کیفیت پہ قابو نہیں پا رہی تھی۔

گاڑی اپنے راستے پہ رواں دواں ہو گئی۔ مہتاب خان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے تو بالکل امید نہیں تھی کہ تم آج ہی میرے ساتھ چلنے پہ رضامند ہو جاؤ گی۔ مجھ سے تو خوشی سنبھالی نہیں جا رہی۔"

ربیعہ اس کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکی۔ سنجیدگی سے بولی۔

"ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں، کیا تم مجھے دو بجے تک کالج واپس پہنچا دو گے؟"

"آف کورس۔ کیوں نہیں۔ مجھے معلوم ہے، تمہارا بھائی وقت کا پابند ہے۔"

ربیعہ خاموشی سے باہر دیکھنے لگی۔ پتا نہیں وہ ٹھیک بھی کر رہی تھی یا نہیں۔ ایسی کون سی کشش تھی اس شخص میں جو وہ یہاں تک آ گئی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے مہتاب خان کے وجیہہ سراپے کو دیکھا اور آنکھیں چرا لیں۔

"کیا بات ہے تم، گم صم کیوں ہو؟" مہتاب نے اس کی چوری پکڑ تو لی تھی لیکن لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔

"کچھ نہیں۔" ربیعہ سرسری سا مسکرائی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا رویہ اختیار کرے۔

"ممی۔ تم اپنی ہونے والی ساس سے ملنے جا رہی ہو۔ خوشی سے ملنا۔ یہ کیا منہ لٹکا کر بیٹھی ہو۔"

"تمہاری ممی مجھے پسند کر لیں گی؟"

"آف کورس۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ آج ہی تمہیں شادی پہ رضامند کر لیں۔ آفٹر آل وہ میری مدر ہیں۔ بے تاب اور قدر دان۔ تمہیں دیکھ کر چھوڑ دینا۔ حماقت نہیں تو کیا ہے۔"

"اچھا.....!" ربیعہ تھوڑا سا مغرور ہوئی۔

یہ لمبی سی گاڑی، خوبصورت سا امیر زادہ..... اسے اپنی قسمت پہ رشک آنے لگا۔

"ایک بات بتاؤں تمہیں۔ ممی کو تم جیسی ہی بہو کی ضرورت تھی۔ ملکوتی حسن کی مالک۔ نالصتاً گھریلو اور سلیقہ شعار۔ ممی ذرا سوشل قسم کی خاتون ہیں۔ گھر داری سب ملازمین کے ذمے ہے نہیں کچھ پکانا نہیں آتا۔ بے ذائقے اور بے رنگ کھانے کھا کھا کر سب ہی تھک چکے ہیں۔ ممی ایسی ہولا چاہتی ہیں جو گھریلو امور میں طاق ہو اور گھر داری کو سنبھال لے اور اپنے حسن کی بنیاد پہ آنے والے کو بھی اچھی لگے اور یہ خوبیاں تم میں موجود ہیں۔"

ربیعہ زمین سے ہوا میں سفر کرنے لگی تھی۔ گاڑی اب شہر سے باہر آ چکی تھی۔ ویران اور

سنسان سڑکیں اور دور دور مکان کافی راستہ گزرنے کے بعد ربیعہ نے سوال کیا۔

"یہ علاقہ تو عجیب سا لگتا ہے۔ یہاں تو کوئی ایسا مکان نہیں جو آپ کے اسٹیٹس کے شایان شان ہو۔"

مہتاب ہنس پڑا۔ "بے فکر رہو میں تمہیں گھر لے کر جا رہا ہوں۔ کہیں اور نہیں۔"

اس سے قبل ربیعہ مزید پریشان ہوتی۔ کوٹھیوں کی قطار شروع ہو گئی۔ اکثر کوٹھیوں کے گیٹ بند تھے۔ بڑی بڑی شاندار کوٹھیاں خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی۔

اس نے ایک پرانی سی طرز کی کوٹھی کے سامنے گاڑی روک لی۔

"آؤ۔" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ربیعہ جھجکتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

گھر میں ہو کا عالم تھا صرف ایک چوکیدار کھڑا تھا جسے اس نے باہر جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ وہ گھر کے وسطی حصے میں آ گئے۔

ڈرائنگ روم کی یہ حالت تھی، صوفے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ہر چیز مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے مہینوں سے یہ جگہ بند ہو۔ مہتاب خود ہی ہنس کر بولا۔

"دراصل ممی گئی ہوئی تھیں ناں۔ اس لیے سب ٹمپٹ ہو رہا ہے، تمہیں معلوم تو ہے، ملازمین کیسے ہڈحرام ہوتے ہیں۔ بیٹھو۔" ربیعہ بیٹھ گئی۔

"تم کولڈ ڈرنک پیو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہی چوکیدار دو گلاسوں میں کوک دے گیا تھا۔

ربیعہ کو شدید پیاس لگ رہی تھی۔ وہ غٹاغٹ سارا پی گئی، پہلے ہی راستے میں اتنی دیر ہو گئی تھی۔ اب نجانے مہتاب کہاں چلا گیا تھا۔

"آؤ۔ ربیعہ! اوپر آ جاؤ۔ ممی کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ وہ تمہیں اوپر بلا رہی ہیں۔"

ربیعہ کو ایسے لگا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہے لیکن وہ اپنا وہم سمجھتے ہوئے قدم اٹھانے لگی اور اوپر آ گئی۔

اوپر کا ماحول نیچے سے بالکل مختلف تھا۔ قدرے صاف ستھرا اور پُرسکون۔ شاید اے سی کی ٹھنڈک ماحول کو خوشگوار کر رہی تھی۔ ربیعہ نے کمرے میں داخل ہو کر جائزہ لیا لیکن وہاں مہتاب کے علاوہ دوسرا جو نہیں تھا۔

"مجھے معلوم ہوتا جانِ من کہ تم آج ہی میرے حسین سپنوں کو تعبیر دینے آ جاؤ گی تو اپنے غریب خانے کو سجا کر رکھتا۔" مہتاب کے چہرے پہ بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی، شاید اس نے رکھی تھی، اس کے پاس آنے سے بڑی عجیب اور ناگوار سے بدبو آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی سرخ

ہو رہی تھیں اور لہجہ بھی بہکا ہوا تھا۔

ربیعہ کا دل و دماغ بھک سے اڑ گیا۔ لمحے کی چوتھائی میں وہ اس کے ناپاک عزائم سے آگاہ ہو گئی۔

"تم..... تم....." وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مہتاب ہنسنے لگا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ شادی ابھی میرا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ سرور و میری ماں کا ہے۔ تمہیں تو میں کسی اور مقصد کے لئے یہاں لایا ہوں۔ ہزار پردوں میں رہنے والی۔ قریب سے کیسی لگتی ہے۔ ذرا چھو کر تو دیکھیں۔"

وہ اس کے قریب آیا تو ربیعہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔

اس سے قبل وہ کوئی پیش رفت کرتا۔ وہ باتھ روم کی طرف بھاگی اور دوسرے ہی پل اس نے دروازہ بند کر لیا۔

نجانے کس کی دعا تھی اور اس کی کون سی نیکی تھی جو دروازے میں لاک بن کر لگ گئی تھی۔ اس نے اندر سے چٹخنی چڑھا لی۔ اس کا پورا وجود سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور دل کسی ننھی چڑیا کی طرح دھڑک رہا تھا۔

جتنی بھی قرآنی آیات آتی تھیں، وہ پڑھتی جا رہی تھی اور دل ہی دل میں اپنے اللہ سے حفاظت کی دعا کر رہی تھی۔ پھر وہ کیوں نہ اس کی حفاظت کرتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو تواتر سے رہے تھے۔ گھر والوں کے چہرے۔ اماں اور آپا جان کا وجود سراپا دعا اس کے سامنے تھا۔ اور نہ نے کتنی دعاؤں کے اثر میں تھی کہ وہ پاگلوں کی طرح دوسری طرف سے دروازہ پیٹتا رہا۔ لیکن دروازہ آہنی دیوار بن گیا یہاں تک کہ وہ خوف و گھبراہٹ سے بے ہوش ہو گئی۔

☆☆☆

اس نے آنکھ کھولی تو وہ اپنے گھر میں تھی اور سب ہی اس کے اردگرد جمع تھے۔ اماں، بڑی اور پھر عباد بھائی پہ آ کر اس کی نظریں رک گئیں۔

وہ بڑے متفکر انداز میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ربیعہ نے نگاہیں جھکا لیں۔ ندامت سے آنسو بہنے لگے۔

"اب یہ آنسو کس کے لئے بہا رہی ہو۔ اب تو عمر بھر ہمیں رونا ہے۔" بڑی آپا آبدیدہ برہم ہو کر بولیں۔

"کس چیز کی کمی چھوڑ رکھی تھی ہم نے۔ جو نوبت یہاں تک آئی۔" بڑی آپا نے جھنجھوڑ کر سے پوچھا۔

لیکن ربیعہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سوائے آنسوؤں کے۔

"تو پیدا ہوتے ہی مرجاتی تو ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ اماں کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ عباد نے بڑی آپا کو رسان سے اس کے پاس سے ہٹا دیا۔

"خدا کا شکر ادا کیجئے کہ آپ کی بیٹی جیسے ماں باپ کے گھر میں تھی ایسے ہی محفوظ لوٹی ہے۔"

"کون یقین کرے گا اس بات کا؟" بڑی آپا چلا پڑی۔

"کسی کو بتانے کی ضرورت کیا ہے؟" عباد نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"شام کے سات بجے یہ کالج سے گھر لوٹی ہے اور ابھی کسی کو پتا ہی نہیں لگے گا۔"

"پلیز آپا جان! جذباتی مت ہوں۔ تحمل سے کام لیجئے۔ مشتعل ہوں گی تو شہزاد اور عارش تو اسے قتل ہی کردیں گے۔ جو نہ جانے کس وجہ سے چپ سادھے بیٹھے ہیں۔"

"بہتر ہوتا کہ اسے وہیں جان سے مار دیتے اور کسی دریا میں ڈال آتے۔ میرا جنم تو گندا کر ہی دیا اس نے۔ پوچھو اس سے اتنی جرأت اس نے کہاں سے لی۔ حماد کو معلوم ہو گیا تو قیامت ہی آجائے گی نہ صرف اسے زمین میں گاڑ دے گا، ہمارا بھی جینا حرام کردے گا۔ کالج میں داخلہ دلوانے والا بھی تو تو ہی تھا۔ دیکھ کیا گل کھلا ہے۔"

عباد کے چہرے پہ کسیلی سی مسکراہٹ آکر معدوم ہو گئی۔

"اگر ہر کالج میں پڑھنے والی لڑکی یہی گل کھلاتی۔ تو دنیا کی کوئی لڑکی نہ تو ڈاکٹر بنتی نہ انجینئر اور نہ پائلٹ یہ صرف ہماری بدقسمتی ہے۔ ہر لڑکی اپنے گھر سے ماحول لے کر جاتی ہے اور وہ ماحول اس کا اعتماد ہوتا ہے۔ اپنے گھر کی فضا پہ نظر ڈالیے۔ باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ایک لڑکی لو میرج کر کے اس گھر کی بہو بنی اور کیونکر بنی۔ یہ سوچنے اور پرکھنے کی ضرورت آپ لوگوں کو تھی۔ کیونکہ ہمہ وقت گھر میں آپ رہتی ہیں۔ ہم نہیں۔"

سوچ کا یہ رخ سامنے آیا تو آپا جان کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں سوال و جواب سلسلے کھلنے لگے۔ چاروں طرف صباحت ہی صباحت تھی۔ ان کی گود میں کھیل کھیلا جا رہا تھا اور وہ بے رہیں۔ ایسی بھی کیا شاطر صلاحیتیں تھیں جو کسی کو کھٹکا بھی نہ ہوا۔

"رما کا اچانک میکے چلے جانا اسی سلسلے کی کڑی تو نہیں؟" بہت دیر کے بعد بڑی اماں۔ سوال کیا۔

عباد کے ہونٹ سل گئے۔ ربیعہ کا دل دھڑکنے لگا۔ اماں اور بڑی آپا سراپا سوال تھیں۔

"عباد! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ کیا اس نے تم پہ کوئی شک ظاہر کیا تھا۔ کیا؟ بات جھگڑے کا سبب تھی۔ اگر ایسا تھا تو تم نے ہمیں کچھ کیوں نہیں بتایا۔ تمہارے درمیان تو کبھی جھ

نہیں ہوا۔ پھر اتنی شدید ناراضگی کہ وہ گھر سے چلی گئی۔ بغیر کچھ بتائے ہمارے روکنے کے باوجود۔"

عباد نے جلتی آنکھوں سے ربیعہ کی طرف دیکھا۔ جس نے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ربیعہ کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اگلی قیامت اس سے بھی زیادہ شدید ہو سکتی تھی۔

(اگر میں تمہارے لگائے گئے الزام کا انہیں بتا بھی دوں۔ تو مجھے کیا ملے گا مزید رسوائی اور تکلیف۔ کسی کے رسوا کرنے سے کوئی رسوا نہیں ہوتا۔ سرخرو کرنے والا تو اللہ ہے اور رما سرخرو ہو چکی ہے مگر تم نے یہ کیوں نہیں سوچا میں بھی اس زمین کا بندہ بشر ہوں، جذبات میں کوئی بھی غلطی کر بیٹھتا کیا تم یا کوئی بھی ازالہ کر سکتا تھا۔

مجھے اتنی بڑی آزمائش میں ڈال کر تمہیں کیا ملا۔)

"عباد! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" بڑی اماں نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔

"ہاں۔ شاید ایسا ہی کچھ تھا۔" اس کے بعد وہ کمرے میں نہیں رکے اور باہر نکل گئے۔

☆☆☆

رات کے دو بج رہے تھے اور وہ ایسے ہی پتھرائی ہوئی بستر پہ بیٹھی تھی، کتنی بڑی قیامت سے گزری تھی۔ وہ اپنے پرانے گھر نہ لے کر جاتا اور کسی ہوٹل میں لے جاتا تو یہ لوگ کیسے پہنچتے اور میں کیا اس کے ناپاک عزائم سے بچ جاتی، جویریہ اگر اس سارے واقعہ سے آگاہ نہ ہوتی تو انجانے یہ مجھے کہاں کہاں ڈھونڈتے پھرتے اور نجانے کتنے دن کے بعد میں اسی باتھ روم میں بند مری ہوئی نکلتی اور کون یقین کرتا کہ میں کس حال میں مری ہوں اور اگر وہ نشہ کر کے بے ہوش نہ ہوتا۔ تو وہ تو دروازہ بھی توڑ سکتا تھا۔ جویریہ نہ بتاتی تو کیا ہوتا؟

ربیعہ نے ایک جھرجھری لی، اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اور سفر کے دوران اسے یہ خیال، یہ وسوسہ کیوں نہیں آیا، یہ شخص غلط بھی ہو سکتا ہے۔

اس نے پیچھے کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا۔ کیا وہ اپنے گھر کے ماحول سے اتنی عاجز آگئی تھی۔ وہ کون سا گھر ہے جس میں مسائل نہیں ہوتے پھر اسے جلدی کس چیز کی تھی۔ شادی کی۔ میں...... یا اپنے ماحول سے فرار کی۔

وہ کون سی دنیا دیکھنا چاہتی تھی، کون تھا اسے اس دنیا کی طرف لے جانے والا......؟

کیا وہ اس اذیت کا اندازہ کر سکتی ہے جو اس کے بھائیوں نے اسے تلاش کرنے میں سہی وہ صحیح سالم گھر لوٹ آئی۔ دور سے فجر کی اذانوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ربیعہ نے بستر چھوڑ دیا۔ انسانوں سے معافی مانگ لی تھی۔ اپنے رب سے معافی مانگنا تھی۔ جس نے اس کی نادانی

کے راستے سے لے کر گناہ کی منزل تک اس کی حفاظت کی تھی۔

☆☆☆

''سلمان نگر'' میں آج کی صبح کتنی بوجھل بیدار ہوئی تھی۔ آج کسی کو کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی۔ سب کے ہونٹ پیوست تھے اور وجود بیزار تھے۔

عارش اور شہزاد اب تک غم و غصے کی تصویر بنے ہوئے تھے، سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس غصے کا اظہار کس پر اور کس طرح کریں۔ کتنا تو پیٹ چکے تھے اس شخص کو۔ ادھ موا ہو چکا تھا اور بس مرنے کی کسر باقی تھی۔ اگر اس کے ماں باپ نہ پہنچتے تو شاید یہ بھی ہو چکا ہوتا اور پھر عباد کا تحمل اور مصلحت بھی تو آڑے آئی تھی۔

حماد صبح ہی اسلام آباد سے لوٹے تھے اور اماں نے سارا واقعہ ان کے گوش گزار کر دیا تھا۔

وہ تحیر کی سی کیفیت میں مبتلا تھے۔ بہت دیر تک سب ہی خاموشی سے ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار کرتے رہے۔

اور پھر عباد نے ہی خاموشی کو توڑا۔

''خالہ صغریٰ سے کہیے کوئی اچھا رشتہ تلاش کر کے ہمیں بتائے۔ ربیعہ کی شادی میں مزید تاخیر بہتر نہیں۔''

''ابھی ہماری بہن کی اتنی عمر نہیں ہے کہ اسے شادی جیسی ذمے داری سونپی جائے۔'' حماد فوراً بولے۔

''میرا خیال ہے ہماری بہن نے اس عمل سے خود ثابت کر دیا ہے کہ وہ شادی کے قابل ہو چکی ہے۔'' عباد کا لہجہ طنزیہ تھا۔

حماد لاجواب ہو گئے اور سٹپٹا کر بولے۔

''یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔''

''تو پھر آپ ہی بتا دیجئے کہ مسئلے کا حل کیا ہے۔''

اگلا سوال عارش کا تھا۔

''جس لڑکی کو تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ تمہاری مددگار ثابت ہوئی ہے۔ اصل تو وہی مجرم ہے اور ہماری بچی کو غلط راستہ دکھانے والی وہی ہے۔ اس کے والدین کو کیوں نہیں پکڑتے اگر وہ اتنی ہی ہمدرد تھی تو اس نے پہلے کیوں نہیں بتایا سب کچھ۔''

''یہ سیاست نہیں ہے۔ عقل سے سوچئے۔ اس بات کا جتنا کھوج او تعاقب ہوگا۔ اتنی ہی رسوائی گلے پڑے گی۔ اور پھر اپنی قیمتی چیز کی حفاظت خود کی جاتی ہے۔ ا

لت کی ذمے داری دوسروں پہ مت ڈالئے۔'' عباد کا لہجہ اب بھی پُرسکون تھا۔

''ربیعہ بچی نہیں تھی۔ سمجھ دار تھی۔''

''ہم یہ کب کہہ رہے ہیں کہ دوسرے ذمے دار ہیں۔'' بڑی آپا کی تھکی ماندی آواز ابھری۔

''ذمے دار تو ہم خود ہیں۔ جو آنکھوں پہ پٹی باندھ کر بیٹھے رہے۔ نہ رنگ رنگ کی بہوئیں میں آتیں اور نہ ہماری بچی کو اتنا حوصلہ ملتا۔ ہمیشہ گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔ میں تو پہلے ہی تی یہ عورت کوئی نہ کوئی چاند چڑھا کر رہے گی، اچھے خاندان کی ہوتی تو ہماری اچھائی سوچتی برائی ۔ کل سے گھر میں قیامت آ رہی ہے اور خود کتنی پُرسکون ہے۔ کسی نیک سے پالا پڑتا تو آج یہ نہ دیکھنا پڑتا۔ برا انسان تو برا ہی رہے گا۔''

بڑی اماں اور آپا آبدیدہ ہو رہی تھیں۔

صباحت جو نجانے کب سے اپنی تعریفیں سن رہی تھی۔ اندر کمرے میں داخل ہو گئی۔

اتنے سارے لوگوں میں وہ صرف اماں سے مخاطب ہوئی تھی۔

''اماں! کوئی شخص برا نہیں ہوتا اسے بنا دیا جاتا ہے اور جب وہ برا بن جائے تو پھر برائی رتا ہے۔ دنیا میں بے شمار مجرم ایسے ہی تشکیل پاتے ہیں۔ برائی بذات خود کچھ عمل نہیں عمل کے ل کا نام ہے۔ میرا جرم صرف اتنا تھا کہ میں نے آپ کے نواسے سے محبت کی شادی کی تھی۔ لیکن ی نہیں کی۔ لیکن مجھے سسرال میں ہمیشہ آوارہ اور بدچلن کے نام سے مخاطب کیا گیا۔ ایک لڑکی جو ئے گھر سے بہو بن کر آتی ہے وہ صرف اچھا کھانے اور اچھا پہننے کے لئے سسرال میں نہیں آتی۔ چھے سلوک کی بھی منتظر ہوتی ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ یہاں پرانے اور گھٹن آمیز رویوں سے نہیں گزر سکتی۔ آج آپ کے ہی لفظ آپ کی گود میں پکے ہوئے پھل کی طرح ٹوٹ کر گر گئے اسے اپنی کوئی نیکی شمار کیجئے یا اپنا مکافات عمل سمجھیے۔ یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے۔''

کمرے میں اتنا سکوت تھا کہ دل کی دھڑکنیں بھی سنی جا سکتی تھیں۔ وہ اسی سکون سے ی رہی اور ایک ایک کا چہرہ دیکھتی رہی۔ شاید کوئی بولے لیکن سب خاموش تھے۔

''اگر آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس جرم میں ملوث ہوں اور اعتراف جرم کرنے آئی تو اس سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں پورے گھر میں، میں سب سے بری عورت تھی اور باقی نیک۔ تو کیا برائی نیکی سے زیادہ طاقتور تھی جو غالب آ گئی۔ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ کل کا واقعہ تم سب کی نیکیوں کا نامۂ اعمال ہے۔''

اس کے بعد وہ کمرے میں رکی نہیں۔ اور باہر نکل گئی۔ قدرتی بات تھی سب ہی کی نگاہیں د کی طرف اٹھی تھیں۔ اتنی سوالیہ نگاہیں، حماد کی نظریں تو کیا سر بھی جھک گیا تھا۔

''سن لیا تم نے۔'' اماں نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ ''اس کو کہتے ہیں الٹا چ
کوتوال کو ڈانٹے۔ ارے میں تو کہتی ہوں.....''

''بس۔ کیجئے اماں!'' عباد کرسی چھوڑ کھڑے ہو گئے۔ ''سب ہی کردار سامنے آ گئے ہیں
اس سے قبل یہ گھر تھیٹر بنے۔ مناسب حل تلاش کر لیجئے اور سب سے بہترین حل تو یہ ہے کہ وقار کے
ساتھ سب علیحدہ رہائش کا بندوبست کر لیں تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کی غلطیوں کا ذمے دار کوئی
ایک دوسرے کو نہ ٹھہرا سکے۔''

''مگر میں اس گھر سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔'' حماد کا انداز حتمی تھا۔

''کیوں؟'' سب کی سوالیہ نگاہیں ان پہ تھیں۔

''سویرا کے مستقبل کا سوال ہے۔ میں ان حالات میں سویرا کے معاملے میں اس پہ بھروسہ
نہیں کر سکتا۔''

''وہ اس کی ماں ہے۔'' عباد نے وزدیدہ نگاہوں سے حماد کی طرف دیکھا۔

''کچھ بھی ہے۔ مجھے زک پہنچانے کے لئے وہ کوئی بھی رشتہ استعمال کر سکتی ہے۔''

عباد تو کیا سب ہی حماد کی بات پہ مبہوت ہو گئے۔ (یعنی آپ کو اس سے قبل از وقت خوف
لاحق تھا۔ اپنے مفاد کی خاطر آپ نے دوسروں کو جہنم میں دھکیل دیا) عباد سوچ کر رہ گئے۔

اماں کو تو فوراً سویرا پہ ترس آ گیا تھا۔

''یہ بھی تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولیں۔

عباد کے تو آگ لگ گئی۔

''آپ اپنا دامن صاف کیجئے۔ سویرا نہ تو یتیم ہے اور نہ ہی مسکین جس پہ آنسو بہائے جا
رہے ہیں۔ جو اولاد پیدا کرنا جانتے ہیں انہیں مسائل کا حل بھی خود نکالنا چاہیے۔'' عباد کا لہجہ تو قدرے
سے زیادہ کرخت اور کھردرا تھا۔

وہ کمرے سے نکلنا چاہتے تھے لیکن کسی خیال کے تحت اچانک رک گئے۔

''اور۔ ہاں عارش ربیعہ سے بڑا ہے۔ اگر آپ کی نظر میں عارش کے لئے کوئی لڑکی ہو
نظر ثانی کر لیجئے گا۔ ورنہ..... ایک لڑکی میری نظر میں بہت عرصہ سے ہے۔''

اس ہنگامی اعلان کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ سب ہی گنگ رہ گئے۔

''کون.....؟'' اماں اور آپا نے بیک وقت پوچھا تھا۔ ایک لمحہ کو عارش کا سانس تک رک گیا۔

''زرین کی چھوٹی بہن امبرین.....!'' بڑے اطمینان سے جواب آیا۔

''کیا.....؟'' اماں اور بڑی آپا چلائیں۔ جیسے کسی خوفناک مخلوق کا ذکر کر دیا گیا ہو۔ شہزاد

حیرت میں آ گیا تھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑی بہن نے کون سا کلیجے میں ٹھنڈ ڈال رکھی ہے جو ہم چھوٹی
بھی لے آئیں۔ یہ تو تصور ہی ذہن سے کھرچ دو۔'' اماں تو تلملا چکی تھیں۔

''عارش کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ کیا دنیا کا گند سمیٹنے کے لئے ہم ہی ہیں۔''

''پرائی بیٹیوں کو گند کہنے سے پہلے اپنے دامن میں بھی جھانک لیجئے۔'' عباد نے تاسف
سے اماں کی طرف دیکھا۔

''ضروری نہیں ایک بہن جیسی ہے دوسری بھی ویسی ہی ہو۔ آپ کی بھی دو بیٹیاں ہیں۔ دو
ں ایک گھر میں ہوں گی تو دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن کر رہیں گی۔ آپ لوگوں پہ کم انحصار
یں گی۔ امبرین ویسے بھی پڑھی لکھی ہے۔''

''تعلیم نے کون سا بہبود انجام دیا ہے۔'' اماں کمزور تو پڑ چکی تھیں پھر بھی بات کاٹ کر
سے بول ہی پڑیں۔

''آپ نے تعلیم کو برا سمجھا تھا، سو آپ کو برائی ہی ملی۔ کاش آپ تعلیم کے معاملے میں
ذہن کی مالک ہوتیں تو شاید بہت سی برائیاں پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتیں۔ بہرحال یہ
ایک پرپوزل ہے غور کر لیجئے گا۔ فیصلہ تو آپ ہی نے کرنا ہے۔''

سب کو نئی سوچ میں مبتلا کر کے عباد کمرے سے نکل گئے تھے۔

☆☆☆

یہ حویلی نما گھر رما اور بچوں کے بغیر کتنا خالی لگ رہا تھا۔ اماں اور بڑی آپا نے کتنی بار کہا تھا
وہ انہیں لے آئیں مگر وہ خاموش تھے۔

انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ رما اور بچوں کو یہاں نہیں لائیں گے۔ سب کو اپنے اپنے
بات پیارے ہیں تو پھر وہ اپنی خوشیاں کیوں دوسرے کی خاطر پس پشت ڈالیں۔

لیکن چار دن میں ہی انہیں اپنی دنیا ویران لگنے لگی تھی اور اتنی جلدی نئے گھر کا بندوبست
ا ناممکن تھا۔ وہ پانچویں دن رما کے والدین کے گھر پہنچ ہی گئے۔ بچے باہر لان میں ہی کھیل رہے
۔ باپ کو دیکھ کر فوراً چوٹ گئے۔ رما کی اسی عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھیں۔ عباد کو اچانک
لر باہر آ گئیں۔ عباد نے انہیں دیکھ کر فوراً جھک کر سلام کیا تو وہ پیار کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں۔

''آؤ۔ اندر آ جاؤ۔''

''نہیں آنٹی! یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ موسم خاصا خوشگوار ہو رہا ہے۔'' عباد شرمندگی کی
ت ان سے نظریں نہیں ملا پا رہے تھے۔ جانے رما نے انہیں کیا کچھ بتا رکھا ہو۔

سب کین کی کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ بچے اب بھی اچھل کود کر باپ کے ملنے کی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے ادھر ادھر متلاشی نگاہوں سے رما کو ڈھونڈا۔ مگر وہ نظر نہیں آئی۔

''آنٹی! میں رما کو لینے آیا ہوں۔'' ان کا لہجہ مضبوط تھا لیکن پھر بھی دل دھڑک رہا تھا۔

''سو دفعہ بیٹا! اصل گھر تو اس کا وہی ہے۔ نجانے کیا بات ہوئی تھی جو وہ اچانک یوں آ گئی۔ اس کے ابو نے بھی کئی بار پوچھا۔ اور میں نے بھی لیکن اس نے ہمیں کچھ نہیں بتایا۔ میاں بیوی کے درمیان بہت سے جھگڑے ہوتے ہیں جو باہم سلجھا لیے جائیں تو کچھ نہیں۔ لیکن ٹالٹ فریق کی وجہ سے یہی معمولی جھگڑے عذاب بن جاتے ہیں۔ اس گھر میں اور بھی بہت سے افراد ہیں۔ اس کی دو بھاوجیں بھی ہیں اور بھائی بھی۔ اس کی شروع سے عادت ہے۔ وہ اپنے ذاتی مسائل کی تشہیر نہیں کرتی۔''

''جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

''یہ تو میں جانتی ہوں۔ رما معمولی بات پر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جس نے یہاں آ کر بھی اسے ڈسٹرب رکھا۔''

عباد مجرموں کی طرح خاموش تھے۔

''اس نے ہم سب کے پوچھنے پہ کچھ نہیں بتایا اور مزید اصرار ہم نے مناسب نہیں سمجھا۔ اور پھر اس کے گھر کا مسئلہ ہے ہم مداخلت نہیں کر سکتے۔''

ان کی سلجھی ہوئی سوچ سے عباد بے حد متاثر نظر آ رہے تھے۔

''یقیناً' سیانے ٹھیک کہہ گئے ہیں۔ کامیاب شادی کا راز بیوی کی ذہانت و متانت ہے اور بیوی وہی اچھی ہوگی جس کی ماں اچھی ہوگی۔'' عباد نے مسکرا کر ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا تو صفیہ بیگم شگفتگی سے مسکرائیں۔ ان کی آدھی کلفت و حل گئی تھی۔

''کیا میں رما سے مل سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔ تم بیٹھو۔ وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ میں دیکھتی ہوں۔''

وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ عباد بچوں میں مصروف ہو گئے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد رما برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کی طرف آتی نظر آئی، عباد کھڑے ہو گئے۔

رما کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں اب بھی نم تھیں۔ جیسے رو کر آئی ہو۔

شکوہ بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا کرنے آئے ہیں یہاں؟''

''تمہیں لینے۔''

''تصدیق ہو گئی میرے جرم کی؟'' رما کی آنکھیں ہی کیا لہجہ بھی تپ رہا تھا۔

عباد کے چہرے پہ مایوسی اور دکھ کے سائے پھیل گئے۔ وہ سر جھکتے ہوئے بولے۔

رما! میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس رشتے کے تحت؟''

''تم میری بیوی ہو۔''

''اچھا۔ میں تو سمجھی تھی، الزام کے بعد میں اس رشتے سے خارج ہو گئی ہوں۔''

''آئی ایم سوری رما.....!''

''صرف سوری کر لینے سے میرے دکھ کا مداوا ہو جائے گا؟ میرے لیے تکلیف کا لمحہ وہ نہیں تھا جب مجھ پہ کیچڑ اچھالا گیا۔ افسوس تو مجھے جب ہوا جب آپ نے مجھے صفائی کا موقع بھی نہیں دیا۔ ساری رات روتے سسکتے گزری اور آپ نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بے شک' عباد! آپ نے مجھے گھر سے نکلنے کو نہیں کہا تھا لیکن آپ کا رویہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس گھر سے نکل جاؤ۔ مجھے افسوس ہے عباد! آپ کتنے کمزور مرد نکلے۔'' یہ کہتے ہوئے رما رو پڑی۔

عباد نے کچھ دیر اسے رونے اور بولنے کا مزید موقع دیا مگر وہ روتی رہی۔

''ہاں۔ میں اعتراف کرتا ہوں۔ میں ایک کمزور مرد ہوں۔ میں بہت بڑی آزمائش سے نکل کر آیا ہوں رما۔ اور یہ اسی رب کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے ثابت قدم رکھا۔ ورنہ نجانے کیا ہوتا۔''

عباد کا چہرہ نہایت ملول تھا۔ ''تنہا تم ہی کرب سے نہیں گزریں، میں بھی دوہرے عذاب سے نکل کر آیا ہوں۔ مجھے تمہارے صبر اور استقلال پہ فخر ہے۔ اس سے زیادہ میں تمہاری بڑائی میں شاید کچھ نہ کہہ سکوں۔ تم جو چاہے مجھے سزا دے سکتی ہو۔''

ان کے ملال پر رما کا دل پاش پاش ہو گیا۔

''آج پانچ روز کے بعد آپ کو اس بات کا خیال آیا ہے۔'' اس نے شکوہ بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''سابقہ چار دن کس اذیت میں گزرے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ جس شک کو تم نے میرے سامنے ڈرتے جھجکتے بیان کیا تھا۔ محض تمہارا وسوسہ نہیں تھا۔ ایک خوفناک حقیقت تھی۔ ربیعہ حالات کے اس دھارے پہ پہنچ چکی تھی کہ شاید ہم میں سے کوئی بھی اسے نہ بچا پاتا۔ اس کے جذباتی پن میں بولے گئے الفاظ میرے لیے ایک راستہ ثابت ہوئے۔''

اس کے بعد مختصراً عباد نے اسے سارے قصے سے آگاہ کر دیا۔

''میں اسے کالج لینے گیا لیکن ڈیڑھ گھنٹے انتظار کرنے کے بعد وہ کالج سے نہیں نکلی، عارش

بھی مقررہ وقت پہ اسے لینے آ گیا تھا۔ کالج خالی ہو چکا تھا۔ ہماری پریشانی قدرتی تھی۔ ہم گھر آئے۔ اماں اور آپا جان سے بات کی، ہمیں بجھائی نہیں دیتا تھا کہ کیا راستہ اختیار کریں۔ اماں نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے تھے۔ جبکہ آپا جان کی طبیعت خطرناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔ ان کے بلڈ پریشر کو نارمل کرنا اور پھر جانچ پڑتال کرنا۔ اندازہ کر سکتی ہو۔ کتنا کٹھن مرحلہ تھا۔ عارش نے شہزاد کو بھی بلا لیا تھا گھر میں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ جیسے تیسے کر کے آپا جان کو ہوش آیا تو انہوں نے اس کی ایک سہیلی کے بارے میں بتایا جس کے ہاں اس کا آنا جانا بھی تھا اور وہ بہت قریبی سہیلی تھی۔ آپا جان نے اس سے فون پہ بات کی تو اس نے بتایا کہ وہ آج کالج ہی نہیں گئی تھی۔ آپا جان بہت بوکھلائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ربیعہ ابھی تک کالج سے گھر نہیں آئی ہے۔ ہم بے حد پریشان ہیں۔ تمہیں معلوم ہو وہ کسی اور سہیلی کے ہاں تو نہیں جاتی۔

اس لڑکی کو چاہیے تھا کہ وہ ہمیں اسی وقت سچ بتا دیتی لیکن شاید وہ بتا کر خود پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ شہزاد کے سر پہ ایک بھوت سوار تھا کہ صباحت بھابھی اور زرین سے معلوم کیا جائے۔ بمشکل اسے اس عمل سے روکا۔ عارش اور میں نے مل کر ربیعہ کے کمرے کی تلاشی لی۔ وہاں ہمیں ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے ہمیں کوئی راستہ یا سراغ ملتا لیکن راہ دکھانے والا تو اللہ تھا ہمیں وہاں سے ایک موبائل نمبر ملا۔ جو ربیعہ کی ڈائری میں درج تھا۔ میں نے وہ فون ملایا لیکن فون انگیج تھا۔ فوری طور پہ میں نے اس نمبر کی جانچ پڑتال کمپیوٹر میں کی۔ اور پھر اس ایڈریس پہ پہنچے۔ جانتی ہو، ہم کہاں پہنچے۔ اسی لڑکی کے ہاں جس نے ہمیں انکار کیا تھا۔ لیکن اب ہمیں شک ہی نہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی ضرور اس کیس میں شامل ہے۔ ورنہ اس کے بھائی کے موبائل نمبر کا ربیعہ کے پاس کیا کام تھا۔ اس کے والدین کے سامنے جب ساری بات رکھی گئی تو وہ خود بھی پریشان ہو گئے۔ ہمارا اندازہ یہ تھا کہ اس لڑکی کا بھائی بذات خود مجرم ہے لیکن انہوں نے اپنے بیٹے کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس لڑکے نے بتایا۔ ہم سب دوست ایک دوسرے کا نمبر استعمال کرتے رہتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ نمبر کس طرح آپ تک پہنچا ہے۔ یہ کوئی مطمئن کر دینے والا جواب نہیں تھا۔ ہم نے انہیں دھمکی دی یا تو وہ ہمیں صحیح طرح بتا دیں۔ ورنہ پولیس کی مدد لینے میں ہمیں کوئی دقت نہیں آئے گی، تب اس لڑکی نے ہمیں سارا قصہ بتا دیا۔

اس کے بھائی نے بتایا اگر وہ مخلص ہے تو اپنے ماں باپ کے پاس لے کر گیا ہو گا۔ نہیں..... تو شہر میں جگہ جگہ ان کی پراپرٹی پڑی ہے۔ وہ اسے کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ زیادہ تر ہم سب دوست شہر سے باہر ان کا آبائی گھر خالی پڑا ہے۔ وہیں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس لڑکے کے ساتھ ہم وہاں پہنچے۔ چوکیدار بہت چاق و چوبند تھا۔ اس نے ہمیں اندر جانے سے روکا۔ شہزاد اور عارش کو تم

جانتی ہو۔ انہوں نے اسے دھن ڈالا۔ اندر پہنچے۔

نیچے کی ساری منزل خالی تھی۔ اوپر کا کمرہ سیڑھیاں چڑھتے ہی بند نظر آیا۔ شہزاد اور عارش نے جنونیوں کی طرح دروازے کو توڑ ڈالا اور سامنے ہی جو ہم نے منظر دیکھا۔ وہ بالکل ہی غیر توقع تھا۔ وہ شخص اوندھے منہ ایک اور دروازے کے سامنے پڑا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ باتھ روم یا اسٹور کا دروازہ ہو۔ یقیناً وہ ضرورت سے زیادہ ہی نشہ کر گیا تھا۔ تب ہی برداشت نہ کر سکا۔ باتھ روم کا دروازہ بہت پیٹا۔ ربیعہ کو آوازیں دیں۔ دروازہ کھلا۔

ربیعہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ گرمی اور خوف سے اس کا برا حال تھا۔ وہ تڑپ کر مجھ سے چمٹ گئی اور دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو گئی۔ شاید چوکیدار نے اس کے والدین کو اطلاع کر دی تھی۔ وہ پہنچے تو سمجھ لو ان کے بیٹے کے جسم میں بس سانس انکی رہ گئی تھی۔ عارش اور شہزاد نے اس کا وہ حال کیا تھا۔ ربیعہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہاں رکا جاتا اور بات کا بتنگڑ بنتا لیکن وہ دونوں ہی بضد تھے کہ دونوں پارٹیوں کے خلاف پرچہ کٹوایا جائے لیکن ایسا کرنا اپنی عزت کو مزید چاند لگوانا تھا۔"

سانس روکے رہا بڑی توجہ اور حیرت سے ساری داستان سن رہی تھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی بڑی قیامت آ چکی ہو گی۔ وہ بھی سلمان نگر میں۔ جہاں کے لڑکے بھی لڑکیوں جیسے تھے۔

"میرا اندازہ غلط نکلا میں یہی سمجھتا تھا کہ صباحت بھابھی اپنا آلۂ کار زرین کو بنائیں گی لیکن انہوں نے ربیعہ کو استعمال کیا۔"

عباد انتہائی پژمردہ دکھائی دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی رہی۔ نہ تو رما کے پاس کوئی سوال تھا اور نہ ہی عباد کے پاس مزید کوئی بات۔

"اس سارے جرم کا ذمے دار کون ہے؟" بہت دیر کے بعد رما نے سوال کیا تو عباد کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"جب کوئی انسان اپنی حیثیت کے باوجود ناپسندیدہ زندگی گزار رہا ہو۔ یعنی جبری زندگی۔ تو وہ لوگوں کے لئے ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔"

صاف اشارہ صباحت کی طرف تھا۔ رما دیکھتی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔

"مگر یہ بات ہمارے بھائی صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ صرف اس متولے پہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ جو چیز پسند آئے اسے اپنا لو..... اور اپنی حیثیت منوانے کے لئے دوسروں کے احساسات کو روندتے رہو لیکن محبت جب انتقام پہ آتی ہے۔ تو سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔"

رما خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی پھر ان کے قریب بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''اٹھیے، گھر چلتے ہیں۔''

عباد نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی صابر و شاکر تھی۔ انہیں ٹوٹ کر اپنے جیون ساتھی پہ پیار آیا۔

''وہ گھر ہمارا نہیں ہے۔ صرف عارضی پناہ گاہ ہے۔ ہم جلد ہی اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔ میں مزید کسی آزمائش کا سامنا نہیں کر سکتا۔''

امی سے اجازت لینے کے بعد دونوں بچوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔

''ربیعہ کا جلد اچھی سی جگہ رشتہ ہو جائے تو اچھا ہو گا۔'' رما نے احسن کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔'' عباد نے پرسوچ اقرار کیا۔

''میں نے عارش کی بات بھی کر دی ہے۔'' ان کا انداز معمولی تھا۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ گھر والے مان جائیں گے؟'' رما اپنے پرانے موڈ میں آ چکی تھی۔

''یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ عارش کی قسمت ہے اور گھر والوں کا فیصلہ۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔'' عباد کا انداز خشک تھا۔ رما خاموش ہو گئی۔

''ویسے اگر حماد بھائی صباحت بھابھی اور بچوں کو لے کر علیحدہ ہو جاتے تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ وہ بڑے تھے۔''

عباد نے گردن موڑ کر رما کی طرف دیکھا۔

''دوسروں کے معاملات میں الجھنا اور سوچنا چھوڑ دیں۔ اگر فی سبیل اللہ کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہے۔ تو ہم پہ نظر ثانی کیا کیجئے، دوہرا ثواب ملے گا۔'' عباد کا موڈ خوشگوار ہو چکا تھا۔

رما مسکرا دی اور عباد کے شانے پہ سر رکھتے ہوئے بولی۔

''صرف ثواب ہی ملے گا یا کچھ اور بھی۔'' عباد آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

''کچھ اور بھی مل سکتا ہے۔ اگر آپ کو گاڑی میں اعتراض نہ ہو تو۔'' رما یکدم سٹ گئی۔

عباد ہنس دیے۔ گاڑی نئے سفر پہ رواں دواں تھی۔